اقبال اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

از

MILITARY STATION LIBRARY
NO.
DATE
MALIR

سیّد رئیس احمد جعفری ندوی

ناشران

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز!

لاہور ○ پشاور ○ حیدرآباد ○ کراچی

جملہ حقوق محفوظ

طابع ———— شیخ نیاز احمد

مطبع ———— علمی پرنٹنگ پریس لاہور

اشاعت اوّل ———— ۱۹۵۶ء

اشاعت دوم ———— ۱۹۶۳ء

قیمت ———— دس روپے

○

ناشران

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز کشمیری بازار۔ لاہور

انتساب

مسٹر انور عادل

کمشنر کوئٹہ کے نام

MILITARY STATION
NO. 185
DATE 5-2
3/19

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

اقبال بہت بڑے فلسفی تھے، مفکر تھے، شاعر تھے، ادیب تھے، حکیمِ اُمت تھے، ترجمانِ حقیقت تھے، لیکن میری نظر میں ان سب حیثیتوں پر بالا اُن کی یہ حیثیت تھی کہ وُہ عاشقِ رسولؐ تھے۔ ان کے نطق و کلام کا مرکز، ان کی زندگی کا مقصد، ان کے پیام کا محور، ان کی دعوت کا منشا صرف حُبِّ رسُولؐ تھا ——— اقبال کی شاعری پیام، دعوت اور زندگی کا اگر صرف ایک شعر میں خلاصہ کرنا مقصود ہو تو بے تامل اُن کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر به او نه رسیدی تمام بولہبی است

اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، بہت کچھ لکھا جائے گا۔

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

اقبال کا کلام "کتابِ دل" ہی تو ہے، لیکن اقبال اور عشقِ رسولؐ پر کسی اہلِ قلم نے توجہ نہیں کی۔ یہ سعادت میرے حصے میں تھی ——— شام از زندگیٔ خویش که کارے کردم

رئیس احمد جعفری
کوئٹہ ۲۷ اگست ۱۹۶۳ء

ترتیب

اقبال سے پہلے کا نعتیہ کلام

فارسی کے نعت گو شعرا کے کلام کا سرسری جائزہ ۳
فن اور واردات ۱۳
حسان بن ثابتؓ ۱۴
سعدی کا نعتیہ کلام ۱۴
فیضی مداحِ رسولؐ کی حیثیت سے ۲۵
نظامی گنجوی کا کلام نعت ۲۶
حکیم سنائی کی نذرِ عقیدت ۲۸
عطار کا ترانۂ نعت ۳۰
حافظ خواجۂ کونین کے دربار میں ۳۲
عرفی کا نذرانہ ۳۳
امیر خسرو بارگاہ رسالت میں ۳۴
کلام قدسی ۳۷
ظہوری کا زمزمۂ نعت ۳۸
ناصر علی سرہندی ۳۸
نظیر نیشاپوری ۳۹
مرزا غالب ۳۹
گرامی ۴۱
جگر ۴۱

اردو کے نعتیہ کلام کا تعارف

حالی کے جذباتِ نعت ۴۷
شاد عظیم آبادی ۴۸
اکبر الٰہ آبادی ۵۰
اصغر گونڈوی ۵۱
ظفر علی خاں ۵۲
اقبال احمد سہیل ۵۳
جوش ملیح آبادی ۵۳
حفیظ جالندھری ۵۴
بہزاد لکھنوی ۵۶
ماہر القادری ۵۹
روشن صدیقی ۵۹
حسرت موہانی ۶۱

اردو زبان کے تین نعت گو

امیر مینائی ۷۵
محسن کاکوروی ۸۰
بیدم شاہ وارثی ۹۵

STATION LIBRARY NO. DATE

فنکارانہ نعت گوئی کی چند شاندار مثالیں

سودا کا تعارف ۱۰۵
سودا کا کلامِ نعت ۱۱۰
ظفر کا تعارف ۱۱۴
ظفر حضور رسالت مآبؐ میں ۱۱۵
مومن کا تعارف ۱۱۷
مومن شہنشاہ کائناتؐ کے دربار میں ۱۲۱
میرحسن کے نعتیہ اشعار ۱۳۱
نعت حضرت رسالت پناہؐ ۱۳۲
نظیر اکبرآبادی نعت گو کی حیثیت سے ۱۳۵
نظیر بارگاہ رسالت مآب میں ۱۴۱
اقرار باللسان وتصدیق بالقلب ۱۴۴
ذوق کا ذوقِ نعت ۱۴۸
داغ کا نعتیہ کلام ۱۴۹

اقبال کے عہد کا نعتیہ کلام ۱۵۵

ظفر علی خاں ۱۵۸
بہزاد لکھنوی ۱۶۹
زائرِ حرم حمید صدیقی ۱۷۴

اقبال اور ذکرِ رسولؐ

خوابگاہِ مصطفیٰؐ ۱۹۳
ترانۂ ملّی میں میرِ حجازؐ کا ذکر ۱۹۶
اسلام ترا دین ہے تو مصطفویؐ ہے ۲۰۰
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا؟ ۲۰۵
خوابگاہِ نبیؐ پر فریاد ۲۰۸
فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو ۲۱۰
چراغِ مصطفویؐ اور شرارِ بولہبی ۲۱۴
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے ۲۱۶
قومِ رسولِ ہاشمیؐ ۲۲۱
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہؐ میں ۲۲۴
کرم اے شہ عرب و عجمؐ ۲۲۷
سیّدِ کل، صاحبِ امّ الکتابؐ ۲۲۹
ذرۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب ۲۳۳
نگاہِ محمدِ عربیؐ ۲۳۴
گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست ۲۳۶
یارسولؐ اللہ ۲۳۸
سیرۃ النبیؐ ۲۴۷
ذکرِ مصطفےٰؐ ۲۴۸
زندہ تر، جوئندہ تر، پائندہ تر ۲۵۳
مردِ حق ۲۵۶
تلاشِ مصطفےٰؐ ۲۶۱
پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است ۲۹۱
معراجِ مصطفےٰؐ ۲۷۱
فروغِ وادیِ سینا ۲۷۳

مولائے یثرب ۲۷۵
لوح بھی تو قلم بھی تو ۲۷۷
قلب و نظر کی زندگی ۲۸۱
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہ تصورات ۲۸۶
معنی دیر یاب ۲۸۹
عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب ۲۹۲
صحرانشین کا اعجاز ۲۹۵
ہری شاخ ملت ترے دم سے ہے ۲۹۹
لذت پرواز ۳۰۳
اے روح محمدؐ ۳۰۵
محمد عربیؐ اور عالم عربی ۳۰۷
منزل مقصود ۳۰۹
واردات مصطفےٰؐ ۳۱۲
رمز دین مصطفےٰؐ ۳۱۵
ایں شعاع آفتاب مصطفےٰؐ است ۳۱۷
خرقۂ مبارک ۳۲۰
در جبیں او خط تقدیر کل ۳۲۲
حکمت کلیمی ۳۲۷
متاع مصطفےٰؐ ۳۳۰
مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں ۳۳۳
فقر عریاں ۳۳۵
مال صالح ۳۳۷
غلامی ۳۴۱
حمد بے حد ۳۴۳
روئے پاک مصطفےٰؐ آمد بہ درد ۳۴۸
مصطفےٰؐ نایاب و ارزاں بولہب ۳۵۰
ہم چوں او بطن ام گیتی نہ زاد ۳۵۵
خاک یثرب از دو عالم خوش تر است ۳۶۲
تا کمند تو شود یزداں شکار ۳۶۷
معجزۂ شق القمر ۳۷۰
از حدود مصطفےٰؐ بیروں مرو! ۳۷۳
لی مع اللہ وقت ۳۷۶
حرز جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ ۳۷۹
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ ۳۸۲
زادن او مرگ دنیائے کہن ۳۸۷
من ندانم مرز بوم او کجا است ۳۹۲
ہست دین مصطفےٰؐ دین حیات ۳۹۵
گل شو از باد بہار مصطفےٰؐ ۳۹۸
اُمیّ عربؐ ۴۰۰
بحضور رحمت للعالمینؐ ۴۰۳
کن رسوا حضور خواجہ ما را ۴۰۹
کہ من دارم ہوائے منزل دوست ۴۱۱
بہ ایں پیری رہ یثرب گرفتم ۴۱۳
وجد و کیف ۴۱۵
بہ ہیچ پیچ ملا داہی خستہ و زار ۴۱۸
در سلطاں بہ درویشے کشادند ۴۲۱

نگاہے یا رسول اللہ نگاہے ۴۲۲
حضور تو غم یاراں بگویم ۴۲۵
جوش و شوق ۴۲۸
سوے یثرب سفرے کارواں بہ ۴۲۹
من اے میر امم، داد از تو خواہم ۴۳۰
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست ۴۳۱
پیام شوق آورد یا من؟ ۴۳۴
کہ من غیر از دلے چیزے نہ دارم ۴۳۷
کیفیاتِ عشق ۴۳۹
راہِ مصطفٰے ۴۴۲
مستی و سوز ۴۴۴
گیتی پناہ ۴۴۶
شرعِ پیغمبر ۴۴۹
سوز و ساز ۴۵۲
بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۴۵۶
باقیاتِ اقبال ۴۵۷

①

اقبالؒ سے پہلے کا نعتیہ کلام

○

فارسی کے نعت گو شعرا کے کلام

کا

ایک سرسری جائزہ

شعرائے ذیل کے نعتیہ عربی و فارسی کلام کا نمونہ

- حضرت حسان بن ثابتؓ، شاعرِ رسولؐ
- سعدی
- فیضی
- جامی
- خاقانی
- نظامی گنجوی
- حکیم سنائی
- عطّار
- حافظ
- عرفی
- امیر خسرو
- قدسی
- ظہوری
- ناصر علی سرہندی
- نظیری نیشاپوری
- مرزا غالب
- گرامی
- جگر

اقبالؔ سے پہلے کا نعتیہ کلام

○

اقبال کی شاعرانہ شہرت و عظمت جن ستونوں پر قائم ہے وہ ہیں حبِ وطن، جذبۂ ملی، فلسفہ آفرینی، بلندیِ خیال، عمقِ فکر، اندازِ بیان، رفعتِ تخیل اور سیاسیاتِ بین الاقوام اور کوئی شبہ نہیں یہ ستون بڑے پائیدار ہیں، ان میں تزلزل نہیں پیدا ہو سکتا، ان کا استحکام اور ان کی پائیداری روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

لیکن میرے خیال میں اقبال کی شاعری کا مرکز، محور اور مرجع و مصدر، صرف حبِ رسول ہے اقبال کو ذاتِ رسالت پناہی سے والہانہ عشق ہے، یہی عشق اس کی زندگی ہے، اسی عشق نے اس کے خیالات میں بلندی، اور جذبات میں گیرائی پیدا کی ہے، اسی عشق کی بدولت وہ اسلام سے روشناس ہوا، اس نے خدا کو پہچانا اور قوم رسول ہاشمی کی نقابت کو، اپنی زندگی کا شعار بنا لیا، اقبال مشرق و مغرب کا جامع تھا، علوم مغربی کا ماہر، علوم شرقی میں کامل، اس نے مشرق کے دبستانِ علم میں بھی زانوے شاگردی تہ کیا تھا، اور مغرب کی دانش گاہوں سے بھی کسبِ فیض کیا تھا، وہ مشرقی نژاد تھا لیکن اس نے یورپ کی خاک بھی چھانی تھی، اس نے مشرق کی خانقاہیں بھی دیکھی تھیں اور مغرب کے علم کدے بھی، اس کی نگاہوں کے سامنے پیرانِ مشرق کا جلوہ بھی بے حجاب تھا اور دانایانِ فرنگ کا شعلۂ مستعجل بھی، اس کی نگاہ مدرسہ و مکتب کی راز دار بھی تھی اور کالج و یونیورسٹی کی بھی، وہ علمِ جامد کا رمز آشنا بھی تھا اور علمِ رواں کا بھی، وہ ان کتابوں سے بھی واقف تھا جن کی تحقیقات پر صدیاں گزر چکی تھیں مگر کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا اور وہ کتابیں بھی اس کی نظر سے گزرتی رہتی تھیں جن کے ایڈیشن بار بار چھپتے رہتے تھے، اور ہر ایڈیشن ایک نئی تحقیق، ایک جدید کاوش، ایک نادر نظریہ ایک انوکھی "ریسرچ" کا آئینہ دار ہوتا تھا، وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے ٹیگور کی طرح، شاعرِ عالم بن سکتا تھا کون تھا جو اس کا پیام نہ سنتا؟ کون تھا جو اس کے پیام پر سر نہ دھنتا؟ کون تھا جو اس کی آفاقیت کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرتا؟ کون تھا جو اس کی بین الاقوامیت کا کلمہ نہ پڑھتا؟ وہ بڑی آسانی سے شاعرِ وطن بھی بن سکتا تھا جب

اُس نے "ترانۂ ہندی" گایا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

تو سارا ہندوستان اس دس بھری آواز سے گونج اُٹھا تھا، قومیتِ متحدہ کے ایوان کو ایک نیا کلس مل گیا وطن پرستوں کی زبان پر ایک نیا گیت جاری ہو گیا، قوم پرستوں نے اس کے ایک ایک بول کی تلاوت شروع کر دی۔ وہ اگر میدان میں آتا تو سب پیچھے رہ جاتے، اور وہ سب سے آگے نکل جاتا، لیکن نہ اس نے آفاقی شاعر بننا منظور کیا، نہ وطنی، ان دونوں حیثیتوں کو وہ اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھتا رہا۔

آں کہ فخرِ تست، آں ننگِ من است!

اس نے اپنے لیے جو راہ اختیار کی، وہ اسلام کی تھی، اس نے جس پروگرام کی نشر و اشاعت کے لیے زندگی وقف کر دی، وہ اسلام تھا، اس کی نگاہ میں دنیا کا ہر مِس خام اکسیر سے دُور ہو سکتا تھا، وہ اسلام کے سوا کچھ نہ تھا، ہر روگ کا تریاق اس کے نزدیک اسلام اور صرف اسلام تھا، اور یہ اسلام اس نے عشقِ رسولؐ سے حاصل کیا تھا، اس کے اسلام سے ذاتِ رسالت مآب کو جُدا ہی نہیں کیا جا سکتا تھا ——— اس کی زبان پر صرف ایک ہی نعرہ جاری تھا، اور وُہ تھا۔

سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبال کا سب سے زیادہ اثر انگیز، ولولہ خیز، روح پرور اور وجد آفریں حصہ وُہ ہے جو ذکرِ رسولؐ پر مشتمل ہے، اور تعجب ہے کہ ماہرینِ اقبالیات نے کلامِ اقبال کے تمام پہلوؤں کو "کھنگالا" ذکرِ اقبال کے تمام گفتنی اور ناگفتنی پہلوؤں کا ذکر کیا، لیکن نہ چھیڑا تو اسی نغمۂ جاں نواز کو ——— میں اقبال کے اسی پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا تھا۔

فن اور واردات!

اس موقعہ پر ایک حقیقت بہرحال پیش رکھنی چاہیئے، وُہ یہ کہ دوسرے شعراء کی نعت میں اور اقبال کے "ذکرِ رسولؐ" میں زمین آسمان کا فرق ہے، نعت شاعری کا ایک فن بن گیا ہے لہٰذا ہر شاعر، اس عنوان پر طبع آزمائی ضرور کرتا ہے، خواہ وہ اردو کا شاعر ہو یا فارسی کا، خواہ وہ عہدِ جدید کا "کلیات" ہو، یا عہدِ قدیم کا "دیوان" لیکن اس فنی نعت میں، اور اقبال کے ذکرِ رسولؐ میں وہی فرق ہے جو آمد اور آورد میں ہوتا ہے، مقصود اس سے خدانخواستہ کسی قدیم یا جدید شاعر کی توہین و تنقیص نہیں، صرف بیانِ واقعہ ہے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ !

اور توہین و تنقیص مقصود ہو بھی کیسے سکتی ہے جب کہ بعض شعرا کے ہاں بے پناہ نعتیہ اشعار ملتے ہیں، لیکن گفتگو مجموعی طور پر ہوتی ہے اور مجموعی طور پر فارسی اور اُردو کا نعتیہ کلام اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس میں آورد زیادہ ہے، آمد کم !

پھر ایک بات اور بھی ہے، جو اقبالؔ کو، دُوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے دُوسرے نعت گو شعرا، عام طور پر، رسالت مآبؐ کا "سراپا" اور آپ کے فضائل اور دُوسرے انبیاء پر آپ کی فضیلت، یا پھر معجزات و خوارق کے بیان پر زور دیتے ہیں، اقبالؔ کے ہاں یہ پہلو نہ ہونے کے برابر ہے، اقبالؔ صفاتِ نبویؐ کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ ان کی واردات کا غالب ترین حصّہ ذاتی تاثرات میں ہے، یہ ذاتی لگاؤ، ذاتِ رسالت مآبؐ سے کسی اور شاعر کے ہاں بہت کم ملے گا، اور یہی وہ ذاتی لگاؤ ہے جس نے اقبالؔ کے اشعار میں بجلی بھر دی ہے ایک عجیب طرح کا کیف پیدا کر دیا ہے ایک ایسا نشہ جو پھر کبھی ترشی سے نہیں اُترتا !

حسّان بن ثابتؓ

قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں اقبالؔ کے کلام سے اپنا دعویٰ ثابت کروں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور اردو کے چند بلند مرتبت شعراء کا کچھ نعتیہ کلام بھی مشتے نمونہ از خروارے پیش کر دوں تاکہ اقبالؔ کی حیثیت صحیح طور پر متعیّن ہو سکے ——— سب سے پہلے میں، فارسی شعرا کا کلام، نہایت اختصار کے ساتھ پیش کروں گا۔

اور اس سے بھی پہلے تبرکاً ہم شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت، رضی اللہ عنہ کے دو شعر درج کرتے ہیں۔

واحسن منك لم تر قط عيني
وافضل منك لم تلد النساء
خلقت مبرا من كل عيب،
كانك قد خلقت كما تشاء

یعنی:

آپ سے زیادہ حسین وجمیل چہرہ آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔
آپ سے اچھا اور برتر انسان کسی عورت نے کبھی نہیں جنا۔
آپ ہر عیب سے مبّرا ہو کر اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔

سعدی کا نعتیہ کلام

سعدی (متوفی ۶۹۱ھ) نے بھی نعت میں، جو کچھ کہہ دیا ہے، وہ حرف آخر ہے:

● بلغ العلیٰ بکمالہ   کشف الدجیٰ بجمالہ

● حسنت جمیع خصالہ   صلوا علیہ وآلہ

مشرق کا یہ مصلح اعظم (سعدی) دیکھئے بارگاہِ رسولؐ میں کس طرح پہنچتا ہے؟ کہتا ہے اور سراپا جوش و صداقت بن کر کہتا ہے:-

کریم السجایا جمیل الشیم
نبی البرایا شفیع الامم
امام رُسل، پیشوائے سبیل
امین خدا، مہبطِ جبرائیل
شفیع الوریٰ، خواجۂ بعث و نشر
امام الہدیٰ، صدرِ دیوانِ حشر

اور پھر کس ولولہ اور اثر انگیزی کی کیسی بے پناہ قوت کے ساتھ کہتا ہے!

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملّت بشست
تو اصل وجود آمدی از نخست
دگر ہر چہ موجود شد فرع تست

ترا عزِ لولاک، تمکیں بس است
ثنائے تو طٰہٰ و یٰسیں بس است

پھر فرماتے ہیں، اور جذبات کی پوری صداقت کے ساتھ فرماتے ہیں :

نگینِ ختمِ رسالت محمدِ عربی!
شفیعِ روزِ قیامت محمدِ مختار
اگر نہ واسطۂ روئے و موئے او بودے
خدائے خلق نہ گفتے قسم بہ لیل و نہار

فیضی مدّاحِ رسولؐ کی حیثیت سے

فیضی (متوفی ۱۰۰۴ھ) اکبر کا چہیتا مصاحب اور مرشدِ طریق تھا اکبر کی گمراہی کا ذمّہ دار مؤرّخ عام طور پر فیضی اور اس کے بھائی ابوالفضل ہی کو قرار دیتے ہیں بلکہ جہانگیر نے اپنی تزک میں جہاں ابوالفضل کو قتل کرا دینے کا اعتراف کیا ہے وہاں یہ الزام بھی لگایا ہے کہ اکبر کی بے راہ روی کا باعث ابوالفضل ہی تھا لیکن حبِّ رسولؐ اور نعتِ نبی کے میدان میں، بہ حیثیت شاعر کے نہ صرف یہ کہ فیضی کسی سے پیچھے نظر نہیں آتا بلکہ بہتوں سے آگے بڑھ جاتا ہے اس کا صرف ایک ہی شعر، مثبت سے دیوانوں اور کلیات پر بھاری ہے، کہتا ہے :

اُمّی و دقیقہ دانِ عالم
بے سایہ و سائبانِ عالم

ان چند سادہ سے الفاظ میں جوش و اثر، جذبۂ عشق اور بے پناہ ارادت اور ساتھ ہی ساتھ حقائق و معارف کا جو بحر بیکراں لہریں لے رہا ہے، اس کا کوئی جواب ہے ؟

فیضی نعتِ رسولؐ کے سلسلہ میں کہتا ہے اور کس تیور کے ساتھ کہتا ہے !

اتانی رسول واتی الوسائل
لقد سرّ قلبی تبلث الوسائل
چہ نقش بدیعیت کز پردہ سر زد
نہ ہے حسنِ قول و نہ ہے لطفِ قائل

بنامِ زہے کعبہ پاک باز ال
کہ دل ہائے پاکاں سوئے اوست مائل

علی المراتب سنی المناقب
حری المحامد، ومنی الشمائل

ان اشعار میں جوش بھی ہے اور جذبہ بھی اور کیف و اثر بھی!
مثنوی "نل دمن" میں فیضی نے جو نعتیہ اشعار لکھے ہیں، وہ بھی معنویت، کیف و اثر، عمق علم اور روانیِ کلام کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں —— چند اشعار سُن لیجئے۔

آں مرکزِ نعت دور حسبدول
گرداب نشینِ موجِ اوّل
چابک قدم بساطِ افلاک
والا گہر محیطِ لولاک
قدرش بہ زمانہ ماہ و اکلیل
نورش بہ فلک چراغ و قندیل

با شرع و کتاب نورِ ساطع!
با تیغ و زباں دلیلِ قاطع
دم ساز بہ حُکم بے دریغش
با تیغ زباں، زباں بہ تیغش
از ذاتِ کبریا مؤیّد!
سرلشکرِ انبیاء محمدؐ

خاکی و براوجِ عرش منزل
اُمّی و کتاب خانہ در دل
ہم مطلعِ اوّل سباعی!
ہم مصرعِ آخرِ رُباعی
صبحش چو دمید عالم افروز
دینش بعہدِ آفتاب شد روز

ہم از دو جہاں تہی و ہم پُر
ہم ساحل و ہم محیط و ہم دُر
اسرارِ ازل خزینۂ او
محرابِ ابد مدینۂ او
زانوئے زمانہ بر زمینش
دامانِ فلک در آستینش

یک گوشۂ ابروش بہ دعویٰ
بر طاق نگندہ طاقِ کسریٰ
بُت خانہ سپردۂ پےِ او
آتش کدہ کشتۂ پُفے او
زاں خوے کہ برگل فشاندہ دستاں
ہر قطرہ بہارِ صد گلستاں
صد باغ بہشت شد نشیمش
صد اطلسِ چرخ در گلیمش
ناموسِ سحر بہ عنبریں مو

نقاشِ چمن بہ بادگیسو
صد صبح بہار در جبینش
صد دستِ چمن در آستینش

آئینہ وحدتش جہاں تاب
خورشید شہود اسطرلاب
در صید جہاں مرادِ چالاک
آویختہ نہ فلک بفتراک

(ایک موقعہ پر فیضی کے قلم سے حکمت کے یہ موتی ٹپکتے ہیں :)

ما طائرِ قدسیم ، نوا را نہ شناسیم
مرغِ ملکوتیم ، ہوا را نہ شناسیم
برہانِ ثبوتیم ز ما نفی نیاید!
از ما نغم آموز کہ لا را نہ شناسیم
با اہلِ جدل نکتہ توحید نہ گوئیم
در وحدتِ حق چون وچرا را نہ شناسیم!
در کشفِ حقائق سبق آموز ضمیریم
ترتیب دلیلِ حکما را نہ شناسیم
اصحابِ یقینیم ، گماں را نہ پسندیم
اربابِ صوابیم ، خطا را نہ شناسیم
از قافلۂ ما نتواں یافت نشانے
رقصِ جرس و دنگ درا را نہ شناسیم
بر دانشِ ما انجم و افلاک بخندند
گر صاحبِ لولاکَ لما را نہ شناسیم

صد شکر کہ با پیرو اصحاب و سولیسم
در شرع دگر راہ منارا نہ شناسیم

جامی کی نعت گوئی

جامی (متوفی ۸۹۸ھ) ثناگویانِ رسولؐ میں درجہ امتیاز و اختصاص کے حامل ہیں، انہوں نے رسالت مآبؐ کی شان میں محبت سے شعر کہے ہیں، اور حق یہ ہے کہ جو کچھ کہا ہے، خوب کہا ہے، فرشتہ ہیں اور کس جذبہ کے ساتھ فرماتے ہیں !

وصلی اللّٰہ علیٰ نورِ کزو شد نورہا پیدا
زمین از حُبِّ او ساکن فلک از عشقِ او شیدا
دو چشمِ نرگسینش را کہ مازاغ البصر خوانند
دو زلفِ عنبرینش را کہ واللیل اذا یغشیٰ
اگر نامِ محمدؐ را نیاوردے شفیعِ آدم
نہ آدم یافتے توبہ، نہ نوح از غرق نجّینا
دسو سینہ اش جامی الم نشرح لک بخواں
ز معراجش چہ می پرسی، کہ سبحان الذی اسریٰ

زورِ بیان اور شدتِ جذبات کے ساتھ ساتھ، یہ اشعار جامی کی وسعتِ علم و نگاہ، تلمیح اور کنایات کا بھی کتنا صاف اور واضح ثبوت پیش کرتے ہیں :

جامیؔ نے اور بھی بہت کچھ نعت میں کہا ہے، چند اشعار اور سُن لیجئے :

جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ
دلم زندہ شد از وصالِ محمدؐ

خوشا مسجد و منزل و خانقاہے
کہ در وے بود قیل و قالِ محمد

بصدق وصفا گشتہ بے چارہ جامیؔ
غلام غلامانِ آلِ محمدؐ

اور ذیل کے شعر میں جو، والہانہ جذبہ پایا جاتا ہے، وہ تو اپنا جواب ہی نہیں رکھتا

ادیم طائفی نعلین پا کن
شراک از رشتۂ جانہا ئے ما کن

اس شعر میں بڑی تلمیح ہے، اخبار و آثار میں مروی ہے کہ آں حضرتؐ طائف کی بنی ہوئی نعلین پسند فرماتے تھے، کیوں کہ وہاں کا چمڑا اچھا ہوتا تھا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جامی کہتے ہیں۔

طائفی چمڑے کے بنے ہوئے نعلین استعمال فرمائیے
اور ان جوتوں میں ہم غلاموں کے رشتۂ جاں کا تسمہ
لگائیے :

بقول ایک صاحب دل اہل علم !
نعت کا یہی ایک شعر، جامیؔ کی مغفرت کے لیے
کافی ہے !

ان اشعار میں بھی جامی کا جذبہ حب رسولؐ کتنا نمایاں ہے :

نہ آخر رحمت للعالمینی
ز حالِ ما چرا غافل نشینی
بروں آور وا ز بر و یمانی
کہ روئے تست صبح زندگانی

جامیؔ نے سلام بھی بڑے جوش اور والہانہ کیفیت کے ساتھ کہا ہے :

سلام علیک اے نبیِّ مکرم

کرم تر ز آدم و نسل آدم!
سلام علیک اے ز آبائے علوی
بصورت مؤخر بمعنی مقدم
سلام علیک اے بملک رسالت
ترا خاتم المرسلین نقش خاتم
ز سعی تو شد فتح ابواب مغلق
ز نطق تو شد کشف اسرار مبہم

معراج نبوی کے سلسلہ میں جامی نے بہت کچھ کہا ہے، اور جو کچھ کہا ہے وہ زور بیان، حسن ادا الفاظ، بندش اور اسلوب کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، چند اشعار نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں:

سواد طرہ اش خجلت دہ حور
بیاض غرہ اش نور علی نور
نسیمش جعد سنبل شانہ کردہ
چو لعلش اشک شبنم دانہ کردہ
طرب خواہاں سحر خنداں از آں لب
گریزاں روز ظلمت زد شبا شب
دریں شب آں چراغ اہل بینش!
سزائے آفریں از آفرینش!

دلش بیدار و چشمش در شکر خواب
ندیدہ چشم بخت ایں خواب در خواب
در آمد ناگہاں ناموس اکبر
سبک رو تر ازیں طاؤس اخضر

ازاں دولت سرا چوں خواجۂ دیں
خراماں شد بعزم خانۂ زیں
شد از صبوحیاں گردوں صدا دہ
کہ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ
دراں مسجد امام انبیا شد
صف پیشینیاں را پیشوا شد

چوں رفرف شد مشرف از وجودش
گرفت از دست رفرف عرش زودش
بدست عرش تن چوں خرقہ بگذاشت
علم بر لامکاں بے خرقہ افراشت
مکانے یافت خالی از مکاں نیز
کہ تن محرم نبود آں جا و جاں نیز
بدیدہ آنچہ از دیدن بروں بود
مپرس از باز کیفیت کہ چوں بود
شنید آں گہ کلامے، نے بہ آواز
معانی در معانی، راز با راز

یہ بھی جامی ہی کی فریاد ہے ——— لیکن کتنی اثر انگیز اور دل دوز!

اے بسرا پردۂ یثرب خواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب
ظلمت بدعت ہمہ عالم گرفت
بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت
کاش فتدز اوج عروجت رجوع

بازکند نور جماعت طلوع !
دیدۂ عالم بہ تو روشن شود
گلخن گیتی بہ تو گلشن شود

ذیل کے اشعار زبانِ شعر کی صورت میں حقائق، معارف اور اوصافِ نبوی کی کیسی دلآویز تصویر ہیں،

اے عربی نسبت و امّی لقب
بندۂ تو ہم عجم و ہم عرب
گردِ سرت الطحی و یثربی!
خاکِ درت مشرقی و مغربی!
تیغ عرب زن کہ فصاحت تراست
صید عجم کن کہ ملاحت تراست
از تو سیہ است سفیدی امید
بہ کہ سیاہی زہی بر سپید

نعتِ نبیؐ کے موقعہ پر جامی کی زبان سے الفاظ نہیں نکلتے پھول جھڑتے ہیں۔

در بزمِ احتشامِ تو سیارہ ہفت جام
در مطبخ نوالِ تو افلاک نہ طبق

بر دفترِ جمالِ تو تورات یک ورق
وز مصحفِ کمالِ تو انجیل یک رقم

خاقانی مدّاحِ رسول کی حیثیت سے

خاقانی (۵۲۱ھ) نے بھی اس میدان میں قدم رکھا ہے، اور نعت رسولؐ میں ایسی ایسی گلکاریاں کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، کہتا ہے:

در مکتبِ تو عقل پیمبر تدبیر

در بزم تو روحِ چاشنی گیر
ارواحِ عَلَم بر سپاہت!
جبریلِ برید بارگاہت
حق ہم ازپئے تو ساخت الحق
شب چترِ سیاہ، روز بیرق
طرف کمر تراست عبا و ید!
پیروزہ چرخ و لعل و خورشید
تاکرسی تو مورچنج گاہ است!
بر چرخ صدائے لالہ است
باعین کمالت اے ملک وشش
طرلی خشک است وکوثر آتش
انگشت تو گو قلم نہ سود است
مہ راچو سرِ قلم نمود است
تاریخ شرف کہ آسماں راست
از روز ولادت تو برخاست

یہ خصوصی اس خاقانی کا ہے:

دُنیا کو دو دروزہ کاخ وکرخ است
درراہ محمدی کلوخ است

نظامی گنجوی کا کلامِ نعت

مولانا نظامی گنجوی (متوفی ۶۰۲ھ) نے بھی اس ایوان میں قدم رکھا ہے لیکن کس خوش بیانی اور احتیاط کے ساتھ:

اے گہرتاجِ منزستاد گاں!

تاج دہ گوہر آزادگان — !
ہر چہ ز بیگانہ و خیل تواند
جملہ دریں خانہ طفیل تواند
تو بہ دل و جنبش روئے تست
گل شکرش خاک سر کوئے تست
خط فلک خطۂ میدان تست
گوئی زمیں در خم چوگان تست
اے نفست نطق زبان بستگان
مرہم سودائے جگر خستگان
خاک تو خود روضۂ جان من است
روضۂ تو جان جہان من است

ذاتِ رسالت مآبؐ کے بارے میں مولانا نظامی پھر فرماتے ہیں :-

محمدؐ کآفرینش ہست خاکش
چراغ افروز چشم اہل بینش
سر و سرہنگ میدانِ وفا را
سپہ سالار خیل انبیا را
یتیماں را نوازش در نسیمش
ازیں جا نام شد در یتیمش!
سریر عرش را نعلینِ او تاج
امین وحی و صاحب سر معراج
بصر در خواب و دل در استقامت
زبانش امتی گو تا قیامت
شمۂ نہ مسند عصمت اختران

ختمِ رسل، خاتمِ پیغمبراں
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست
ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
سنبل او سنبلۂ روز تاب!
گوہرِ او ، لعل گوہرِ آفتاب
خندۂ خوش زاں نزدے شکرش
تا ز برد آبِ صدف گوہرش

حکیم سنائی کی نذرِ عقیدت

حکیم سنائی (ولادت ۴۴۳ھ، وفات ۵۴۵ھ) کی عظمت اور مقام کے اقبال مُعتقت زیادہ قائل ہیں، اپنی متعدد کتابوں میں انہوں نے عقیدت اور ارادت کے ساتھ موقع بہ موقع ان کے اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے، اور ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ افغانستان گئے تو خاص طور پر، مزارِ سنائی پر حاضری دی اور زبانِ حال پر جو اثر انگیز اشعار جاری ہوئے، وُہ ان کی مثنوی "مسافر" میں درج ہیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ سنائی، اپنی فکر و خیال اور شخصیت کے اعتبار سے اکابر صوفیہ و اسلاف میں ایک مرتبہ خاص پر سرفراز ہیں: "حدیقہ سنائی میں" انہوں نے جو کچھ سرورِ کائنات پر لکھا ہے، اس کے چند اشعار منتخب کر کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

شرع او در افلک مسلم کرد!
خانہ بر بامِ چرخِ اعظم کرد
انبیا و ریختہ ہم از زرِ او
ہر چہ شاں نقد بود بر سرِ او
آمد اندر بسوئے زمینِ عرب
چشمۂ زندگانی اندر لب
فیضِ فضلِ خدائے دایۂ او
فترِ پرِ ہمائے سایۂ او

خلق او مایہ روحِ حیوان را!
خلق او مایہ نفسِ انسان را
نعت تاں روئے والضحیٰ آمد
صفت زلف اذا سجیٰ آمد
ہمتش از الرفیق الاعلیٰ جوئے
عزتش لا نبی بعدی گوئے

کرده با شاه پرطاؤسی
جلوه در بوستانِ قدوسی
سترِ او صورت وفا خوانده
دل او مرکبِ صفا رانده
داده اشراف بر ہمہ عالم
مرد را کرده کار لوحِ و قلم
حلمِ او ہیزبان عالم داد
شرعِ او شحنۂ خدا آباد،
قابلے چوں عتیقش[1]، اندر بر
قاتلے ہمچو حیدرش[2]، بر در
طینتش زینت جہاں آمد
ساحتش راحت رواں آمد

---

[1] اشارہ ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف
[2] مراد ہیں علی مرتضےٰ

عطّار کا ترانۂ نعت

حضرت خواجہ فرید الدین عطار (متوفی ۶۳۷ھ) نے اپنی مثنوی "منطق الطیر" میں رسالت مآبؐ کی ذات گرامی کے بارے میں جو موتی بکھیرے ہیں، ایک نظارہ ان کا بھی کر لیجئے:

آفتاب شرع و دریائے یقیں
نورِ عالم رحمت للعالمین

خواجۂ کونین و سلطانِ ہمہ
آفتابِ جانِ و ایمانِ ہمہ

کتنی سچی اور مبنی برحقیقت بات فرمائی ہے:
نور او مقصود مخلوقات بود!
اصل معدومات و موجودات بود

بعث او شد سرنگونی بتاں
اُمت او بہترین امتاں

خاک در عہدش قوی ترچیز یافت
مسجدے گشت و طہورے نیز یافت

چوں زبانِ حق زبان او ست بس
بہتریں عہدے، زمانِ اوست بس

(الفاظ کی روانی، مفہوم و معنی اور مغزِ مطلب کو کس طرح اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے:)

عقل را در خلوت او راہ نیست
علم نیز از وقت او آگاہ نیست

یہ شاعری نہیں حقیقت ہے:
چوں بہ خلوت جشن ساز د با خلیل
پر بسوزد در نگنجد جبرئیل

انبیاء در وصف تو حیران شده
سر شناسان نیز سرگردان شده

اے طفیل خندهٔ تو آفتاب
گریهٔ تو کار فرمائے سحاب
هر دو گیتی گرد خاک پائے تست
در گلیمِ خفته چه جائے تست
خواجگی هر دو عالم تا ابد
کرد وقف احمدِ مرسل احد

بیکسان را کس توئی در هر نفس
من نه دارم در دو عالم جز تو کس
یک نظر سوئے من غم‌خواره کن
چارهٔ کار من بے چاره کن

دیدهٔ جان را لقائے تو بس است
هر دو عالم را رضائے تو بس است

داروئے درد دل من مهر تست
نور جانم آفتابِ مهر تست

کافران را داده مهلت در عتاب
نافرستاده بعهد او عذاب

دین و دُنیا در پناہِ بخشش
زندگی دادہ زہیبرِ اُمتش

حافظ خواجۂ کونین کے دربار میں

خواجہ حافظ نے بھی نعت رسولؐ میں جو کچھ کہہ دیا ہے اس کا جواب نہیں :-

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر
من وجہک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یعنی :
آپؐ انسانوں کے سردار ہیں ۔
آپؐ کے روئے روشن سے چاند روشنی پاتا ہے — !
آپؐ کی ثنا و صفت کسی انسان سے ممکن ہی نہیں ،
مختصر یہ کہ خدا کے بعد بزرگی صرف آپؐ ہی کا حصہ ہے — !

عرفی کا نذرانہ

عرفی ، (متوفی ۹۹۹ھ) عہد جہانگیر کا مشہور شاعر جوان عمر اور جواں مرگ :
عرفی اب بھی زندہ ہے ، اس کا کلام بھی زندہ ہے ، اور اس کی نعت بھی زندہ ہے
کہتا ہے :

تقدیر بہ یک ناقہ نشانید دو محمل
سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را
تا نام ترا نسر فہرست نہ کردند
شیرازہ مجموعہ نہ بستند کرم را ،

اس زمین کی بلندی کا عرفی کو خود بھی احساس ہے:

عرفی مشتاب این رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہ کونین و مدیح کے و جم را

عرفی ایک سرمست شاعر تھا۔ حبِ رسولؐ کے میدان میں بھی یہی سرمستی اس کا طغرائے امتیاز ہے:

گر نقش جمالِ تو نہ گیرد
از سینہ بروں کنم صفا را
گنجے بکف آورم کہ شاید
سرمایۂ نعتِ مصطفیٰؐ را
درج گہرے آورم کہ شاید
آویزہ گوشِ انبیاء را
دستے سخن آورم کہ شاید
مجموعہ لطف روسیاہ را
اے وجود تو دست محل سخا را
اے عزم تو بال و پر صبا را

کس ذوق و شوق کے ساتھ عرفی کی زبان نعت سرائی کر رہی ہے:

اے مہر تو جان آفرینش
نعت تو زبان آفرینش
لطف تو چمن طراز امکاں
خشم تو خزاں آفرینش

بجودت ہمہ بخشش عالم کون
علمت ہمہ داں آفرینش

امیر خسرو بارگاہ رسالت میں

امیر خسرو (متوفی ۷۲۵ھ) ایک نو مسلم تھے، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی بارگاہ میں پہنچ کر بالکل بدل گئے، کچھ سے کچھ ہو گئے:

ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
سیہ کار تھے، باصفا ہو گئے ہم

ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں خسرو کی فارسی دانی کے سامنے اہل پارس بھی سر عقیدت خم کرتے ہیں، اردو زبان کے بڑی حد تک موجد درحقیقت امیر خسرو ہی تھے، انہوں نے ہندی، اردو، اور فارسی میں بہت کچھ کہا ہے، نعت کے میدان میں بھی ان کے قدم آگے ہی کی طرف بڑھتے ہیں، ملاحظہ ہو:

داں ازلی مکتب امی لقب
عقل کل آموختہ لوح ادب
ہر نخشش کامل سلمانیت
حاشیہ نامہ ربانیت

خسرو جتنے بڑے اہل دل تھے، اتنے ہی بڑے اہل علم بھی تھے، ان کے کلام میں اخبار و آثار اور روایات کی بڑی لطیف تلمیحیں ملتی ہیں، فرماتے ہیں:

درس شرف کردہ بخیر المآب
شیر خوردہ زام الکتاب

عین عنایت زعطائے کریم
دل ہدایت براہ مستقیم

عروۂ وثقیٰ کتفِ نور او
حبلِ متین نسخۂ منشور او
زاں دو مقام کر دو جہاں پیش رفت
گرچہ پس آمد ز ہمہ پیش رفت
زعرق افشاں بناگوش وے
چشمۂ خورشید یکے قطرہ خوے
از لب او نیم نمے سلسبیل
بر شکر او مگسے جبرائیل!

(دیکھئے کس جوش، خروش اور تمکنت کے ساتھ کہتے ہیں :)

اے سخنت گنج خدا را کلید
گوہر تاباں گنج تو کردی پدید!
غرہ ما از خم ابروے تست :
طرہ ما از شکن سوے تست
لعل تو گنجینۂ رحماں کشاد!
چشم تو دروازۂ احساں کشاد
ہر قدمت عہدۂ ہر دو سرائے
ہر سخنت خازن وحی خدائے
پر تو مشعل تو راہ ہمہ!
ظل لوائے تو پناہ ہمہ
فرش تو یزداں ز فلک ساختہ
تو ز گلیمے علم افراختہ
ہر کہ طراز تو بہ بازو نہاد
نعت دو عالم بہ تراز و نہاد

جان سخن مقطع ہے، دیکھئے کس خوبی سے مقطع میں اپنے نام کو نبایا ہے۔

من کہ بجاں تشنۂ جوے توام
خسروم، اما سگِ کوے توام

کلامِ قدسی

ذات قدسی کے بارے میں، قدسی کی زبانِ عقیدت نے جو کچھ کہا ہے اسے بھی سن لیجئے:

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطّلبی!

ما ہمہ تشنہ لبانیم توئی آب حیات
رحم فرما کہ زحد می گذرد تشنہ لبی

معراج کا ذکر کرتے ہیں:

شب معراج عروج تو زافلاک گذشت
بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

ذات پاک تو دریں ملک عرب کردہ ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبان عربی

ارادت و عقیدت کا کتنا والہانہ مظاہرہ ہے:

نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

اس حقیقت اور بیان واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے:

بر درِ فیض تو استادہ بصد عجز و نیاز
رومی و طوسی و ہندی، حلبی و عربی

ظہوری کا زمزمۂ نعت

ظہوری نے بھی سرکارِ دو عالم کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کی ہے
چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

محمد شہنشاہِ خیلِ رسل
کہ خسروند پیشش بہ چرخ دمیہ کل

درفشاں زر درج عبد مناف
بانگشتِ اعجاز، مہ را شگاف

زابروشش محراب عین الیقیں
زگیسوشش اسبابِ حبل المتیں

نمک بازدریاش در شبنمے
فصیحاں زغو غاشش در ابکمے

نقیہ است دریا و کاں را گہر
یتیم است، پیر و جواں را پدر

ناصر علی سرہندی

اور ناصر علی سرہندی نے، دو شعر میں جو کچھ کہہ دیا ہے، وہ ایک پورے دیوان پر بھاری ہے —— ارادت، عقیدت، صداقت، حقیقت، کیا کچھ نہیں ہے؟

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدۂ
ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ

اے ختمِ رسل، قرب تو معلوم شد
دیر آمدۂ، زراہ دور آمدۂ

نظیری نیشاپوری

نظیری نیشاپوری کے مقام سے، ہر اہلِ ذوق واقف ہے، نظیری نے اس زمین میں کیا گل کھلائے ہیں، یہ بھی دیکھ لیجئے:

صفا از عقدہ دل ہاست آں زلفِ معنبر را
بحمد اللہ کہ ربطے ہست با مطلق مقید را

گر دادے روح را با جسم الفت گر نہ گردیدے
محمدؐ کارواں سالارِ ازواجِ مجرد را!
بیک حسن و شمائل طرحِ عشق انگندہ شد ورنہ
نمی دارند نقش ہستی ایں لوحِ زبرجد را

مرزا غالب

مرزا غالب
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا،

رندمشرب، لاابالی، وارستہ مزاج، فلسفہ میں غرق، نشہ صہبا میں مست، لیکن جذبہ اور عقیدت کا جہاں تک تعلق تھا، وہ پکے اور کھرے مسلمان تھے۔

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

ہر اصول پر سختی سے عامل، نعت و منقبت کے سلسلہ میں انہوں نے بہت کم کہا ہے، لیکن جو کچھ کہا ہے وہ اتنا گراں مایہ ہے کہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ـــــــ اب تھوڑا سا غالب کا کلام بھی، سُن لیجئے :

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

واعظ حدیثِ سایۂ طوبےٰ فرو گذار
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد
سوگندِ کردگار بہ جانِ محمدؐ است

در خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است

بنگر دو نیمہ گشتن ماہِ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بیانِ محمدؐ است

ذیل کے شعر کی تشبیہ و تمثیل اور خوبی بیان دیکھیے گا :

آئینہ دار پرتو مہر است آفتاب
شان حق آشکار از شان محمدؐ است

دانی اگر بہ معنی لولاک وا رسی
خود ہر چہ از حق است از آن محمدؐ است

اس شعر کی کیفیت اور تاثر آفرینی ملاحظہ فرمائیے :

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است
اما کشاد آں ، ز کمان محمدؐ است !

اور مقطع میں تو کہنا چاہیئے کہ قلم توڑ دیا ہے ، اس سے زیادہ کیا کوئی کہے گا :

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم !
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

○

ایک زمانہ میں مسئلہ امتناع النظیر علماء اور اُن کے پیروؤں کے درمیان بڑا معرکہ آرا مسئلہ رہ چکا ہے ۔ علما کے دو گروہ تھے ، ایک گروہ وہ تھا جو اس کا قائل تھا کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے ، وہ اگر چاہے تو رسُول اللہ جیسا انسان کسی دوسرے عالم میں بھی پیدا کر سکتا ہے ، دوسرا گروہ تھا جو امتناع نظیر کا قائل تھا ، اس کی رائے میں آں حضرتؐ کا ثانی پیدا ہونا ناممکن تھا ، پہلے گروہ کے سربراہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ تھے ، دوسرے کے مولانا فضل حق خیرآبادی ، اس موضوع اور مبحث پر بڑے تند اور تلخ رسالے لکھے گئے ، غالبؔ کے تعلقات مولانا فضل حق خیرآبادی سے بہت زیادہ تھے ، اس باب میں وہ مولانا فضل حق کے افکار و آرا سے بہت متاثر تھے ۔ چنانچہ انہوں نے ایک شعر میں ساری بحث ختم کر دی ہے کہتے ہیں :

○

منشائے ایجاد ہر عالم یکے است
گر دو صد عالم بود خاتم یکے است ،

گرامیؔ | ہندوستان کے متاخرین شعرا میں، مولانا گرامی، فارسی کے مایہ ناز شاعر تھے، دو شعر ان کے بھی سُن لیجئے :-

خاور دمد از شبم بہ ایں تیرہ شبی
کوثر چکد از لبم بہ ایں تشنہ لبی

اے دوست، ادب کہ در حریم دل ماست
شاہنشہ کونینؐ، رسولِ عربیؐ

جگرؔ | جگرؔ مرادآبادی کو، لوگ اُردو زبان کے ایک بلند مرتبت شاعر کی حیثیت سے عام طور پر جانتے ہیں، لیکن اس حقیقت کی طرف بہت کم لوگوں نے توجّہ کی ہے کہ وہ فارسی میں بھی کہتے ہیں، اور بعض اصحاب ذوق تو یہ رائے رکھتے ہیں کہ جگرؔ کی فارسی شاعری ان کی اردو شاعری سے بہتر اور برتر ہے :
جگرؔ نے بھی آں حضرتؐ کی ثنا میں زبان نعت کھولی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا کلام لفظی اور معنوی ہر اعتبار سے، بلند پایہ اور مایہ ناز ہے — نعت میں ترانہ سنجی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

اے مثل تو در جہاں نگارے
یزداں دگرے نہ آفریدہ

اے آں کہ بہ امتزاج کامل
در جملہ صفات، برگزیدہ

تو پرتو حسن ذات، از تو
یک شعلہ بہ دیگراں رسیدہ

اے بے ہمہ خلق و با ہمہ خلق
اے از ہمہ خلق برگزیدہ

مشرق ہمہ پُر زفتنہ و شر
مغرب ہمہ مست و سرکشیدہ

اے آں کہ ز شوق بے نہایت
حق را ہمہ آشکار دیدہ!
طے کردہ مراحل و منازل!
تا سدرہ بہ ساعتے رسیدہ
وز سدرہ بہ انتہائے قوسین
با عظمت خاص در بریدہ!

اب دیکھئے کتنی نازک بات کو کتنے نازک انداز میں ادا کرتے ہیں:

اے آں کہ درون پردۂ راز
از خویش بہ خویشتن رسیدہ
کے عقل تواں رسد بہ پایاں
ہم عشق ہنوز نارسیدہ!
"لولاک لما خلقت الافلاک"
در مدح تو جان ہر قصیدہ
اے اسم تو حرز جانِ عشق
اے ذکر تو قلب نور دیدہ
اے بر تو نثار شرم عصیاں
اے بر تو فدا دل تپیدہ

خاتمہ کلام بھی قابل داد ہے:

استادہ بہ پیش بارگاہت
پیرے بہ رخ آستیں کشیدہ
شاید جگر حزیں ہمیں است
از بارگنہ کمر خمیدہ

مذکورہ بالا صفحات میں چند فارسی شعرا کا جو نعتیہ کلام پیش کیا گیا ہے، وہ اگرچہ مختصر ہے ــــــ:
لیکن اس سے ایک اندازہ بہرحال ہو جاتا ہے کہ فارسی زبان میں نعت کا انداز و اسلوب کیا تھا؟ اور نعتیہ کلام میں زیادہ زور کس چیز پر دیا جاتا تھا؟ ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ عام طور پر ہمارے نعت گو شعرا ، الفاظ و اصطلاحات سے کھیلتے ہیں، سوز و درد، اور جذبۂ باطن کے نقوش کم نظر آتے ہیں۔ الفاظ کی خوبی، بندش کی چستی، کلام کی روانی، خیال کی بلندی، اصطلاحاتِ علمیہ و اسلامیہ سے واقفیت اور اُن کا صحیح و دُرست، استعمال، بلاشبہ، یہ سب چیزیں اپنی ایک جُداگانہ قدر رکھتی ہیں، ان کی منزلت اور حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن نعت کے ایوان میں داخل ہوتے وقت، اظہارِ جذبات میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے
یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

ہم مانتے ہیں، شعرائے متقدین و متاخرین نے اس اصول کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے اور عرفی نے تو صاف طور بتا دیا ہے:

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشیار کہ نتواں بہ یک آہنگ سرودن
نعت شہ کونین و مدیح کے وجم را!

لیکن مجموعی حیثیت سے، جو چیز ہمیں فارسی شاعری کی نعت میں کھٹکتی ہے، وہ یہی بیک آہنگ سرودن ــــ نعتِ شہ کونین و مدیح کے وجم! ہے
بہرحال، ہم نے فارسی شاعری کا جائزہ لے لیا، اب اردو شاعری کی باری ہے!

(۲)

اردو کے نعتیہ کلام کا تعارف

○

اردو زبان کے نعت گو شعرا کے کلام کا

• تعارف • انتخاب • نمونہ •

●●●

- حالی کے جذبات نعت
- شاد عظیم آبادی
- اکبر الہ آبادی
- اصغر گونڈوی
- ظفر علی خاں
- اقبال احمد سہیل
- جوش ملیح آبادی
- حفیظ جالندھری
- بہزاد لکھنوی
- ماہر القادری
- روش صدیقی
- حسرت موہانی

اردو زبان کے تین نعت گو !

- امیر مینائی
- محسن کاکوروی
- بیدم شاہ وارثی

اردو کے نعتیہ کلام کا تعارف

نعتیہ کلام کے اعتبار سے، اردو زبان گراں مایہ اور قابلِ قدر سرمایہ کی مالک ہے، اب ہم اس عنوان کے ماتحت اردو شاعری کا جائزہ لینا چاہتے ہیں:

اس سلسلہ میں سارے شعراء کو پیش نظر نہیں رکھا جا سکتا، اس کے لیے تو پھر ایک مستقل اور طویل و ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی، لہٰذا اس کام کو کسی آئندہ موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، اور آج کی مجلس میں صرف چند شعرا کے کلام کو پیش نظر رکھیں گے۔

اردو کے نعت گو شعرا میں،

(۱) حضرت محسن کاکوروی

(۲) منشی امیر احمد مینائی

(۳) اور بیدم شاہ وارثی،

ایک خاص مقام و منزلت کے حامل ہیں، یعنی ان حضرات کا نعتیہ کلام کمیت اور کیفیت ہر اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے، انہوں نے یوں تو شاعری کی دوسری اصناف میں بھی اپنی طبع رواں کے جوہر دکھائے ہیں لیکن نعت میں یہ درجہ اختصاص پر فائز تھے، لیکن قبل اس کے کہ ہم ان حضرات کے کلام کا نسبتاً تفصیلی جائزہ لیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند دوسرے شعراء کا کلام بھی، اختصار کے ساتھ پیش نظر رکھیں، اس اضافے سے دوسروں کے انتخاب کا اندازہ بآسانی ہو جائے گا!

حالی کے جذبات نعت

اپنے مسدس "مد و جزر اسلام" میں مولانا حالی نے بڑے والہانہ انداز میں، سرورِ کائنات کا ذکر کیا ہے۔

ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد

کا کامل نمونہ ،

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا !
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی ، غلاموں کا مولیٰ
خطاکار سے درگزر کرنے والا !
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا !
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا !

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رُخ ہوا کا

مسدس " مد و جزر اسلام " کے علاوہ بھی ، حالی نے نعت میں اشعار کہے ہیں ، — مختصر سا نمونہ :
اُٹھا دایت کو تو بین ضرورت کے وقت

جیسے کہ ہنگام قحط قبیلہ سے اٹھے گھٹ
خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شر و فساد
تو نے اسی کو دیا ارضِ مقدس بنا
تو نے تحمل کیا، قوم کا غلبہ تھا عجب
جب ہوئی مغلوب قوم، تو نے ترحم کیا

○

تو نے کیا سِرِ حق عارف و عامی پہ فاش
ایک کو سمجھا دیا، ایک کو دکھلا دیا!
حجتِ حق کر چکا دین ترا جب تمام!
پھر نہ کسی دین کا ڈنگ جہاں میں جما
بجھ گئے آتش کدے، بیٹھ گئے بتکدے
ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت فنا
سلسلۂ انبیاء ختم نہ ہوتا اگر
حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اٹھا

○

شادؔ عظیم آبادی

شادؔ عظیم آبادی، بلند مرتبت شاعر تھے، تغزل کے امام، زبان کے بادشاہ کہتے ہیں:

تمنا دے کے الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

○

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

○

لیکن نعت پر جب ان کی زبان کھلتی ہے، تو اس زمین کو بھی، آسماں بنا دیتے ہیں:

لکھتا ہوں، وصف زلفِ شہنشاہِ کائنات
خطرہ جو مشک کا ہو تو نافہ کی موجودات
حقا کہ اس کے آگے شبِ قدر بھی ہے مات
شاید کہ پھیل کر یہی معراج کی تھی رات

قدرت عیاں ہر اک گرہ بے بدل سے ہے
رشتہ اسی کے سائے کو شامِ ازل سے ہے

جاتے ہیں سوئے عرش بریں ختمِ رسلؐ
لٹتے ہیں راستہ میں ستاروں کے گنج گل
حاضر ہیں انبیاء سلف آستاں پہ کل
ہے قدسیوں میں صلّ علیٰ مصطفےٰ کا غل

قباب رُخ سوئے درِ دولت کئے ہوئے
استادہ کس ادب سے ہے مشعل لیے ہوئے

ہر دم فلک پکار رہا ہے نصیب شرف
روحانیوں نے آج جمائی ہے آ کے صف
خود کہکشاں نے راہ بنا دی ہے اک طرف
زہرہ لیے کھڑی ہے بجانے کو چنگ و دف

رکھا ہے زین مدح امیں نے براق پر
جائیں گے آپ گنبدِ نیلی رواق پر

اکبر الٰہ آبادی

اکبر الٰہ آبادی ایک نغز گو شاعر تھے، ظرافت کی چاشنی کے ساتھ، اصلاح و تعمیر کی باتیں کرتے تھے، اس اعتبار سے انہیں مصلح شاعر بھی کہا جا سکتا ہے، ان کی شاعری کا لب لباب اور پیام یہی تھا کہ مسلمان پھر وہی عظمت و رفعت حاصل کر لیں جس سے وہ محروم ہو چکے ہیں، پھر اس راستہ پر چلیں جس کی رہبری انہوں نے ترک کر دی ہے، پھر اسی نظام حیات کو اپنائیں جس نے انہیں تاج کسریٰ اور تختِ جمشید کا مالک

بنادیا تھا، وہ ہر اس چیز کے مخالف ہیں جو نئی ہے، جو اسلام کی مقررہ راہ سے ہٹی ہوئی ہے، وہ تعلیم میں بھی جدّت کے مقابلہ میں قدامت کو ترجیح دیتے ہیں، وہ خود انگریزی کے تعلیم یافتہ تھے ایک عرصہ دراز تک جج کی کرسی پر فائز رہے لیکن زندگی بھر سرسیّد کے اس لیے مخالف رہے کہ وہ نئی تعلیم سے مسلمانوں کو آشنا کر رہے تھے اور یہ جرم اکبر نے زندگی بھر معاف نہیں کیا، بلکہ "سزا" دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی:

اکبر کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن ان کی نیت پر حملہ نہیں کیا جا سکتا، وہ سچائی کے ساتھ وہی کہتے تھے، جو ان کے دل اور ضمیر کی آواز آتی تھی:

متعدد مقامات پر، انہوں نے ذکر رسُول کیا ہے اور ہر جگہ ایک نئی شان اور ایک نیا جذبہ پایا جاتا ہے فرماتے ہیں:

دُرفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا، آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے رہبر بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

○

اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی تغزل کے شاعر تھے، کہتے تھے اور خوب کہتے تھے، اپنے رنگ کے بادشاہ تھے، جتنے اچھے شاعر تھے، اس سے زیادہ مشہور ہوئے، اور علم و ادب کی بزم میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، اصغر نے نعتیہ کلام کی طرف بھی توجہ کی ہے اور جو کچھ کہا ہے، خوب کہا ہے!

کچھ اور عشق کا حاصل نہ عشق کا مقصد
جز اینکہ لطفِ خلش ہائے نالۂ بے سود
اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود
مقامِ جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے
میں بے خبر ہوں بانداز ہائے فریب شہود
چلوں میں جانِ حزیں کو نثار کر ڈالوں

نہ دیں جو اہلِ شریعت جبیں کو اذنِ سجود

O

وہ سرورِ دو جہاں وہ محمدِ عربی
بہ روحِ اعظمِ پاکش درود نا محدود

ضیائے حسن کا ادنیٰ سا یہ کرشمہ ہے
چمک گئی ہے شبستانِ غیبؔ بزمِ شہود

کچھ اس ادا سے مرا اس نے مدعا پوچھا
ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود

O

ظفر علی خاں

ظفر علی خاں کا دورِ حیات ، طوفانی دور تھا ، ان کی سیاست بھی طوفانی تھی ، زندگی بھی اور شاعری بھی ، شاعری کا کمال ، ہنگامی اور وقتی ، شخصی اور ذاتی عزائمات پر صرف کیا ہے ، پھر بھی ، زبان کی فصاحت اور سلاست ، بیان کی عظمت اور لطافت خیال کی بلندی اور رفعت اپنی داد آپ حاصل کر لیتی ہے :

ظفر علی خاں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں ، تینوں میں نعتیہ کلام کافی موجود ہے ، نمونہ ملاحظہ ہو :

جو نہ تھی عرب کی ہوئی شانِ احمد
تو زینت عجم کی ہوئی آنِ احمد

ارسطو کی حکمت ہے یثرب کی لونڈی
فلاطوں ہے طفلِ دبستانِ احمد

O

اقبال احمد سہیل

اقبال احمد سہیل عہدِ حاضر کے شعرا میں ، اپنی ذہانت و ذکاوت اور ملکۂ شعری کی وجہ سے ایک امتیازِ خاص کے حامل تھے ، وہ علامہ شبلی کے شاگردِ رشید تھے ان کی شاعری میں شبلی کا رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے :

سہیل نے تغزل کی شاعری پر بہت کم توجہ کی ، ان کی شاعری کا موضوع زیادہ تر مذہب اور مذہبی کابر ہیں ،

نعت بھی کہتے ہیں،

کتابِ فطرت کے سرورق پر جو نامِ احمدؐ رقم نہ ہوتا
تو نقشِ ہستی ابھر نہ سکتا، وجودِ لوح و قلم نہ ہوتا
یہ محفلِ کن فکاں نہ ہوتی، جو وہ امامِ امم نہ ہوتا
زمیں نہ ہوتی، فلک نہ ہوتا، عرب نہ ہوتا عجم نہ ہوتا
ہر اک سویدائے دل سے پیدا جھلک محمدؐ کے میم کی ہے
دل اس کی خلوت سرا نہ ہوتا تو نقشِ بیت الحرم نہ ہوتا

○

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی ایک مخصوص رنگ کے شاعر ہیں، ان کی شاعری رندی اور مستی کی شاعری ہے، لیکن نعت کا ترانہ جب زبان پر آتا ہے، تو کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں:

تیرے کرم نے ڈال دی طرحِ خلوص و بندگی
تیرے غضب نے بند کی رسم و رہِ ستم گری!
لَے سے تیرے منتظم پست و بلندِ کائنات
ساز سے تیرے منضبط گردشِ چرخِ چنبری
جھکے ہوؤں پہ کی نظر رشکِ خضر بنا دیا
راہزنوں کو دی ندا بن گئے شمعِ رہبری
چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری
زمزمہ تیرے ساز کا لحنِ بلالؓ حق نوا،
صاعقہ تیرے ابر کا لرزشِ روحِ بوذریؓ
شان ترے ثبات کی، عزمِ شہیدِ کربلا!
شرح ترے جلال کی ضربتِ دستِ حیدریؓ
تیرا لباسِ فاخرہ، چادرِ کہنۂ بتولؓ!
تیری غذا لئے خوش مزہ نانِ شعیرِ حیدری

ایک اور موقعہ پر کہتے ہیں،

آگیا جس کا نہیں ہے کوئی ثانی وہ رسولؐ
روحِ فطرت پر ہے جس کی حکمرانی وہ رسولؐ
جس کا ہر تیور ہے حکمِ آسمانی وہ رسولؐ
موت کو جس نے بنایا زندگانی وہ رسولؐ
محفلِ سفاکی و وحشت کو برہم کر دیا!
جس نے خوں آشام تلواروں کو مرہم کر دیا

○

فقر کو جس کے تھی حاصل کج کلاہی، وہ رسولؐ
گلہ بانوں کو عطا کی جس نے شاہی، وہ رسولؐ
زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی، وہ رسولؐ
جس کا اک اک سانس قانونِ الٰہی وہ رسولؐ
جس نے قلبِ تیرگی سے نور پیدا کر دیا
جس کی جاں بخشی نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

○

حفیظ جالندھری

حفیظؔ جالندھری نے "شاہنامہ اسلام" لکھ کر، بہت بڑی خدمت ملی و دینی انجام دی ہے
حفیظؔ کا کلام زبان کی لغزشوں سے پاک نہیں ہے، لیکن اس میں جو روانی، جوش اور سلاست
ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، اور اس چیز نے زبان کی غلطی پر پردہ ڈال دیا ہے۔
ذیل میں حفیظ کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں، ان سے اندازہ ہوگا کہ گو الفاظ ساتھ نہ دیں لیکن دل کا جذبہ
کرنے میں شاعر نے دل کی پوری قوت صرف کر دی ہے:

یہ کس کی جستجو میں مہرِ عالم تاب پھرتا تھا
ازل کے روز سے بیتاب تھا، بےخواب پھرتا تھا

یہ کس کی آرزو میں چاند نے سختی سہی برسوں
زمیں پر چاندنی برباد آوارہ رہی برسوں

یہ کس کے شوق میں پتھرا گئیں آنکھیں ستاروں کی
زمیں کو تکتے تکتے اگئیں آنکھیں ستاروں کی!
کروروں کروٹیں کس کے لیے ایام نے بدلیں
پیاپے کروٹیں کس دھن میں یاں صبح وشام نے بدلیں
یہ کس کے واسطے مٹی نے سیکھا گل فشاں ہونا
گوارا کر لیا پھولوں نے پامالِ خزاں ہونا؟
یہ سب کچھ ہو رہا تھا ایک ہی اُمید کی خاطر
یہ ساری کاوشیں تھیں ایک صبح عید کی خاطر
مشیت تھی کہ یہ سب کچھ تہِ افلاک ہونا تھا!
یہ سب کچھ ایک دن نذرِ شہِ لولاک ہونا تھا

○

خلیل اللہ نے جس کے لیے حق سے دُعائیں کی
ذبیح اللہ نے وقتِ ذبح جس سے التجائیں کیں
جو بن کر روشنی پھر دیدۂ یعقوبؑ میں آیا
جسے یوسفؑ نے اپنے حسن کے نیرنگ میں پایا
کلیم اللہ کا دل روشن ہوا جس ضو فشانی سے
وہ جس کی آرزو بھڑکی جوابِ لن ترانی سے
وہ جس کے نام سے داؤد نے نغمہ سرائی کی
وہ جس کی یاد میں شاہِ سلیماںؑ نے گدائی کی!
دلِ یحییٰؑ میں ارماں رہ گئے جس کی زیارت کے
لبِ عیسیٰؑ پہ آئے وعظ جس کی شانِ رحمت کے

وہ دن آیا کہ پورے ہو گئے تورات کے وعدے
خدا نے آج ایفا کر دیئے ہر بات کے وعدے

○

صدا ہاتف نے دی، اے ساکنانِ خطۂ ہستی
ہوئی جاتی ہے پھر آباد، یہ اُجڑی ہوئی بستی
مُبارک باد ہے ان کے لیے جو ظلم سہتے ہیں
کہیں جن کو اماں ملتی نہیں، برباد رہتے ہیں
مُبارک باد، بیواؤں کی حسرت زا نگاہوں کو
اثر بخشا گیا، نالوں کو، فریادوں کو، آہوں کو

○

ضعیفوں، بیکسوں، آفت نصیبوں کو مُبارک ہو
یتیموں کو، غلاموں کو، غریبوں کو مُبارک ہو
مُبارک ٹھوکریں کھا کھا کے پیہم گرنے والوں کو
مُبارک دشتِ غربت میں، بھٹکتے پھرنے والوں کو!
مُبارک ہو کہ دورِ راحت و آرام پہنچا
نجاتِ دائمی کی شکل میں اسلام آ پہنچا
مُبارک ہو کہ ختم المرسلینؐ تشریف لے آئے
جنابِ رحمت للعالمینؐ تشریف لے آئے

○

پھر آگے چل کر حفیظ نے سلام کہا ہے، یہ سلام بھی اثر و کیف کے اعتبار سے خاص چیز ہے:

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوبِ سُبحانی
سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوعِ انسانی!
سلام اے ظلِ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے، زندگی کی لوحِ پیشانی
سلام اے سِرِّ وحدت، اے سراجِ بزمِ ایمانی
زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی

تِرے آنے سے رونق آگئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہو گیا ، پھر فضلِ ربّانی

○

تری صورت ، تری سیرت ، ترا نقشہ ، ترا جلوہ
تبسّم ، گفتگو ، بندہ نوازی ، خندہ پیشانی
اگرچہ فقر فخری ، رتبہ ہے تیری قناعت کا
مگر قدموں تلے ہے فرِّ کسرائی و خاقانی
زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے!
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرّہ کو تابانی

○

بہزاد لکھنوی

بہزاد لکھنوی نے نعت میں کئی بھرے بھرے دیوان کہہ ڈالے ہیں ، اور کوئی شبہ نہیں ، بہزاد کے کلام میں ایک خاص قسم کی والہانہ کیفیت پائی جاتی ہے ۔ نمونہ کلام نعت یہ ہے ۔

عالم کے شہریار بنائے گئے ہیں آپ
کونین کا وقار بنائے گئے ہیں آپ
کیوں کر اُٹھے نہ سب کی نظر آپ کی طرف
ہر قلب کے قرار بنائے گئے ہیں آپ
وہ شرع کا چمن ہو کہ گلشن ہو خضر کا!
ہر رنگ کی بہار بنائے گئے ہیں آپ

○

ماہر القادری

ماہر القادری کے کلام میں اب مذہب کا رنگ زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے ، ذیل کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ اب ان کے کلام میں پہلے کے مقابلہ میں پختگی آتی جاتی ہے ، اگرچہ کہیں کہیں لغزش

ی سستی ، اور الفاظ کی نارسائی کھٹکتی ہے ، یہ اشعار شاعر کی والہانہ کیفیت کے آئینہ دار ہیں ۔
ان میں جو جذبہ جھلک رہا ہے ، اس میں خلوص بھی ہے ، اور صداقت بھی ، سوز بھی ہے اور اثر بھی شاید اس لیے بھی کہ یہ اشعار
تخیل پر انحصار بھی نہیں ہیں ، جتنے حقیقت پر ، یعنی شاعر کے منہ سے یہ بول سرزمین حجاز ہی میں نکلے ہیں :

بہارِ ادرِ حرم کی بہار کیا کہنا
نزولِ رحمت پروردگار کیا کہنا

قدم قدم پہ ہدایت روش روش پہ نجات
نقش نقش کرم بے شمار کیا کہنا :

کہ فیض ہیں کہ سب دُور ہوتی جاتی ہیں
رہ حجاز کی گرد و غبار کیا کہنا

○

جگہ جگہ پہ کھجوروں کی دل نواز قطار
شارع مہر سرشار کیا کہنا

بس اس خیال سے پاؤں نے طلب ہو جائیں
کبھی کبھی خلش نوک خار کیا کہنا

○

ہزار بار بھی دیکھیں تو جی نہیں بھرتا
مزار پاک کے نقش و نگار کیا کہنا

○

روشن صدیقی

روشن صدیقی نے اس چمن میں نوا سنجی کی ہے ، اور اپنے رنگ کے اچھے اشعار کہے ہیں :

صاحبِ تاج ختم نبوت ، صلی اللہ علیہ وسلم
صدر نشین بزم رسالت ، صلی اللہ علیہ وسلم
خلق حسن پہ کیا کیا نازاں ، جود و عطا و شفقت و احساں

آیتِ رحمٰن، معنیٔ رحمت، صلی اللہ علیہ وسلم
اس کی گلی کا ذرہ ذرہ، مہرِ درخشاں بن کر چمکا!
فرشِ قدم، افلاک کی عظمت، صلی اللہ علیہ وسلم
زاہد و عابد، عارف و عالم، سب پہ اقدس سایہ
سب پہ گل افشاں دامنِ رحمت، صلی اللہ علیہ وسلم
سلطاں اور ہمدوشِ گدایاں، مولیٰ اور شیدائے غریباں
خضرِ امم، اور جادۂ خدمت، صلی اللہ علیہ وسلم

○

نقشِ کدورت اس نے مٹایا، غیروں کو سینہ سے لگایا
سب کو دیا پیغامِ محبت، صلی اللہ علیہ وسلم
درسِ مروت فرماں اس کا، نوعِ بشر پہ احساں اس کا
امن و محبت اس کی شریعت، صلی اللہ علیہ وسلم
بغض و حسد کا نام ہوا گم، چمکا رایتِ عفو و ترحم
جاگ اٹھی انساں کی شرافت، صلی اللہ علیہ وسلم
ختم ہوا در پہ صیادی، پائی غلاموں نے آزادی!
گھر گھر پہنچا مژدۂ رحمت، صلی اللہ علیہ وسلم

○

نورِ جبینِ انساں چمکا، فرق مٹا محتاج و غنی کا
ایک ہوئے سرمایہ و محنت، صلی اللہ علیہ وسلم
دین میں فیضان ہے اس کا، ذوقِ یقیں احسان ہے اس کا
اس کے در کی خاک میں نکہت، صلی اللہ علیہ وسلم
قربِ الٰہی سنت اس کی، حسنِ عمل ہے طاعت اس کی
حاصلِ ایماں اس کی محبت، صلی اللہ علیہ وسلم

حسرت موہانی

حسرت موہانی کی شاعری بیشتر تغزل کی شاعری ہے۔ زندگی کا آخری دور مذہبیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، اس زمانہ میں انہوں نے جو کچھ کہا، وہ کم تھا لیکن جتنا کہا یہ رنگ اس میں خوب جھلکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس رنگ میں وہ رعنائی نہیں جو ان کے تغزل میں ہے:

اے شہ شاہانِ رسل، السّلام
حاضرِ دربار رہے پھر یہ غلام
بحر کی آسانی رہ چھوڑ کر!
خواہشِ آرام سے مُنہ موڑ کر
بصرہ و بغداد سے تا کاظمین
ہو کے چلا سوئے مزارِ حسین!
خوبیٔ قسمت جو ہوئی رہنما
بندۂ مولائے نجف بھی بنا!
آگے نجف سے بہ دیارِ عرب
کھینچے رہ دشت و جبل کے تعب!
پہنچے تو سب ہو گئے تسکین حضور
رنج مبدّل بہ سکون و سرور
حاصلِ حسرت یہ سفر آمدام
بیت نبی سے سوئے بیت الحرام

○

ایک اور نمونہ:

لے چلی ہے پھر آرزوئے حرم
عاشقانِ حرم کو سوئے حرم
ملتی جلتی ہے جاں نوازی میں
بوئے باغِ جناں سے بوئے حرم

دیکھ لیتے ہیں صاف اہلِ نظر!
جلوۂ حق کو روبروئے حرم
شانِ ربُّ العُلےٰ نظر آئی
چشم و دل کو زہے علوئے حرم
مُنہ دو عالم سے موڑ کر حسرتؔ!
بیٹھ رہنے کو بس ہے کوئے حرم

○

پھر آنے لگیں شہرِ محبّت کی ہوائیں
پھر پیشِ نظر ہو گئیں جنت کی فضائیں
اے قافلہ والو کہیں وُہ گنبدِ خضرا
پھر آئے نظر ہم کو کہ تم کو بھی دکھائیں
ہاتھ آئے اگر خاک ترے نقشِ قدم کی
سر پر کبھی رکھیں، کبھی آنکھوں سے لگائیں
نظارہ فروزی کی عجب شان ہے پیدا
یہ شکل و شمائل، یہ عبائیں، یہ قبائیں
کرتے ہیں عزیزانِ مدینہ کی جو خدمت!
حسرتؔ اُنہیں دیتے ہیں وہ سب دل سے دعائیں

○

نظرِ حُسن کی ہے بینائی،
آپ کی شان جلوہ فرمائی،
پھر قریب آگیا دیارِ حبیبؐ!
پھر بڑھی دل کی ناشکیبائی
پھر وہی سر، وہی ہے شوقِ سجود

پھر وہی در ، وہی جبیں سائی

○

من و سلویٰ سے بھی ہے بہتر اگر ملتا ہے
یا رسُول اللہ! ترے در پر ہمیں نانِ جویں

○

اُردو زبان کے تین نعت گو

اس باب کے شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ اُردو شعرا میں امیر، محسن اور بسیدم مداحِ رسول کی حیثیت سے ایک مرتبۂ خاص پر فائز ہیں ، دُوسرے شعرا کے مختصر ذکر کے بعد ، اب میں ، تینوں حضرات پر ، الگ الگ نسبتہً تفصیل کے ساتھ تبصرہ کروں گا ، اس لیے کہ جب تک ان کا نعتیہ کلام پیشِ نظر نہ ہو اُردو شاعری کی اس صنف کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا :

امیر مینائی

ان تینوں میں تقدم ، منشی امیر احمد امیر مینائی کو حاصل ہے ، منشی صاحب جامع الصفات شخص تھے ، سیرت اور کردار کے اعتبار سے ، ایک واجب التعظیم بزرگ ، شاعری میں اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے ، زبان ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے ، محاورات کے بادشاہ ہیں ، روزمرہ ان کے کلام کی خصوصیت ہے ، الفاظ سادہ اور سبک ، تشبیہ دل نشیں اور دل آویز بندش چست ، کلام رواں اور سلیس ، خیال بلند اور رفیع ، اُستاد کی زندگی ہی میں مرتبۂ اُستادی پر فائز ہو گئے تھے .

امیر مینائی کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ تغزل کے شاعر تھے لیکن تغزل کا رنگ بھی امیر کے ہاں کچھ چوکھا نہیں تھا ، ان کی شاعری لکھنوی طرز کی تھی ، اور وہ بابہمہ مشیخت ، رندی ، دہوسنا کی بلکہ شوخی اور عریانی تک کے مضمون باندھا کرتے تھے . لیکن یہ ان لوگوں کی رائے ہے جنہوں نے کلام امیر کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے ، شوخی اور عریانی ، رندی اور ہوسناکی کے مضامین کس شاعر کے ہاں نہیں ملتے؛ لکھنو کو چھوڑیئے ، دلی کے دبستانِ شاعری کا جائزہ لیجئے ، وہاں میر و سودا سے لے کر غالب اور مومن تک کے ہاں ، ہر شاعر کے کلام میں ضرورت سے زیادہ شوخ اور عریاں ، بلکہ غیر مہذب اور ناگفتہ بہ اشعار تک ملیں گے لیکن ان اشعار کی بنا پر ، نہ میر کی شاعری پر خطِ نسخ پھر گیا ، نہ سودا کے کمال پر حرف آیا ، نہ غالب اور مومن کا ستو

مل ہیں آیا پھر سمجھ میں نہیں آتا ، امیر مینائی غریب پر یہ نظر عنایت کیوں ہے ؟
امیر بے پناہ صلاحیتوں کے غیر معمولی شخص تھے ، انہوں نے جس میدان میں قدم رکھا ، سب سے آگے نکل گئے ، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امیر کے ہاں شوخی کی ناروا حد تک مثالیں بھی تلاش کرنے سے مل سکتی ہیں

آئینہ دکھلاتے ہو ، جو بن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

یا پھر یہ شعر اتنا مبتذل تو نہیں ، لیکن ضرورت سے زیادہ شوخ بہر حال ہے ۔

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی ؟

یہ شعر گو مبتذل اور سوقیانہ نہیں ، لیکن تیور اس کے بھی حد سے زیادہ شوخ اور بے باک ہیں :

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اُٹھا رکھا ہے

○

لیکن یہ امیر کا اصل رنگ نہیں ہے ، امیر کا اصل رنگ شوخی اور ابتذال نہیں ، کیف و اثر ہے ، سوز و گداز ہے ، درد و حسرت ہے ، محاکات اور معاملہ بندی میں بھی ، رکھ رکھاؤ اور وقار و تمکنت ہے ۔ بھلا جو شخص ایسے شعر کہہ سکتا ہے ، اس پر زبانِ طعن دراز کی جا سکتی ہے ؟

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یا رب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بے قرار ہوتا
جو نگاہ کی تھی ظالم ، تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا؟

○

طالب جب وہ کھلا تب یہ معمہ
کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم

○

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے !
اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

○

باقی ہے امیر اب تو فقط جان کا جانا
ہوش و خرد و تاب و تواں جا چکے کب کے

○

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی، تری قسمت کی پستی ہے

○

سیدھی نگاہ میں ہیں تری تیر کے خواص
ترچھی ذرا ہوئی تو ہیں شمشیر کے خواص

○

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر!
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

○

امیر نے اپنے بارے میں یہ صرف از راہِ تعلّی نہیں کہا، حقیقت ہے :

کہتا ہے شورِ حسن کے کوئی آہ، کوئی واہ
کچھ میرزا کے مجمع میں ہیں کچھ میر کے خواص

○

لیکن یہ رنگ جس نے انہیں امیرِ سخن بنایا جس نے انہیں رام پور اور حیدر آباد میں، ملک الشعرا کی مسند پر بٹھایا ان کا اصلی رنگ نہیں ہے، اصلی رنگ وہی ہے جو نعت میں جھلکتا ہے، اب ہم امیر کے نعتیہ کلام کا انتخاب اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کریں گے :

"نعت" میں فرماتے ہیں :

اے نازفروشِ بزمِ امکاں
اے حلقہ بگوشِ حکمِ یزداں
دیوانہ ہوائے شوق میں ہے
گل چاک کرے نہ کیوں گریباں
لالہ کا ہے داغ داغ سینہ،
سنبل کا ہے تار تار داماں
ہر گل ہمہ تن ہے دیدۂ شوق
گلشن ہے تمام نرگستان
قد تیرا ہوائے حسن و خوبی
پرچم ہیں جو گیسوئے پریشاں
جانِ دو جہاں فدا ہے تجھ پر
قرباں ہیں ملک نثار انساں

○

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر کرتے ہیں :

زہے رحمت کہ ختم انبیاء کی آمد آمد ہے
حبیب خاص محبوب خدا کی آمد آمد ہے
ملائک مژدہ دیتے ہیں، گنہگاران امت کو
کہ خوش ہو، شافع روز جزا کی آمد آمد ہے

زورِ کلام اور اندازِ بیان کی رعنائی دیکھئے !

بہار آئے گی، گل پھولیں گے، بلبل چہچہائیں گے
چمن میں دھوم ہے، بادِ صبا کی آمد آمد ہے!

○

زمیں پر آسماں سے متصل ہے نور کی بارش :
جہاں روشن ہے نور کبریا کی آمد آمد ہے

الفاظ کا خروش، جذبات کا جوش اور بیان کی روانی، ملاحظہ ہو:

یہ مہر و مہ ہیں جس کے فرشِ پا انداز کے ٹکڑے!
اسی شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ کی آمد آمد ہے
ستم پامال ہوگا دورِ عدل و داد آتا ہے
جفا جاتی ہے دنیا سے وفا کی آمد آمد ہے
ادب آواز دیتا ہے سنبھل بیٹھو، سنبھل بیٹھو
کہ فخر اولیاء اور انبیاء کی آمد آمد ہے

○

ولادت باسعادت کے ذکر کے بعد اب "مسدس" پر زباں کھلتی ہے:

گردوں خبر یہ محفلِ میلادِ شاہ ہے
یاں آمد جناب رسالت پناہ ہے
امت چلے رسول کی یہ جلوہ گاہ ہے!
سیدھی یہی بہشت میں جانے کی راہ ہے

دربار عام گرم ہوا اشتہار دو!
جن و ملک سلام کو آئیں پکار دو

آتا جو آنے والوں کو پاتے ہیں جبرائیلؑ
خود جا کے در تلک انہیں لاتے ہیں جبرائیلؑ
رتبہ بہ رتبہ سب کو بٹھاتے ہیں جبرائیلؑ
موقعے سے کیا صفوں کو جماتے ہیں جبرائیلؑ

دربار عام گرم ہوا اشتہار دو
جن و ملک سلام کو آئیں پکار دو

لو آمد حبیب خدائے قدیر ہے!
آتا ہے آج وہ جو بشیر و نذیر ہے!

آتا ہے وہ جو صاحبِ تاج و سریر ہے
رونق فزا ہے خلق کا جو دست گیر ہے
دربارِ عام گرم ہوا اشتہار دو
جن و ملک سلام کو آئیں پکار دو

○

"معراج" پر بہت سے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے، اور طبع رواں کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں، لیکن امیر نے اس موضوع پر جو کچھ کہا ہے، اس کی شان منفرد ہے:

کس کے آنے کی فلک پہ ہے خبر آج کی رات !
آنکھ سورج سے ملاتا ہے قمر آج کی رات !

○

شبِ معراج ہے جس جا بھی ہوں خوش ہوں مومن
ساری امّت پہ ہے رحمت کی نظر آج کی رات
کہکشاں کہتی ہے، قسمت کا ستارہ چمکا،
ہوگا اس راہ سے حضرتؐ کا گذر آج کی رات
حوریں فردوس سے نکلی ہیں، نچھاور کرنے
سر پہ رکھے طبقِ لعل و گہر آج کی رات!
رد نہ ہوگا کسی محتاج کا تا صبح سوال!
خود ہے مشتاقِ دعاؤں کا اثر آج کی رات
شوق پابوسی میں ہیں آپ سے باہر دونوں
دل نہ بس میں ہے نہ قابو میں جگر آج کی رات
ذکر اس ماہِ نبوت کا یہاں ہوتا ہے!
گھر ہے میرا صفتِ برجِ قمر آج کی رات
روشنی پھیلی ہے خورشیدِ رسالت کی امیرؔ
میرے گھر شام سے مہماں ہے سحر آج کی رات

معراج کے ذکر میں امیر کا خامۂ سحر آفریں واقعی نئی نئی بہاریں پیدا کرتا ہے ——— ایک منظر معراج کا اور دیکھئے :

غل ہے معراج کی شب شاہِ اُمم آتے ہیں،
مالک عرش و لوح و قلم آتے ہیں

○

آپ بالائے براق آتے ہیں اور روح امیں
بوسے دیتے ہوئے بالائے قدم آتے ہیں
حوریں یوں ساتھ سواری کے ہیں خوش خوش جیسی
شوخیاں کرتے غزالانِ حرم آتے ہیں

○

معراج ہی کا ایک منظر اور :

شبِ معراج ہے مہمان رسول اللہ آتے ہیں
چلیں حوریں بڑھیں غلماں، رسول اللہ آتے ہیں

○

کھلے جاتے ہیں غنچے سبزہ کیا کیا لہلہاتا ہے
گلِ فردوس ہیں خنداں رسول اللہ آتے ہیں
فدا ہونے کو ہے تیار سارا عالمِ بالا!
ملک صدقے فلک قرباں رسول اللہ آتے ہیں

○

سرورِ کائنات کا سراپا، مداحِ رسولؐ امیر کی زبان سے :

خوبانِ عالم کی تجھے خالق نے دی ہے سروری
گالوں پہ صدقے حوریں، بالوں پہ صدقے ہے پری

○

اے کلکِ صورت آفریں ، صد آفریں صد آفریں
اس بانکپن اس نوک کی دیکھی نہیں صورت گری !

جن و بشر تسخیر ہیں ، سب صورتِ تصویر ہیں ،
مازاغ کے سرمے سے ہیں آنکھیں تری شوخی بھری

حسن خداداد آپ کا ، ہر حسن پر بالا ہُوا !
قرباں ہیں شمس و قمر ، صدقے ہیں زہرہ مشتری

○

معراج میں سب انبیاء تھے مقتدی تو مقتدا
اے شاہِ دیں اس شان کی کس کو ملی پیغمبری

○

اللہ رے شانِ مصطفےٰ ، مجرے کو تھراتا ہُوا
ہر صبح روضے کی طرف ، آتا ہے مہرِ خاوری

○

مدحِ رسولِ دیار رسولؐ کا ذکر کرتا ہے اسکی کس کیف و جوشش کے ساتھ :

صحرائے ختن ہے ، مجھے صحرائے مدینہ
ہے نافۂ مشکیں مجھے مشکوئے محمد

سینے سے لگاؤں میں امیر ، آنکھوں پہ رکھوں
ہیں پھول مجھے خار و خس کوئے محمد

○

جب مدینہ کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں

○

تن سے نکلے گی مرے جس دم امیر
رُوح جائے گی مدینہ کی طرف !

شوقِ محبوب الٰہی میں نہیں صبر کی تاب ،
لے چل اے جذبۂ دل جلد مدینہ کی طرف

O

یہ ذوق و شوق دیکھیے :

جس روز مدینہ کی طرف گھر سے چلیں گے!
آنکھوں سے رواں ہوں گے کبھی سر سے چلیں گے
وہ ہم نہیں ، رک جائیں جو دیکھے صعوبت گرو!
بڑھتے ہوئے لڑتے ہوئے صرصر سے چلیں گے

O

اللہ اللہ ، مدینہ جو قریب آتا ہے
خود بخود سر پئے تسلیم جھکا جاتا ہے!

O

واہ رے شوق جب آتا ہے زیارت کا خیال
دل تڑپ کر مرے پہلو سے نکل جاتا ہے
ہند سے کوئی کہیں جائے ، یہی کہتا ہوں
کہ مسافر یہ مدینہ کی طرف جاتا ہے
میں کہوں روضۂ پر نور ابھی کتنی دور
ساتھ والے کہیں اب آتا ہے اب آتا ہے

O

یہ والہانہ کیفیت ملاحظہ ہو :

نہ دولت کی تمنا ہے نہ حشمت کی ہوس مجھ کو
الٰہی عشق احمد کا ، الٰہی عشق احمد کا

O

زیارت کر چکوں میں جب پڑھے یہ غزل مدینہ میں
غلام آیا محمدؐ کا ، غلام آیا محمدؐ کا

○

شاعر خود اپنا بیان کرتا ہے :

مدح خوانوں میں سوا آواز نہیں ہے تو نہ ہو
سوز حاصل ہے مجھے ، ساز نہیں ہے تو نہ ہو
ہے مے عشقِ محمدؐ سے مرا دل مخمور !
جام میں بادۂ شیراز نہیں ہے تو نہ ہو !
آشیانہ ہے مدینہ کے درختوں پہ مرا
اب اگر طاقتِ پرواز نہیں ہے تو نہ ہو
دور سے دیکھ لیا کرتے ہیں حضرتؐ کا جمال
پاس اگر جلوہ گہِ ناز یقیں ہے تو نہ ہو!

○

یہی بیان دوسرے اسلوب سے :

جنت ہے درِ خسروِ ذی شاں مرے آگے
کہہ دو کہ نہ لے دوں کی رضوان مرے آگے
پہنچا ہوں جو اس در پہ تو پائی ہے یہ شوکت
دارا کو نہیں رتبۂ درباں مرے آگے
شاہی ہے مجھے کوچہ حضرتؐ کی گدائی
کیا مال ہے گنجینۂ سلطاں مرے آگے

○

فیضِ شہِ والا نے وہ بخشی ہے قناعت
ہیں کاسۂ کیف قیصر و خاقاں مرے آگے

وہ سیر طبیعت ہوں کہ پتھر سے ہیں کمتر
دُرِ عدن و لعلِ بدخشاں مرے آگے

○

لحد میں ہم کو سزا ئے گناہ کیا ہو گی ؟
وہ ناخدا ہے تو کشتی تباہ کیا ہو گی ؟
کھلی جو آنکھ ہماری ، وہ سرو قد دیکھا !
بھلا اس سے زیادہ نگاہ کیا ہو گی !؟
ہوا نہ فائز دیدار اگر یہ پیر فلک
تو پھر یہ عینکِ خورشید و ماہ کیا ہو گی ؟

○

صبائے شک آتی ادھر ہی سے تو ہے
کہ تجھ میں مدینہ کے پھولوں کی بو ہے
سنیں ہم نے طوطی و بلبل کی باتیں
ترا تذکرہ ہے ، تری گفتگو ہے
جیوں تیرے در پر مروں تیرے در پر
یہی میری حسرت ، یہی آرزو ہے

○

یہ حسرت ، اور یہ آرزو ، صرف شاعر کی نہیں ، ہر مسلمان کی ہے :
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

فرماتے ہیں :-

○

یا خدا جسم میں جب تک کہ مری جان رہے
تجھ پہ صدقے ترے محبوب پہ قربان رہے

دل وہی دل ہے کہ جس دل میں ترا دھیان رہے
جان وہ جان ہے جس میں ترا ارمان رہے
کچھ ہے یا نہ رہے، پر یہ دعا ہے کہ امیرؔ
نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے

○

کیا عدم میں بھی مدینہ ہے کوئی
جو وہاں جاتا ہے، پھر آتا نہیں

○

یاد جب مجھ کو مدینہ کی فضا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے

○

امیر مینائی کا ذکر ختم کرنے سے پہلے، ایک خاص واقعہ کا ذکر ضروری ہے امیر مینائی نواب کلب علی خاں والئ رام پور کے دربار سے وابستہ تھے، ایک مرتبہ نواب صاحب نے امیر کے سامنے محسن کے کسی قصیدے کی تعریف کی اور فرمایا:

"ایسا قصیدہ بھلا کوئی کیا کہہ پائے گا!"

امیر کو یہ بات ناگوار گذری، انہوں نے جوابی طور پر ایک قصیدہ کہا جس میں تعلّی بھی ہے لیکن نہایت، بے باک اور تند، اور لطف یہ ہے کہ یہ قصیدہ نواب صاحب کے سامنے پیش کر کے انہیں شرمندہ بھی کیا پورا قصیدہ تو یہاں درج نہیں کیا جا سکتا، چند اشعار پیش خدمت ہیں:

○

کیوں کرنہ کروں ملک معانی کو میں تسخیر!
خامہ ہے، مرا دست یداللہ کی شمشیر!

○

کسے جو تعلّی پہ مری ہمت عالی!

دشوار نہیں قلعۂ افلاک کی تسخیر
سرکش مری زمیں سے کبھی بڑھ نہیں سکتے
لہر آب کی شعلے کے لیے بنتی ہے زنجیر

O

دل صاف، زباں صاف، سخن صاف ہے میرا
موتی کی لڑی ہے کہ مسلسل مری تقریر
طائر اُتر آتے ہیں، ٹھہر جاتی ہیں لہریں!
داؤد صفت ہے یہ مرے لحن میں تاثیر
عکس آئینہ میں میرے اشارے سے ہے گویا
لب میرے جو ہلتے ہیں تو بول اٹھتی ہے تصویر

O

جو صاحب معنیٰ تو معانی مرے سمجھے!
جو صاحب توقیر تو جانے مری توقیر
جو بات مرے منہ سے نکل جاتے وہی ہو
گویا ہوں زبانِ قلم کاتب تقدیر!

O

کہتا ہوں وہ سنتا ہوں جو اُستادِ ازل سے
ہوں صورتِ طوطی پس آئینۂ تقدیر
تھے قبضۂ خسرو میں معانی کے جو کشور
سب میں نے کئے تیغ زباں کھینچ کے تسخیر!

O

تعلی کا رنگ اور جوش ملاحظہ ہو:

جب مصحفی و میر پئے تہنیت آئے

تھوڑی سی زمیں دی انہیں اس ملک میں جاگیر
بے چارہ جو کس کیا ہے کہے گا جو قصیدہ
ایسے تو بہت ہیں مرے گلشن کے حصافیر
البتہ مقابل ہیں مرے عرفی و نیضی!
پر فرق ہے اتنا ہیں جواں طبع ہوں وہ پیر
لطف سخن تازہ کہاں ان کے سخن میں
کہنہ ہوں ادائیں، تو بدل جاتی ہے تاثیر

○

اپنے متعلق کہتے ہیں اور بالکل صحیح و درست فرماتے ہیں :

سو طرح کا بخشا ہے مجھے علم خدا نے
قرآن مرا دل ہے تو سینہ مرا تفسیر!
میدان سخن جیت لیے میں نے ہزاروں
باندھے ہے توی، جھولتی ہے عرش پہ تقدیر

اب گریز کا رنگ و اسلوب بدیع خاص طور پر داد طلب ہے :

یہ عزو شرف اس کی غلامی سے ہے حاصل
جو صاحب قنبر ہے، وہ لاکھوں کی ہے اکسیر

○

محسن کاکوروی

محسن کاکوروی بھی اپنے رنگ میں یگانہ او رفرد ہیں، انہوں نے دوسرے اصناف سخن کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، صرف نعت پیمبر کو اپنا شعار بنایا، ان کی شہرت عظمت کی، بنا صرف مدحت رسول ہے اور کوئی شبہ نہیں، اس صنف میں انہوں نے قابل قدر اضافے کیے، نئی نئی تشبیہیں دیں، نئے نئے خیالات دیے، نئے نئے اسلوب دیتے، نئی نئی ترکیبیں دیں، محسن کے کلام پر کئی پہلوؤں سے گفتگو کی جاسکتی ہے، ان کی جدت فن، شکوہ الفاظ، جوش بیان، ارادت و عقیدت، یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ ایک مفصل جائزے کی طالب ہیں

لیکن ان اوراق میں، ان عنوانات پر گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ مختصراً ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ محسن اپنے زمانہ کی ڈگر سے آگے بڑھے، انہوں نے جدت اور ندرت پیدا کی، مگر فن کو نہ بدل سکے، لیکن انہوں نے جو کچھ کہا، اور کیا، وہ بہر حال ہے قابل قدر!

محسن کا نعتیہ کلام، اور یہی ان کا سارا سرمایہ ہے بہت سے اشعار پر مشتمل ہے، اس کا خلاصہ کرنا بھی کارے دارد کا مصداق ہے، لیکن اس سے قطع نظر بھی نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا ذیل میں زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ کلامِ محسن کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے،

خود اپنی نعت خواں حیثیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

لامکاں تک لیے جاتی ہے مجھے طبع رسا
ہو رہا ہے صعبِ ازواج میں میرا چرچا

○

بڑھ گیا عرش کے پایہ سے سخن کا پایہ!
نغمۂ مقدم کی چلی آتی ہے بر سول سے صدا
بزم قدسی کا بلایا ہوا، مہماں ہوں میں
ملک آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں وہ انساں ہوں میں

○

صورت رسول ؐ کا ذکر کرتے ہیں، اور کس والہانہ انداز میں کرتے ہیں:

کیسی تصویر کہ ہے صبح بہار امکاں •
کیسی تصویر کہ ہے کلک مصور نازاں
کیسی تصویر کہ ہیں لوح و قلم نور افشاں
کیسی تصویر کہ ہے آئینہ پرداز جہاں
کیسی تصویر کہ سب صلِّ علیٰ کہتے ہیں!
کیسی تصویر کہ سب جل و علیٰ کہتے ہیں!

○

اب ذرا تشبیہ کی ندرت، تمثیل کی جدّت اور فکر و خیال کی رعنائی ملاحظہ ہو :

کیسی تصویر ہے کھینچ کے نقاشِ ازل
خود لگا کہنے کہ ہر وصف میں تو ہے افضل
تیری تصویر سے یہ معنی کھلے بتلِ و دل
انبیاء شروحِ مفصل ہیں، تو متنِ مجمل
تو ہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں نبی
تو ہے شمسیّہ تو تقویم ہیں تو سب ہیں قطبی

اب سراپا کا بیان آتا ہے، اور شاعر اپنی طبعِ رواں کی جولانی دکھاتا ہے :

آنکھ کی تعریف :

چشمِ محبوبِ خدا نور کا اک پتلہ ہے!
سایۂ حق وہ شہ منزلتِ طٰہٰ ہے
اس کے قامت کو بھلا سایہ مناسب کیا ہے
سچ ہے محبوب جو لاثانی ہے وہ یکتا ہے
لاکھ عاشق ہوں مگر خوب وہ محبوب نہیں
ظلِ حق ہو تو ہو پر ظل بنی خوب نہیں

ابرو کی تعریف :

ہیں دو ابروئے سیہ زیبِ جبیں احمد
طاق پر خانۂ خورشید کے کرتے ہیں نظر
نقشہ ابرو کا جو دکھلائے معمار دگر
دا ہو مریخ کے تیغے سے سر نوک کٹ کر

آنکھ کی تعریف :

ایسی نرگس کہیں دیکھی ہے نہ بادام سیاہ
چشم بد دور عجیب آنکھ ہے ماشاءاللہ

کان کی تعریف : گوش پُر نور تہِ زلف شبِ آسا مستور
کہیں دھوکے سے بھی دیکھے تو سحر ہو کافور

بینی کی تعریف :

بینیِ اقدس شاہنشہ عالی منظر
آبِ آئینہ رخسار کی موجِ انور
سخۂ خدِ مبارک پہ الف بینی ہے
دیکھنا عارضِ انور کا تو ابینی ہے
شاخ اس نخل کی ابروئے جنابِ اطہر
اور اس شاخ میں جبینِ مبارک ہیں ثمر

سایہ نبیؐ کا ذکر :

روبرو جلوۂ خورشید کا سایہ کیا ہے
سامنے شمع منور کے اندھیرا کیا ہے
عاقلو غور سے دیکھو کہ یہ نکتہ کیا ہے
اُمّی ہونے میں بھلا آپ کو شبہ کیا ہے
کوئی تدبیر تو پڑھنے کی بجا ہی نہ رہی
نورِ رخسار سے حرفوں میں سیاہی نہ رہی

ہونٹ کی تعریف :

لب جاں بخش کی تشبیہ دمِ عیسیٰ سے
دی نہ دم دیتے رہے گرچہ مسیحا بھی مجھے
آبِ حیواں نہ کہا خضر نے گو چھینٹے دیتے
اب نقط رہ گئے خورشید کے جھوٹے رشتے

دہن کی توصیف :

اے سخنداں، کیہ اسرارِ دہن کس نے بیاں؟
مل گیا خاک میں جو چشمۂ آبِ حیواں !
پہنچے ہیں حلقۂ گوہر کے جگر تک دندان
درجِ یاقوت میں ہے آتشِ حسرت کا دھواں
رنگِ غنچہ کا اڑا، گل کی تعلّی چھوٹی
منہ پہ پستہ کے ہوائی یہ ہوائی چھوٹی

ہاتھ کی تعریف :

دستِ رنگیں کی صنعت بارِ خدا یا کیا ہے
شاخیں نکلیں جو کہوں، شاخِ گل رعنا ہے
طوطیِ ناطقہ اس باغ میں چپ رہتا ہے
بلبلِ طبع کو پنجے کی طرح سکتا ہے !
ہاتھ باندھے ہوئے جبرئیل کھڑے رہتے ہیں
دستِ گلچیں کو یہاں دستۂ گل کہتے ہیں

پاؤں کا ذکر :

سرِ عالم ہے فدائے قدمِ پاک نسبی

وصف میں جس کے سخنددانوں کا گھٹنے لگا جی
ہاتھ آیا ہے جو کاغذ، تو یہ حیرت ہے نئی
نہیں چلتا ہے لگی پاتے قدم میں مہندی

ولادت باسعادت کا ذکر:

ظلمت کا چراغ بے ضیا ہے
انجم کا ستارہ ڈوبتا ہے

مہتاب کی چاندنی ڈھلی ہے
مریخ کی سست مشتری ہے

روپوشں وبیہر چرخ اخضر
ظلمت کا سیاہ بہہ کرکے ابتر

اہل مدکہکشاں ہے معذور
پروانہ نویس شمع کافور

زہرہ کا سفید ہو گیا رنگ
نظم پروین کا قافیہ تنگ!

سبزہ ہے کنارہ آب جو پر
یا خضر ہے مستعد وضو پر!

اک شاخ رکوع میں رُکی ہے
اور دُوسری سجدہ میں جھکی ہے!

یہ شعر دیکھیے کس غضب کا ہے؟:

کیا رہی ہر اک اعتکاف میں ہے
اور آب رواں طواف میں ہے

جلوۂ ظہور :

باشان و شکوہ جلوہ فرما
شاہنشہ تخت گاہِ اِلّا!
سامانِ ظہور کی ہے تمہید
قدرت پہ ہو رہی ہے تاکید
موسم نے حباب کو عطا کی
آبِ حیواں کی مینہ گری

جان و دلِ مرسلیں محمد
رُوحِ رُوح الامیں محمد
پیدا ہوئے خاتم النبیین
مظہرِ عرفانِ عزّ و تمکیں
گنجینۂ اصطفا محمد
آئینۂ حق نما محمد

نازل ہے زمیں پہ کبریائی
بندے کے لباس میں خدائی
اُس وقت دیار میں عرب کے
مطلع سے تجلّیاتِ ربّ کے
برجِ شرفِ قریشیاں میں
اور ہاشمیوں کے خاندان میں
کعبہ کی زمیں نامور ہے
اور عبدِ مطلّب کے گھر سے

اسلام کا آفتاب چمکا
بے پردہ و بے نقاب چمکا
پیدا ہوئے سرورِ دو عالمؐ
پیدا ہوئے فخرِ نوحؑ و آدمؑ
شاہنشہِ اصفیا محمدؐ!
تاجِ سرِ انبیا محمدؐ

نیا رنگ، نیا انداز، نئی گل افشانی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں

مری باریک بینی یا کمر کا تیری مضموں ہے
مری رنگیں بیانی یا ترا رخسار گلگوں ہے
مری سحر آفرینی یا تری آنکھوں کا افسوں ہے
مری طبع رواں ہے یا تری رفتار موزوں ہے
مرا مصرع ہے یا سیدھا سا مضموں ہے ترے قد کا

صنائع لفظی کے کمالات دیکھئے :

مخمس تیری پانچوں انگلیوں کا ایک خاکہ ہے
رُباعی چار ابرو کا مقرر سادہ نقشہ ہے
جو رنگیں قطعہ ہے یاقوت، لب کا ایک ٹکڑا ہے
تری زلفِ رسا کا شعر اک ادنیٰ سا لٹکا ہے
(کرشمہ ہے غزال تیری غزال چشم اسود کا)

بہت اونچے گئے موسیٰؑ تو کوہ طور تک پہنچے
بہت چلا کیا عیسیٰؑ نے کھینچے چرخ پر پہنچے

نشانے دونوں تھے اس کے نشانے سے کہیں پہنچے
بری ہو ہوگیا قدرِ کماں دارِ نبوت سے
(مقامِ قابِ قوسین اکثر ادنیٰ ہے مقصد کا)

جوشِ عقیدت کی انتہا:

مدینے کی طرف جاتیں کہ ہم کعبہ کا ایں رستہ
نظر آتا ہے ان دونوں گھروں میں ایک ہی جلوہ
کہاں اب جبہ سائی کیجئے کچھ بن نہیں پڑتا
احد کو کیجئے یا احمد بے میم کو سجدہ
(عجب مشکل ہے مضموں ہے مفہوم مقید کا)

روضۂ مبارک کا ذکر:

زمینِ روضۂ انور فلک سے ہے کہیں افضل
ہوا ہر روزنِ دیوار چشم حور ہر اوّل
غبار در سے ہے آئینۂ خورشید کو صیقل
جبینِ عرش ایزد پر ہے خاکِ آستاں صندل
ہر اک ذرہ ستارہ ہے کلاہ فرق فرقد کا

بلندی میں وہاں یہ روضۂ رحمت نشاں پہنچا
جہاں اُڑ کر نہ شہبازِ خیالِ قدسیاں پہنچا
جبیں عرش سے آگے وہ سنگِ آستاں پہنچا
زمیں تا آسماں پہنچی مکاں تا لامکاں پہنچا
کہاں تک اُوج کھینچے اس کی خاکِ پاک مرقد کا

ہمت پر زور تھا ہر چند خامہ دستِ قدرت کا
نہ تھا آسان لیکن کھینچنا محبوب کا نقشہ
پس صد خود و اثبات ایک مدت میں کھینچا خاکہ
مٹا ڈالیں بنا کر صورتیں آدم سے تا عیسےٰ
تب آیا راست نقشہ کلک قدرت سے ترے قدا

اب ذرا تعلّی کا رنگ بھی ملاحظہ کیجئے :

اٹھا لینا ہمت دشوار ہے میرا چلن محسن
ٹھہر سکتے نہیں آگے میرے اربابِ فن محسن
جلا دیتا ہوں میں دم بھر میں سارا بانکپن محسن
مقابل مجھ سے ہو کیا مردِ میدانِ سخن محسن
کہ جوہر ہے مری تیغِ زباں میں وصف اعجاز کا

زبان تیز کے جوہر، زباں داں ہو تو پہچانے
ولایت میں بعض کہیں صاف اس تیغ صفاہانے
گرے کٹ کٹ کے دستِ فکر سے ترکوں کے تیغ
کیا شیراز کو پامال اردوئے محسنؔ نے
گیا مان اصفہاں لوہا مری تیغ مہب

قصیدہ لکھ رہا ہوں نعت میں اعجاز سے روشن
سوادِ ہر قلم ہے دردِ شمعِ طور کا مخزن
قلمدان جیب کردہ طور وستہ طور کا دامن
عصائے موسوی خامہ ، ورق ہے وادیٔ ایمن

ید بیضا کو داغ رشک رہتا ہے مرے قد کا

○

اب آخر میں ہم مدح ختم المرسلین کے سلسلہ میں محسن کے اس قصیدے کے چند اشعار پیش کرتے ہیں، جو ان کے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی :

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل، منگل
شاہدِ کفر ہے کھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ
چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل
ابر بھی چل نہیں سکتا، وہ اندھیرا گھُپ ہے
برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

○

اس اندھیرے کے بعد اب اُجالا ہوتا ہے، اور ایسا اُجالا کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں :

تار بارانِ مسلسل ہے ملائک کا درود
پئے تسبیح خداوندِ جہاں عزوجل
کہیں طوبیٰ، کہیں کوثر، کہیں فردوس بریں
کہیں بہتی ہوئی نہرِ لبن و نہرِ عسل
کہیں رضواں کا، کہیں ساقیٔ کوثر کا عمل

کنزِ مخفی کے کبھی سمت نہاں تہ خانے
اک طرف مظہرِ قدرت کے عیاں شیش محل

○

اب اصل موضوع پر آتے ہیں:

گلِ خوش رنگِ رسُولِ مدنی و عربی
زیبِ دامانِ ابد، طرۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے، نہ ہمسر، نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل، نہ مقابل، نہ بدل!
اوجِ رفعت کا قمر، نخلِ دو عالم کا ثمر
بحرِ وحدت کا گہر، چشمۂ کثرت کا کنول

○

مرجعِ رُوحِ امیں، زیبِ دہِ عرشِ بریں
حامیِ دینِ متیں، ناسخِ ادیانِ ملل

○

جی میں آتا ہے لکھوں مطلعِ برجستہ اگر!
وجد میں آئے قلم، ہاتھ سے جائے نہ اچھل
سُرخیِ نسخۂ وحدت سے یہی روزِ ازل
کہ نہ احمد کا ہے آخر نہ احد کا اوّل

○

افضلیت پہ تری مشتمل آثارِ کتب
اوّلیت پہ تری متفق ادیان و ملل،

○

بحث جاہ میں اعلےٰ کے ہیں معنیٰ ادنیٰ

مصرعِ جوہر میں اکثر کا مرادف ہے اقل

○

جس طرف ہاتھ بڑھیں کفر کے ہٹ جائیں قدم
جس جگہ پاؤں رکھیں سجدہ کریں لات و ہبل
تری تشبیہ کا ہے آئینہ خانۂ تنزیہہ
شانِ بے رنگی مطلق ہے ترا رنگ محل،
ہو سکا ہے کہیں محبوبِ خدا، غیرِ خدا
اک ذرا دیکھ سمجھ کر مری چشمِ احول
نظر آئے اگر آئینہ میں مجھے میمِ دوئی
روزِ محشر ہوں الٰہی مری آنکھیں احول

○

اسی زمین، اسی بحر و قافیہ اور ردیف میں چند شعر اور :

چھوڑ کر بت کدۂ ہند و صنم خانۂ برج[1]
آج کعبہ پہ چھائے ہے مصلّے بادل
سبزہ چرخ کو اندھیاری لگا کر لایا،
شہسوارِ عربی کے لیے کالا بادل

○

رشک سے شعلۂ رخسار کے روتی ہے برق
برق کے منہ پہ ہے رکھتے ہوئے پلّا بادل

○

اب اوصافِ تیغ کا ذکر کرتے ہیں :

تیغ   میدانِ شجاعت میں چمکتی بجلی!

---

[1] اشارہ ہے متھرا کی طرف جو ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے :

ہاتھ ـــ گلزارِ سخاوت میں برستا بادل
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
میرے ایمانِ مفصّل کا یہی ہے مجمل
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی!
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ نہ غزل
دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہو بھروسہ، تیری قوت، ترا بل
ہو میرا ریشۂ امید وہ نخلِ سرسبز
جس کی ہر شاخ میں ہو پھول، ہر اک پھول میں پھل
آرزو ہے کہ ترا دھیان رہے تا دمِ مرگ
شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل
رُوح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل
کہ مری جان مدینہ کو جو چلتی ہے تو چل
دمِ مردن پہ اشارہ ہو شفاعت کا تری
فکرِ فردا نہ تو کر دیکھ لیا جائے گا کل
یادِ آئینۂ رخسار سے حیرت ہو مجھے
گوشۂ قبر نظر آئے مجھے شیش محل

میزبان بن کے نکیرین کہیں گھر ہے ترا!
نہ اٹھانا کوئی تکلیف، نہ ہونا بے کل

رُخِ انور کا ترے دھیان رہے بعدِ فنا
میرے ہمراہ چلے راہِ عدم میں مشعل

صنائع لفظی کا کمال :

حذف ہوں میرے گناہانِ ثقیل اور خفیف
آئیں میزاں میں جب افعالِ صحیح و معتل

یہ تمنا :

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو الیاسؑ مداح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ ، یہ غزل
کہیں جبریلؑ اشارہ سے کہ ہاں بسم اللہ
سمتِ کاشی چلا جانب متھرا بادل

یہ ہیں حضرت محسن کاکوروی ، اپنے رنگ میں فرد ، اپنی شان میں یکتا ، اپنے انداز و اسلوب میں یگانہ اُردو زبان جب تک زندہ ہے محسن کے نعتیہ اشعار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ، !

بیدم شاہ وارثی

بیدم شاہ وارثی ، حضرت حاجی وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مریدان با صفا میں تھے ، دنیا سے دور ، اہلِ دُنیا سے نفور ، عشقِ مرشد میں چور ، حُبِ رسولؐ میں محو محبِ باہمہ اور بے ہمہ شخصیت تھی ، سرتاپا عشق ، یکسر التہاب ، زنرق تا بہ قدم احوال وارلوت ، نہ خاندان سے تعلق ، نہ احباب سے کام ، نہ اغیار سے واسطہ ، بس مرشد کی یاد اور رسولؐ سے فریاد !

یہ وہ کیفیت تھی جس نے بیدم کو بیدم بنایا تھا ، وہ صحیح معنی میں شہیدِ جستجو تھے ، عشق میں مست ، محبت میں غرق ، نہ کھانے کا ہوش ، نہ پینے کی پروا ، نہ لباس کی فکر ، نہ راحت و آسائش کا خیال ، دن ہو یا رات ، مجمع ہو یا تنہائی ، سفر ہو یا حضر ، گھر ہو یا در ، کوئی جگہ ہو ، کوئی حال ہو ، کوئی مقام ہو ، وہ اپنی دھن میں مست اپنی فکر میں کھوئے ہوئے ، وہ بے دم بھی تھے ، بے خود بھی ، اور بے پروا بھی ، نہ جانے کیا کچھ لکھا ، کتنا کچھ لکھا مگر اس کی حفاظت کون کرتا ؟ کہا ، پڑھا ، سنایا اور پھر نئی فکر میں لگ گئے ، بیدم نے شاعری کی طرف توجہ نہیں کی ، شاعری نے ان کا دامن پکڑ لیا اور پھر نہیں چھوڑا ، وہ فکرِ شعر میں مستغرق نہیں رہتے تھے ، فکرِ شعر ان کا احاطہ کئے ،

رہتی تھی، وہ تو مست اور سرمست تھے، نہ الفاظ سے کھیلنا جانتے تھے، نہ خیال کا طلسم باندھنا وہی کہتے تھے جو دل میں آتا تھا جو دل میں آتا تھا، وہی زبان پر جاری ہو جاتا تھا:

تکلّف، تصنع، بناوٹ، نمائش اور رکھ رکھاؤ میں وہ بات نہیں ہوتی، جو بے ساختگی میں ہوتی ہے شاندار لباس میں وہ بات کہاں ہو جاتی جو سادہ میں ہوتی ہے۔ الفاظ سے کھیلنے والے اور الفاظ کا طلسم باندھنے والے ادیبوں کے کلام میں وہ روانی، اور سلاست کہاں، جو سیدھی سادھی، صاف اور رواں عبارت میں ہوتی ہے، پُرشکوہ الفاظ کو اسیرِ تخیل کر کے شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھنے والے شاعر وہ سوز، وہ کیفیت اور وہ سحر کہاں سے لائیں گے جو سہل ممتنع میں ہوتا ہے؟

بیدؔم میں اور دُوسرے نعت گو شعرا میں یہی فرق ہے، وہ تکلف تھے، یہ سادگی، وُہ اقلیم الفاظ کے شہر یار تھے، یہ کشورِ معنی کے تاجدار، وہ فن تھے، یہ بے ساختگی، وہ سوچتے تھے، تب شعر کہتے تھے، ان کی زبان پر گفتگو کی طرح شعر جاری ہو جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جو اثر اور کیفیت بیدؔم کے اشعار میں پائی جاتی ہے وہ ان کے معاصرین اور ہم قلم و ہم وزبان حضرات میں نظر نہیں آتی، اور یہی وجہ ہے کہ بیدم کے کلام میں جو زندگی تڑپتی نظر آتی ہے، اس کا جلوہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتا:

کتنی ہی عرق ریزی، دیدہ کاوی اور احتیاط کے ساتھ کلام بیدؔم کا انتخاب کیا جائے لیکن وہ ان پر ظلم ہوگا، کس شعر کو لیجئے اور کسے چھوڑ دیجئے؟ یہ ایسا ٹیڑھا سوال ہے، جس کا جواب آسان نہیں، قوتِ فیصلہ درماندہ ہو جاتی ہے، اور قوتِ انتخاب عاجز ــــــــ: پھر بھی یہ کام کرنا ہے، خواہ قلم بار بار کیوں نہ رُکے خواہ طبیعت کتنی ہی ہچکچاتے:

ذیل کے اشعار ہیں، جذبۂ دل کی بے ساختگی، الفاظ کی روانی اور کلام کی رعنائی دیکھئے اور سر دھنیئے یہ فن نہیں ہے، واردات ہیں، وارداتِ دل

آئی نسیم کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کھینچنے لگا دل سوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کعبہ ہمارا کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
مصحفِ ایماں روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

لے کے مرادِ دل آئیں گے ، مر جائیں گے مٹ جائیں گے
پہنچیں تو ہم تا کُوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
طیبہ کی جانب تکنے والو آنکھیں کھولو ہوش سنبھالو
دیکھو فدا دل جوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
نام اسی کا بابِ کرم ہے ، دیکھو یہی محرابِ حرم ہے
دیکھو خمِ ابروئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بھینی بھینی خوشبو مہکی ، بیدم دل کی دُنیا مہکی
کھل گئے جب گیسوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

یہ اشعار بھی کیف واثر کی ایک دُنیا اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں :

عدم سے لائی ہے ہستی میں آرزوئے رسولؐ
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے جستجوئے رسولؐ
خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزوئے رسولؐ
خوشا وہ آنکھ جو ہو محوِ حسنِ روئے رسولؐ

عجب تماشا ہو میدانِ حشر میں بیدم
کہ سب ہوں پیشِ خدا اور میں روبروئے رسولؐ

خوبی و شمائل میں ہر آن نرالا ہے!
انسان ہے وہ لیکن ، انسان نرالا ہے
تزئینِ شبِ اسریٰ دیکھی تو مَلک بولے
کیا آج خدا کے گھر مہمان نرالا ہے
اقلیمِ محبت کی دُنیا بھی نرالی ہے !

دُربار انوکھا ہے، سُلطان نرالا ہے

ذیل کے اشعار میں حقیقت، معرفت اور حکمت کا کیسا لطیف سنگم ہے :

نہ محرابِ حرم سمجھے، نہ جانے طاقِ بُت خانہ
جہاں دیکھی تجلّی ہو گیا قربان پروانہ

خدا پُوری کرے یہ حسرتِ دیدار کی حسرت
کہ دیکھوں اور ترے جلووں کو دیکھوں بے حجابانہ

اندازِ بیان کی ندرت داد طلب ہے :

شکستِ توبہ کی تقریب میں جھک جھک کے ملتے ہیں
کبھی پیمانہ شیشہ سے، کبھی شیشہ سے پیمانہ

یہ قطعہ بھی ملاحظہ ہو :

سجا کر لختِ دل سے کشتیِ چشمِ تمنا کو
چلا ہوں بارگاہِ عشق میں لے کر یہ نذرانہ
مری دُنیا بدل دی جنبشِ ابروئے جاناں نے
کہ اپنا ہی رہا اپنا، نہ اب بے گانہ بے گانہ

یہ حکمت ہے یا حقیقت ؟

جلا کر شمع پروانے کو ساری رات روتی ہے
اور اپنی جان دے کر چین سے سوتا ہے پروانہ
کسی کی محفلِ عشرت میں پیہم دور چلتے ہیں
کسی کی عمر کا ہونے کو ہے لبریز پیمانہ

ہماری زندگی تو مختصر سی اک کہانی تھی
بھلا ہو موت کا جس نے بنا رکھا ہے افسانہ

○

یہ لفظ سالک و مجذوب کی ہے شرح اے بیدمؔ
کہ اک ہشیار ختم المرسلینؐ اور اک دیوانہ

○

نعت، غزل کے انداز میں :

اتنا تو ربطِ خاص ہو، ناز میں اور نیاز میں
دل میں خدنگ ناز ہو، دل ہو خدنگِ ناز میں

○

کھل کے کبھی وہ چھپ گئے اپنے حریمِ ناز میں
چھپ کے کہیں جھلک اٹھے، آئینۂ مجاز میں
حضرتِ عشق کے طفیل، ہو گئیں خانہ جنگیاں
برقِ نظارہ سوز میں چشمِ نظارہ ساز میں

○

اب کوئی کیا اٹھائے گا، اب کوئی کیا مٹائے گا
میں ہوں کسی کا نقشِ پا، رہ گزرِ نیاز میں
یار کے پائے ناز پر سجدے ہیں اور جبینِ شوق
میری یہی نماز ہے، میں ہوں اسی نماز میں

○

بیدمؔ ہم شکستہ خاک بھی تیری نہ بے ادب رہے
ذرے نہ اڑ کے جا ملیں گردِ رہِ حجاز میں

کہنے والے اپنی اپنی کہہ گئے
ہم تو ان کا منہ ہی تکتے رہ گئے
حسرتیں ساری ہوئیں پامالِ غم
لختِ دل اشکوں میں مل کر بہہ گئے

○

آتے تھے ، داغِ جگر کے سامنے
منہ کی کھا کر آج مہر و مہ گئے

○

سب گئے ہمدم مدینے کو مگر!
ہائے ہم اب کے برس بھی رہ گئے

○

یہ والہانہ کیفیت بھی خوب ہے :

بھر دے بھر دے مرے داتا مری جھولی بھر دے
اب نہ رکھ بے سر و سامان مدینے والے
آڑے آتی ہے تری ذات ہر اک دکھ کے
میری مشکل بھی ہو آسان مدینے والے
پھر تمنائے زیارت نے کیا دل بے چین
پھر مدینے کا ہے ارمان مدینے والے
سگِ طیبہ مجھے سب کہہ کے پکاریں ہمدم
یہی رکھیں مری پہچان مدینے والے

○

محمد ممدوحِ پاک منظر حسن الحسنی ہیں
کہ آئے دہر میں تصویرِ صورت آفریں ہو کر!

ہمارا کچھ نہ ہونا لاکھ ہونے کے برابر ہے
چلے دُنیا سے ہم شیدائے ختم المرسلینؐ ہو کر

○

پھیلا ہوا ہے چاروں طرف دامنِ نگاہ
اور لُٹ رہی ہے دولتِ دیدارِ مصطفےٰ

○

تفسیرِ مصحفِ رُخِ پُر نور، والضحےٰ
والّلیل شرح گیسوئے خمدارِ مُصطفےٰ
نعلینِ پا سے عرشِ معلّیٰ کو ہے شرف
رُوح الامینؑ ہیں غاشیہ بردارِ مُصطفےٰ

○

فن کارانہ نعت گوئی

کی

چند شاندار اور ناقابلِ فراموش

مثالیں

○

○

- ○ مرزا محمد رفیع سودا
- ○ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ
- ○ حکیم مومن خاں مومنؔ
- ○ میر حسن
- ○ نظیر اکبرآبادی
- ○ ذوق
- ○ داغ

○

فن کارانہ نعت گوئی کی چند شاندار اور ناقابلِ فراموش مثالیں

گذشتہ صفحات میں ہم نے اردو شاعری کی نعت گوئی کے جو نمونے پیش کیے ہیں، وہ جذباتی بھی ہیں اور شاعرانہ بھی، اب ہم چند فن کارانہ نمونے پیش کرتے ہیں، ان میں الفاظ کی دروبست، خیالات کی رفعت اور بلندی، تراکیب کی چستی، قافیوں کی ندرت، اور انداز بیان کا شکوہ وجلال قابل دید اور قابل داد ہے :-

یہ قصائد بہت طویل تھے، مگر ہم نے ایجاز اور اختصار سے کام لیا ہے

سودا کا تعارف

نام مرزا محمد رفیع، سودا تخلص، دہلی میں ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی، پہلے سلیمان قلی خاں اور پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے خان آرزو کی صحبت سے بہت فیضیاب ہوئے اور شعر گوئی میں خان آرزو سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا، خان آرزو ہی کی ہدایت کے مطابق فارسی کو ترک کیا، اور ریختہ کہنا شروع کیا، ان کا مکمل دیوان فارسی ریختہ کے شروع میں ہے، ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں مشہور ہوگیا تھا، زندگی میں ہی لوگ انہیں شاعری کا مسلم الثبوت استاد ماننے لگے تھے، ان کی شہرت کا چرچا اس قدر پھیلا کہ بادشاہ وقت یعنی شاہ عالم کو بھی ان کی شاگردی کا شوق ہوا، اور اپنا کلام اصلاح کے لیے سودا کو دکھانے لگے نواب شجاع الدولہ نے مرزا کے کمال کا جب شہرہ سنا تو نہایت مشفقانہ اور محبت آمیز خط لکھ کر مرزا کو بلوا بھیجا، مگر مرزا نہ گئے۔ کیونکہ دہلی میں بہت سے ایسے قدر دان رئیس و امیر موجود تھے جو استاد زمانہ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنا فخر سمجھتے تھے، انہیں قدر شناسوں اور قدر دانوں کی دریا دلی اور قدر دانی نے مرزا کو فارغ البال اور مستغنی بنادیا تھا۔

جب دلی کی حالت بدل گئی تو شرفائے باکمال نے دلی کو خیرباد کہا اور مرزا بھی اس نازک وقت میں اس تباہ قافلے کے ساتھ دہلی سے نکل کر فرخ آباد چلے گئے جہاں کے نواب احمد خاں بنگش والی فرخ آباد نے مرزا کی بہت نمخواری کی، ۱۱۸۵ھ میں جب نواب صاحب کا انتقال ہوگیا تو سودا فیض آباد چلے گئے اور نواب شجاع الدولہ

کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہو گئے ، شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد جب نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے تو اس زمانہ میں مرزا سے اور ایک فارسی شاعر فاخر مکین سے شعر و شاعری کے معاملے میں کچھ نزاع ہو گئی جس نے طول پکڑ کر باہمی جھگڑے کی صورت اختیار کر لی ، ولی عہد سلطنت نواب سعادت علی خاں نے مرزا کے حق میں تصفیہ کرا دیا اور سابق شکر رنجی جاتی رہی اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا صاحب میں اس قدر ارتباط بڑھ گیا کہ نواب صاحب مرزا کی پر لطف صحبتوں اور بذلہ سنجیوں کو محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے ، نواب صاحب نے مرزا کو ملک الشعرائی کا خطاب بھی عطا کیا اور چھ ہزار سالانہ وظیفہ بھی مقرر کیا ، ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں انتقال ہوا :

مرزا کی تصانیف بہت اہتمام سے چھپی بکثرت ہیں :

سودا اپنے زمانے کے بہت بڑے استاد مانے جاتے ہیں ، اس میں شک نہیں کہ میر اور سودا دونوں زبان اردو کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں ، یہ دونوں حضرات اپنے زمانے میں بے مثل اور بے نظیر تھے ان کے بعد بھی ان جیسا شاعر کوئی نہیں ہوا ، ان کی خدمات زبان اور شاعری اور فن نظم کے ساتھ قابل قدر ہیں ، ان کی اصلاح زبان کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہے ، سودا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کر کے ، فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی ، میر اور سودا ہی نے زبان کو اونچی زبان بنایا اور اس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا :

سودا نے شاعری کی صناعیوں سے اردو زبان میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں ، فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات ، استعارے اور تشبیہیں ، طرز تخیل اور تلمیحات زبان اردو میں داخل کئے اور اس اعتدال سے داخل کئے کہ اس کے جزو ہو گئے ، جس کی وجہ سے زبان اردو کی وسعت اور لچک اتنی بڑھ گئی اور اس قابل ہو گئی کہ ہر کام اس سے لیا جا سکتا ہے ، اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کئے جو بنیادیں ولی اور شاہ حاتم نے قائم کی تھیں ، اس پر سودا نے اپنا رفیع اور شاندار ایوان شاعری تیار کیا ، علاوہ کمال فن کے وہ دو چیزوں کے موجد بھی تھے ، یعنی قصیدہ اور ہجو ، ہر چند یہ دونوں صنفیں فارسی میں نہایت مکمل اور باقاعدہ صورت میں اور اردو میں بھی ایک حد تک ابتدائی اور نامکمل حالت میں موجود تھیں مگر انہوں نے یہ کمال کیا کہ ان کو اردو میں درجہ کمال تک پہنچا دیا ، اور ایسا کر دیا کہ ان کی برابری اور ہمسری کا خیال تک بعد کے شاعروں کے لیے محال ہو گیا ، مرزا ان دونوں اصناف سخن یعنی قصیدہ اور ہجو میں منفرد ہی رہے ہیں :

مرزا سودا کے اردو قصائد بڑے بڑے فارسی استادوں کے قصائد کے ٹکر کے ہیں ، اور بعض تو

سوداؔ کا کلام نعت

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنارِ تسبیحِ سلیمانی

ہنر پیدا کر اوّل، ترک کیجو تب لباس اپنا
نہ ہوں ہوں تیغِ بے جوہر وگرنہ ننگِ عریانی

فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہِ دل ہووے
نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی
نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں شاہوں کی پیشانی

عروجِ دستِ ہمت کو نہیں ہے قدرِ بیش و کم
سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زرافشانی

کرے ہے کلفتِ ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی

اکیلا ہو کے رہ دُنیا میں گر چاہے بہت جینا
ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے عمرِ خضر طولانی

اذیت وصل میں دونی جدائی سے ہو عاشق کو
بہت رہتا ہے نالاں وصلِ گل میں مرغِ بستانی

موقر جانِ اربابِ ہنر کو بے لباسی میں
کہ جوں ہو تیغ با جوہر سے عزت ہے عُریانی

رنگ کو رہ خاموش حرفِ ناسزا سن کر!
کہ تا بدگو صدائے عیب سے کھینچے پشیمانی
یہ روشن ہے بہ رنگِ شمع ربطِ باد و آتش سے

موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمن جانی
نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا

نفس جب تک ہے داغ دل سے فرصت کیونکہ بجھے بانی
کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو
کہ زیب ترک چشم یار سرمہ ہے صفاہانی
طلوع مہر ہو پامال حسرت آسماں اوپر
لکھوں گا پھر غزل گر اس زمیں میں مطلع ثانی

عجب ناداں ہیں جن کو ہے عجب تاج سلطانی
فلک بال ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی
نہیں معلوم ان نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا
کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی
ہماری آہ دل تیرا نہ نرما دے تو یا قسمت
وگرنہ دیکھ آئینے کو پتھر ہو گیا پانی
تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا
کہ ہے جمعیت خاطر مجھے ان کی پریشانی
زمانے میں نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیراں ہوں
گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیوں کر بآسانی
جنوں کے ہاتھ سے سرتا قدم کا ہیدہ اتنا ہوں
کہ اعضا دیدۂ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی
نہ رکھا جگ میں رسم دوستی اندوہ روزی نے
مگر زانو سے اب باقی رہا ہے ربط پیشانی
سیہ بختی میں لے سودا نہیں طول امل لازم

نط خامے کے سر کٹوائے گی ایسی زباں دانی
سمجھ اے تا فصاحت فہم کب تک یہ بیاں ہوگا

ادائے چینِ پیشانی و لطفِ زلفِ طولانی
خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے

نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی
نظر رکھنے سے ان کے روئے چشم و زلف کے اوپر

مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی
نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے

برہمن کو ستم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی
نہ ہے دینِ محمدؐ پیروی میں اس کی جو ہو دیں

دے ہے خاک قدم سے اس کی چشم عرش نورانی
ملک سجدہ نہ کرتے آدمِ خاکی کو، گر اس کی

امانت دارِ نورِ احمدی ہوتی نہ پیشانی
اسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا

مراد الفاظ سے معنیٰ ہیں تا آیاتِ قرآنی
خیال خلق اس کا گر شفیع کافراں ہووے

رکھیں بخشش کے سر منت یہودی اور نصرانی
زباں پر اس کے گذرے حرف جس جا گہ شفاعت کا

کرے واں ناز آمرزش پہ ہر اک فاسق و زانی
دکھا جب سے قدم سند پا آن نے شریعت کا

کرے ہے موجِ بحرِ معدلت تب سے یہ طغیانی
اگر لو تماں پر خس کے شور کا مکھ ارادہ ہو

گرہ کو آگ کے وہ ہیں کرے غرق آن کر پانی

موافق گر نہ کرتا عدل اس کا آب و آتش کو
تو کوئی سنگ سے بیدا نہ ہوتی شکل لعل رُمانی

یہ کیا انصاف ہے یارو، کہ طیر و وحش تک جگ میں
اس امن و عیش سے اپنی بسر اوقات لے جاتی

پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا
شباں نے گرگ کو گلے کی سونپی ہے نگہبانی

ہما آسا ہے پرواز ملخ اوجِ سعادت پر
کرے ہے مور چڑھ کر سینہ رو پر سلیمانی

کھلے ہے غنچۂ گل باغ میں خاطر سے بُلبُل کے
جواب اوراقِ جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی

جہاں انصاف سے ہر گاہ اب معمور ہے اتنا
تو اس کے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی

ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اس وقت دنیا میں
وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

نہ ہونے سے جدا سائے کے اس قامت سے پیدا ہے
قیامت ہووے گا دل جیسپ وہ محبوب سبحانی

جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے
بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسفؑ ثانی

معاذ اللہ یہ کیا حرف بے موقع ہوا سرزد
سو اس کو پھر کہوں تو ہوں میں مردود مسلمانی

کدھر اب فہم ناقص لے گیا مجھ کو نہ یہ سمجھا
کہ یہ جوہر الوہیت ہے، وہ ہے ماہ کنعانی

جو صورت اس کی ہے لاریب وُہ ہے صورتِ ایزد
جو معنی اس میں ہیں بے شک وُہ ہیں معنی رَبانی
حدیثِ من رَآنی دال ہے، اس گفتگو اوپر
کہ دیکھا جس نے اس کو اُس نے دیکھی شکل یزدانی
غرض مشکل نہیں ہوتی کہ پیدا کر کے ایسے کو
خدا گر یہ نہ فرماتا، نہیں کوئی مرا ثانی!
بس آگے مت چل اے سوداؔ میں دیکھا فہم کو تیری
کر استغفار اس منہ سے اب ایسے کی ثناخوانی

ظفرؔ کا تعارف

سراج الدین ظفرؔ، دلّی کے بادشاہ تھے، لیکن اقلیم سخن کی تاجوری اور شہریاری بھی اُن کے مقسوم میں لکھی تھی پہلے نصیرؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا پھر ذوقؔ کے شاگرد ہوئے، ان کی وفات کے بعد غالبؔ سے مشورہ سخن کرنے لگے، ظفرؔ کا کلام نصیرؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے رنگ سے خالی ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود شعر کہتے تھے، اور بعض کم بیں اور بد باطن لوگوں نے یہ جو مشہور کر رکھا ہے کہ وہ دُوسروں سے کہلوا لیتے تھے، غلط ہے، ظفرؔ کا رنگ ایک مستقل وجود کا مالک ہے، ان کی انفرادیت چھپائے نہیں چھپتی، کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، چار دیوان طبع ہو چکے ہیں جواب کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں عہد نظر بندی و جلا وطنی کا کلام دستیاب نہ ہو سکا، جو اپنے سوز و گداز اور درد و اثر کے لحاظ سے یقیناً گذشتہ کلام پر فائق ہوگا۔

ظفرؔ ایک مرنجاں مرنج، صوفی مشرب اور سراپا مذہبیت انسان تھے، اُنہیں بزرگوں سے تو عقیدت تھی ہی، لیکن سرورِ کائنات کی ذاتِ گرامی سے تو والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے، اور اس کا ثبوت ان کے وہ اشعار ہیں جو انہوں نے نعتِ رسُولؐ میں کہے ہیں! جن کا کچھ حصّہ بطورِ نمونہ کے ملاحظہ فرمایئے!

ظفرؔ حضورِ رسالتمآبؐ میں

اے سرورِ دو کون شہنشاہ ذو الکرم
مہو جمل مرسلین و شفاعت گر امم

موکب ترا ملائک و مرکب ترا براق
مولد ترا ہے مکہ و معبد ترا حرم

رنگِ ظہور سے تیرے گلشن رُخِ حدیث
نورِ وجود سے تیرے روشن دلِ قدم

ہوتا کبھی نہ قالبِ آدم میں نفخِ رُوح
بھرتا اگر خدا نہ محبّت کا تیری دم

کرتا تھا جس سے مردہ کو زندہ دمِ مسیح
تھا شمہ تیرے خلق کا وُہ اے علوِ شیم

ڈھاتا جو کفر قوتِ اسلام سے تری
صد جائے سے شکستہ ہے زنارِ موجِ یم

تو تھا سریرِ اوجِ رسالت پہ جلوہ گر
آدم نہاں ہنوز پسِ پردۂ عدم

کرتا ہے تیرے اسمِ مُبارک کو دل پہ نقش
اس واسطے عزیزِ جہاں ہوگیا درم

اے معدنِ کرم تری ہمّت کے رُوبرُو
کم تر ہے سنگ ریزہ ہے تدبگیں جسم

جو کچھ سوائے عرش وہ سب اس کے سایہ میں
تیرے ہوا ہے جاہ کا برپا جہاں علم

صدقے زمیں کے ہوتا نہ پھر پھر کے آسماں
رکھتا سرِ زمین نہ اگر اپنا تو قدم

محروم تیرے دستِ مُبارک سے رہ گیا
کیوں کر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم

عالم کو تیرا نور ہوا باعثِ ظہور

آدم ترے ظہور سے ہے مظہر اتم
ہیں زائران روضۂ اقدس ترے جہاں
آتا ہے پائے بوس کو واں روضۂ ارم
واللیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا
والشمس ہے ترے رُخِ پُر نور کی قسم
انصاف تیرا دیوے جو داد ستم کشاں
دندان سین آرہ کشاں ہو سرِ ستم
قرآں میں جب کہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا
کیا تاب پھر قلم کو جو کچھ کر سکے رقم
تیری جناب پاک میں یہ ہے ظفر کی عرض
صدقے میں اپنی آل کے لئے شاہ محتشم
صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دور کر
آئینۂ ضمیر سے میرے غبارِ غم
پہنچا نہ آستانِ مقدس کو تیرے میں
اس غم سے مثلِ چشمہ ہوئی میری چشم نم
پر خاکِ آستاں کو تری اپنی چشم میں
کرتا ہوں سُرمہ میل تصوّر سے دم بدم

مومن کا تعارف

نام حکیم مومن خاں تھا، اور مومن تخلص، باپ کا نام حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں تھا جو کشمیر کے ایک نجیب خاندان سے تھے، سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا کہ مومن کے دادا حکیم نامدار خاں کو پرگنہ نارنول جاگیر میں ملا ہو ریاست جھجر کی حدود میں تھا لیکن جب جھجر کی ریاست نواب کو مل گئی تو ان کی جاگیر ضبط ہو گئی، البتہ اس کے بدلے ایک ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر ہو گئی، بعد میں سرکار انگریزی کی طرف سے چار سو روپے سالانہ کی پنشن ملی، ان کے والد دہلی میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے، اور

وہیں مومن پیدا ہوئے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ان کے مکان کے سامنے رہتے تھے انہوں نے کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا باپ نے حبیب اللہ رکھنا چاہا لیکن نہ چل سکا:

جب ہوش سنبھالا تو شاہ عبدالقادر دہلویؒ سے عربی کتب پڑھیں اور اپنے چچا غلام حیدر خاں سے طب کا درس لیا، حافظہ بہت تیز تھا اس لیے جس علم میں پڑتے، بہت جلد تمام کتب ازبر کر لیتے پھر شاعری شروع کی اور شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے مگر تھوڑے عرصہ بعد ان کو کلام بنظر اصلاح دکھانا بند کر دیا، نجوم کی طرف مائل ہوئے تو اس میں بھی نام پیدا کیا، سال میں ایک مرتبہ تقویم دیکھتے تھے اور نقشہ ذائچہ ذہن میں محفوظ ہو جاتا تھا نجوم سے جو حکم لگاتے خالی نہ جاتا اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جو غالب کے عزیز دوست تھے، مومن کے شاگرد تھے، مومن مولانا سید احمد شہید بریلوی کے مرید خاص تھے، مداحی سے نفرت تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے قصیدے کہے ہیں ان میں زور طبع دکھایا ہے، دنیوی شخصیتوں میں سے صرف راجہ اجیت سنگھ، برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کا قصیدہ کہا ہے انہوں نے ایک ہتھنی انعام میں دی آپ نے کہا حضور میں غریب آدمی ہتھنی کو کھلاؤں گا کہاں سے؟ رئیس نے ایک سو روپیہ ہتھنی کی خوراک کے لیے دے دیا لیکن بقول آزاد گھر آ کر قبل اس کے کہ ہتھنی کچھ کھائے، انہوں نے ہتھنی کو بیچ کر کھالیا، اور کسی نے اس پر طنز کی تھی ؎

جنھوں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

راجہ کپورتھلہ نے ساڑھے تین سو روپے وظیفہ مقرر کر کے بلا بھیجا، چلنے کے لیے تیار بھی ہوئے مگر معلوم ہوا کہ اسی دربار میں گویے کی تنخواہ بھی اسی قدر ہے، اسی وقت ارادہ ترک کر دیا۔

آپ چار دفعہ وطن سے باہر گئے:

• رامپور • سہسوان • جہانگیر آباد • سہارنپور

مومن کی تاریخ گوئی مشہور ہے، بات بات میں تاریخ کہہ دیتے تھے، اس کے لیے انہیں کوئی محنت درکار نہ تھی، چند تاریخیں درج ذیل ہیں:

۱۔ زین خاں حج کو گیا مگر راستے سے واپس آگیا، آپ نے فوراً کہا ع

چوں بیاید ہنوز خر باشد

۱۲۵۶ھ

۲۔ قلعہ دہلی سے ایک شخص نکالا گیا، آپ نے کہا ع

از باغ خلد بیرون شیطان بے حیا شد

۱۲۲۶ھ

اس میں نکتہ یہ تھا کہ "باغ خلد" کے اعداد کے مجموعے سے "شیطان بے حیا" کے اعداد وضع کر دینے سے ۱۲۲۶ھ نکلتا ہے:

۳۔ خلیل خاں کی تاریخ ختنہ کہہ ڈالی،

سُنتِ خلیل اللہ

۴۔ اپنے گرنے کی تاریخ کہی "دست و بازو شکست"

۵۔ بخار سے صحت یاب ہوتے تو فوراً کہا "رفت تپ تو بہ من"

۶۔ ذرا درج ذیل معمہ کو دیکھیے کس قدر خوشنما ہے ؎

بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا
ہم اُلٹے، بات اُلٹی یار اُلٹا

جناب رئے

ان کی وفات پر کسی شاگرد نے ان کی تاریخ وفات کہہ دی تھی ———— "ماتم مومن"

دہلی دروازے سے باہر آپ کو سپرد خاک کیا گیا:

ان کی غزل نہایت لطیف اور نازک خیالات پر مبنی ہوتی تھی اور اکثر شعر سنتے ہی دل میں اُتر جاتے تھے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعر بالا غالب کو بے حد لپسند تھا اور وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص میرا سارا دیوان لے کر یہ شعر دے دے تو کافی ہے ؎

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

استعارہ اور تشبیہ کے زور نے کلام کو چمکا دیا ؎

کشتہ ہوں اس کی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعویٔ اعجاز دیکھنا

شعلۂ آہِ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ
اوّلِ ماہ میں چاند آیا نظر آخرِ شب

کلام میں جگہ جگہ فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دل کش تراشیں ہیں جو بے حد لطف پیدا کرتی ہیں ؎

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ
اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

روزِ جزا تو قاتلِ دل جو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

کہیں کہیں فارسی ترکیبوں نے کلام کو مشکل بھی بنا دیا ہے اور بعض جگہ فارسی ترکیبوں نے بے لطفی پیدا کر دی ہے ؎

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گلِ شمعِ شبستاں ہوں گے

نقدِ جاں تھا نہ سزائے سرِ عاشق صد حیف
خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

بعض اوقات صرف الفاظ کے الٹ پھیر اور تقابل ہی سے لطف پیدا کر دیتے ہیں :

پھر بہار آئی، وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے
سنگ اور ہاتھ وہی، وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے، وہی دشت و بیاباں ہوں گے

قصائد اور مثنویاں بھی بلند پایہ ہیں، اگرچہ مومن کا کمال ان کے تغزل میں نظر آتا ہے، قصیدے دیوان میں چھ تک کہے ہیں لیکن صرف ایک قصیدہ راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کے بھائی کا ملتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی شان میں بہت معرکہ آرا قصیدے ہیں، تراکیب و قافیہ اکثر مغلق اور دقیق ہیں، اصطلاحات میں علوم و فنون بے شمار ہیں[1]

مومن شہنشاہِ کائنات کے دربار میں

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس
کہ جیسے صبحِ شبِ ہجر نالہائے خروس
ہے اس طرح فرح انگیز کوکوئے قمری
کہ جیسے فوجِ ظفر میں شورِ دہلِ کوس
نوائے طوطیٔ شکر فشاں کی لذت سے
سماع و رقص میں اہلِ مذاق جوں طاؤس
غبارِ صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط
بہارِ لالہ و گل ہیولائے عرس و شموس
صفا ہے وہ در و دیوارِ باغ کا عالم
کہ آشیانے میں دشوار طائروں کو جلوس

---

[1] آئینہ نقد اثر -

زہے فریبِ صفا خاک بیز ہے گلچیں
پڑے جو وسعتِ گلزار میں گلوں کے عکوس
ہجومِ سبزہ نے کی بس کہ رنگ آمیزی!
زمیں پہ چادرِ مہتاب بن گئی سندس
ہوئی ہے سقفِ فلک مانعِ قد افرازی
وگرنہ بید کہاں اور ترقیِ معکوس!
ہو کیونکہ ایسی رطوبت پہ سنگ سارۂ نسیم
نیا ہے شبنمِ گل آبگینۂ فانوس
خزانۂ خاک میں نیرنگِ دل ملاتا ہے
زبسکہ لفظِ خزاں جانتے ہیں سب منحوس
نویدِ مالکِ گلزار کو کہ زر کی جگہ
ہر ایک کاسۂ گل میں ہے گنجِ دقیانوس
یہ آب و رنگ کہاں لعل اور زمرد کا!
مگر دیا ہے گل و سبزہ نے انہیں ملبوس
چمن کی خاک سے گلگونہ اب بناتے ہیں
شگفتہ آدم رخصت بھی ہو عذارِ عروس
خمیدہ شاخ سے یوں رنگِ گل چھلکتا ہے
کہ جس طرح سے چھلک اٹھے مشعلِ معکوس
پڑھے ہے مرغِ گلستاں وہ مطلعِ رنگیں
کہ سن کے بس جسے رہ جائے مرغِ بلبل طاؤس
زبانِ لالہ کہاں اور مدحِ تاجِ خروس
گرا ہے خاک پہ کیا لعلِ افسرِ کاؤس

ہزار داغ ہو پروائے آفتاب کسے
پرستشِ گل خورشید میں ہے گرمِ مجوس
شگفتہ تر ہے چمن روضہ ہائے جنت سے
ہنسی کی جاتے نہیں گر صومعہ نشیں ہی عبوس
خلل پذیر رطوبت ہوا دماغ بہار
عجب کہ سبزہ خوابیدہ کو نہ ہو کابوس
ہے وحشتِ بزمِ طرب کثرتِ نتائج سے
نہ کیوں ہو شکلِ حماری کو نازِ شکلِ عروس
ہوائے سیرِ چمن زار کی وہ مستی ہے
کہ خلق کو ہوئی مشکل حفاظتِ ناموس
عجب نہیں مے گل رنگ کی ہوس سے اگر
خود آ گرے شیشہ خالی میں ہو پری محبوس
مزاجِ دہر میں یہ اعتدال آیا ہے
کہ جس نبات کو دیکھو وہ صالح الکیموس
عجب نہیں کہ بسانِ گلس عسل اُگلے
گر ان دنوں ہو کوئی مبتلائے لیلاؤس
نمو کا معجزہ صلّ علے کہ مہرِ گندم
ہوائے جنبشِ غربال سے بنے ہے سبوس
رطوبت ایسی نظر آتی داغِ لالہ میں
کہ چاک چاک حسد سے ہوا دلِ اقیوس
قبائے گل کو گر اطلس سے دیجئے تشبیہ
سیاہ پوش حجل ہو درونِ ماتم سوس
ترائے نامیہ کو ناگوار ہے کتنا

کہ ہضمِ رابعہ محتاج ہو سوئے کیلوس
ہوا ہے اب تو یہ سرمایۂ لطافتِ آب
کہ پشتِ ماہی پہ گلہائے اشرفی ہیں ملوس
کہیں جہاں میں کائی نظر نہیں آتی
کہ صرفِ رنگِ رزاں ہو گئی بجائے لبوس
سرایتِ نمِ آب و نمو سے دُور نہیں
جو سبزہ زار بنے ریشِ زاہدِ سالوس
بعید کچھ نہیں شادابیِ زمیں سے اگر
زیادہ تر کرے سیلانِ خونِ گل خلوس
گر اس بہار کی یعقوبؑ کو ہوا لگ جائے
شمیمِ جامۂ یوسفؑ کبھی نہ ہو محسوس
ہوا سے بسکہ گلِ شمع بھی ہے عطر آگیں
عدیلِ طبلۂ عطّار بن گئی فانوس
یہ گل کھلاتی ہیں آب و ہوا کی ترتیبیں
کہ ہے پیاز کو لافِ منافعِ ملبوس
ہوائے جنبشِ اوراق سے ہیں عطر فروش
لغاتِ ورد کہ ہیں ثبتِ صفحۂ قاموس
فسوں گری دمِ مشاطۂ نسیم کی دیکھ
کہ شکِ نافہ ہے سے غنچہ ہائے زلفِ عروس
صفات آ گئے جو آئینہ ہوا میں نظر
ہوا انعکاس و عوارض کو اعتبارِ نفوس
صدا نکلتی ہے مل کر ہلو سے کیا ہو فرق
کہ بانگِ خندۂ گل ہے کہ نالۂ ناقوس

عجب ہوا ہے کہ فیض ہوا سے ہوتا ہے
شکم میں خستہ کے نشو و نمائے اصل السوس

غریق آبِ خجالت ہوا کے فیض سے ہوں
کہ گل ہوا ہے مرا غنچۂ دلِ مایوس

ہوا ہے کون سی ایسی اگر مدینے کی
دمِ مسیح کو ہے جس کی حسرتِ پابوس

شرف مدینے کو جس سے ہے ہو نہ کیوں وہ ہو
جسے بتاتے ہیں محبوبِ حضرتِ قدوس

جو خواب میں بھی کبھی دیکھتی جمال اس کا
تو دیتی دل کو کبھی یوسفؑ کو دخترِ طیموس

سو شمع بزم کبھی اس کے روئے تاباں کو
کتان و ماہ بنے نورِ شعلہ و فانوس

وہ کون احمدِ مرسل شفیعِ ہر دو سرا
جو خلق کا سبب اور باعثِ معادِ نفوس

جہاں خدائے شہنشاہ آفتاب نشان
فلک سریرِ قمر طلعت و ملک ناموس

سیاہ چشموں کو مشکل نگاہِ دزدیدہ
یہ اس کے حفظ سے ہے ملکِ سلطنت محروس

نگاہ بانیٔ عصمت سے وہ رواجِ حیا
کہ چشم بیمار نہ ہوں نرگس اور اوقیانوس

سنے ہے دورِ عدالت میں اس کے شیر غریں
شباں کی ضربتِ بیجا سے نالشِ جاموس

کرم میں دل اسے غنیاں سے کس طرح تشبیہ

کروں میں جان کے کیوں کر ترقیِ معکوس
کہ جن کی بخشش یک روزہ کو وفا نہ کریں
ہزار رسالہ گہرہائے قلزم و قاموس
یہ جی میں ہے کہ پڑھوں اور ایک دو مطلع
جو ہو ہر اک متنفس کی طبع سے مانوس
ترے ہے فیض سے ہر قطرہ آبیارِ مجوس
ترے ہے نور سے ہر ذرہ جلوہ زارِ شموس

ہمیشہ عفو ترا طالبِ گنہ گاراں!
مدام رحم ترا دردمند کا جاسوس
ترے حسود کی نسبت سے جل رہی ہے نہ کیوں
ہجومِ شعلہ سے دوزخ کے کفِ افسوس
تری غلامی کی دولت سے خاکپائے ہلال
سفیدہ رُخِ فغفورِ چین و خسرورِ روس
خمیدہ کس لیے نہ آسماں بنے تجھے بھلا؟
نہ تھا ازل سے جو بدنظر ترا پابوس
بہامیں دیتی ہے ماہی و دفینہ ہائے زمیں
یہ بڑھ گئی ترے سکے سے قدرِ تابہ فلوس
ہے احتساب ترا مانعِ لباسِ حریر
نہ پھینک دیوے کہیں چرخِ اطلس ملبوس
زِ اوجِ خوف کہ رک جائے تاگلو آ کر!
نہ نکلے معبدِ ترسا میں نالۂ ناقوس
یہ مے کو بھی جہاں سوز نے جلایا ہے!

کہ منع نہ کر سکے فرق صراحی و فانوس

زبس شراب کو بھی آفتاب کہتے ہیں
نہ آسماں کہ واژدوں رہے مدام کیوس

فریب وعدہ پہ چھوڑی بتوں نے عادتِ ستم
سنا زبسکہ زباں سے تری وعید غموس

دم مصاف ترے دشمنوں کے لشکر میں
صدائے نوحہ و شیون ہے شورِ غلغل کوس

دو نیم ہوں تری شمشیر کے تصوّر سے
بسان ساغر خورشید کاسہ ہائے رؤس

ملا دے گاوِ زمیں گاو چرخ سے نیزہ
بٹھائے خاک پہ شیر سپہر کو دبوس

قطعہ

اگر کہے روئے یا محمدؐ عربی
صفیر مرگ ہو رستم کو نعرۃ لاکوس

مخالفوں کو ترے دو جہاں جہنم ہے
کہ تاب مہر سے جلتے رہے ہیں یاں بھی مجوس

ہے برق اسپ ترا ابر رفتے فرشتہ رکاب
کہاں ہو چشم بعشر الیسی پاؤں سے محسوس

جس کے دھیان میں مضمونِ قاب قوسین آئی
وہ دیکھ لے ترے زین و کماں کا قربوس

ترے عدو کی خرابی کا کچھ علاج نہیں
نہ ہو قبولِ دعا سے بھی رفعت ببوس

ترے خیال سے اصحابِ کہف کو ہے یہ چین
وگرنہ خواب کہاں اور زمانِ دقیانوس

کچھ انتہا بھی کواکب کے دورِ بیجا کی
ہمیشہ ہے مرے طالع میں اجتماعِ نحوس

جو اپنی حسرت و ارماں میں بیان کردوں
نہ تاب لائے دلِ سختِ زاہدِ سالوس

جفا کو آئے مری دل شکستگی پہ رحم
بلا کرے مرے احوالِ زار پر افسوس

ملے ہیں خاک میں کیا کیا مرے فنون و علوم
خدا کسی کو نہ دے ایسے طالعِ معکوس

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر
کرے معارضہ سر دفترِ عقول و نفوس

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بلبل
نظارۂ رخِ گلفام سے مجھے محسوس

ہو ہوں معالجِ مبطوں تو قابضِ ارواح
کرے دعائے رواجِ طریقِ جالینوس

ورم ہو چارہ گر قبض تا بدستِ لئیم
کیا ہو میں نے جو تجویز وزنِ معزِ فلوس

کروں جو گردشِ انجم کی میں رصد بندی
فدا ہو وجد میں آ کر روانِ بطلیموس

گو وہ عصمتِ مریم ہو کثرتِ اولاد
عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ شکلِ عروس

طلسم ماہ لکھوں گر پئے زبانِ لبتن ،

بنائے مہر و مہِ چرخ نکتہ جاسوس
یقین کہ زہرہ و خورشید میں مقابلہ ہو
پڑھوں جو اپنے دوری و علائے بد بطلیموس
جو میری نثر کے دیکھے لآلی منثور
اٹھالے مسندِ حشمت حجاب سے کاؤس
بفرضِ گر کرہ خاک کو کہوں دائر
شکستہ اسپ لگی ہووے پشیانۂ فردوس
فنونِ نظم میں میں نے نکالی ایسی راہ
طریقۂ شعرائے سلف ہوا مطموس
مرے کلام ثریا نظام کا منکر
وہ تیرہ روز جو بر جبیں کو کہے منحوس
جو دیکھیں میری طبیعت کی گوہر افشانی
شریکِ درد ہوں محمود نکتہ پرورِ طوس
دیے ہیں میرے حسد نے زبس ہزاروں داغ
روا ہے باندھیے گر عندلیب کو طاؤس
تماش دیکھ کے رنگینیِ سخن کا مرے
حریرِ لالہ و گل شرم سے ہوا مدروس
خدا کے واسطے گرمِ دعا ہو مومن بس
کہ منتظر ہے ازل سے اجابتِ قدوس
ہے جب تلک گل و بر قسمتِ نہال و شجر
ہے جب تلک دلِ لالہ میں داغ حسرت بوس
مدام پھولے پھلے دوستوں کا نخلِ مراد
رہین داغ عدو کا رہے دلِ مایوس

میر حسن کے نعتیہ اشعار

غلام حسن نام، حسن تخلص دہلی کے خاص باشندے تھے۔ ان کے جد امجد میر امامی اس وقت وارد ہندوستان ہوئے جب کہ شاہجہاں صاحبقراں کا ستارۂ اقبال آسمان پر چمک کر زوال کے قریب تھا۔ میر امامی یہیں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے، یہ شہر ہرات کے سادات عظام کے خاندان سے تھے، ان کے بیٹے میر عزیز اللہ تھے جن کے صاحبزادے میر غلام حسین ضاحک فارسی کے ذی رتبہ شاعر ہی نہ تھے، بلکہ بڑے ظریف المزاج زندہ دل بھی مشہور تھے، ان کی اپنے مشہور معاصر مرزا رفیع سودا سے ہمیشہ نوک جھوک ہوتی رہی ان کا کلام اگرچہ تلف ہو چکا، مگر ایک آدھ رُباعی اور شعر تذکروں میں اب بھی باقی ہے۔ میر حسن اسی دریائے ذخار کے ایک گرامی گوہر تھے۔

میر حسن سنہ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) کو بمقام سید واڑہ بانی دلی میں پیدا ہوئے اور یہیں کتب درسیہ فارسی کی اپنے والد میر غلام حسین ضاحک سے تعلیم پائی اور کہا جاتا ہے کہ انہی کے فیض صحبت سے شعر و شاعری کا ذوق بھی پیدا ہوا اور یہیں خواجہ میر دردؔ المتوفی سنہ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) کو اپنا کلام ابتدائی دکھانا شروع کیا، چونکہ خاندان تیموریہ کی طاقت قریب قریب زائل ہو چکی تھی اور اب اس خاندان کا چراغ اقبال ٹمٹما ٹمٹما کر قضا و قدر کے ایک تند جھونکے کا انتظار کر رہا تھا، اسی لیے طوائف الملوکی، خانہ جنگی، بدامنی کا دور دورہ تھا۔ سرزمین دہلی ان آفتوں اور مصیبتوں کی جس طرح ہمیشہ مرکز رہی ہے، اسی طرح اس وقت بھی جولانگاہ محشر بنی ہوئی تھی، اسی وجہ سے شرفا کو نہ وہاں اطمینان حاصل تھا اور نہ وہاں کی بود و باش کو وہ پسند کرتے تھے، جس کو جہاں کہیں امن و عافیت کی جھلک دکھائی دیتی، سیدھا ادھر ہی کا رُخ کرتا اور ہمیشہ کے لیے عمر بھر کی رفیق (دلّی) کو الوداع کہہ کر سدھار جاتا۔ میر ضاحک کو بھی وقتی پریشانیوں نے فیض آباد جانے اور وہاں کے کارپردازوں کارفرماؤں کے فیض بے دریغ سے نفع اٹھانے کے لیے مجبور کیا، میر حسن اپنے اختیار میں نہ تھے، پھر بھی وطن مالوف کو چھوڑنا، خواجہ میر درد جیسے استاد کی خدمت سے منہ موڑنا بڑا ہی گراں گزرا، مگر کرتے تو کیا کرتے سنگ آمد و سخت آمد ایک رباعی بشکل استاد سے اجازت طلب کی، رباعی سوز و گداز اور دلی جذبات سے بھری ہوئی ہے:

جاناں ز تو امید نگاہ ہے وا دیم
امید نگاہ ہے ز تو گاہے وا دیم
کشتۂ چشم سرمہ سایت ہستیم
نے نالہ و نے فغاں نہ آہے وا دیم

اس کے بعد فیض آباد آ گئے اور یہاں ان کا ایسا جی لگا کر عمر بھر یا در ہا، چنانچہ جب فیض آباد سے لکھنؤ میں آئے تو لکھنؤ اور فیض آباد کا تقابل کرتے ہوئے کچھ اشعار مثنوی گلزار ارم میں لکھے ہیں اور لکھنؤ کی فیض آباد کے مقابلہ پر ہجو کی ہے۔ فیض آباد میں نواب سالار جنگ بہادر بہو بیگم صاحبہ کی سرکار میں ملازم ہوئے بعد ازاں ان کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی رہے ۱۱۷۵ھ میں نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تو یہ بھی فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور یہیں کچھ دنوں کے قیام کے بعد ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا اور محلہ مفتی گنج مرزا قاسم علی خاں کے باغیچہ کے عقبی حصہ میں مدفون ہوئے۔ مصحفی نے ان کی تاریخ وفات یوں کہی ہے:

چوں حسن آں بلبل خوش داستان!
رو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بس کہ شیریں بود نطقش مصحفی
شاعر شیریں بیاں تاریخ یافت

(۱۲۰۱ھ)

نعتِ حضرت رسالت پناہ

نبی کون یعنی رسولِ کریم
نبوت کے دریا کا دُرِ یتیم
ہوا گو کہ ظاہر میں اُمی لقب
پہ علم لدنی کھلا دل پہ سب
ہوا علم دیں اس کا جو آشکار
گذشتہ ہوئے حکم تقویم پار!
اٹھا کفر اسلام ظاہر کیا
بتوں کو خدائی سے باہر کیا
کیا حق نے نبیوں کا سردار اُسے

بنایا نبوت کا حق دار اُسے
نبوت جو کی حق نے اس پر تمام
لکھا اشرف الناس خیر الانام
بنایا سمجھ بوجھ کر خوب اُسے
خدا نے کیا اپنا محبوب اُسے
کروں اس کے رتبہ کا کیا میں بیاں
کھڑے ہوں جہاں باندھ صف مرسلاں
مسیحؑ اس کے خرگاہ کا پارہ دوز
تجلیِ طور اس کی مشعل فروز
خلیل اس کے گلزار کا باغباں
سلیماں سے کئی مہردار اس کے ہاں
خضر اس کی سرکار کا آب دار
زرہ ساز داؤدؑ سے واں ہزار
یہ تھی رمز جو اس کے سایا نہ تھا
کہ زنگِ دوئی واں تک آیا نہ تھا
نہ ہونے کا سایہ کے تھا یہ سبب
ہوا صرف پوشش میں کعبہ کی سب
وہ قد اس لیے تھا نہ سایہ فگن!
کہ تھا کل وہ اک معجزہ کا بدن
بنا سایہ اس کا لطیف اس قدر
نہ آیا لطافت کے باعث نظر
عجب کیا جو اس گل کے سایہ نہ ہو
کہ تھا وہ گلِ قدرتِ حق کی بو

خوش آیا نہ سایہ کو ہونا جُدا
اسی نورِ حق کے رہا زیرِ پا

نہ ڈالی کسی شخص پر اپنی چھاؤں
کسی کا نہ منہ دیکھا دیکھے اس کے پاؤں

وہ ہوتا زمیں گیر کیا فرش پہ
قدم اس کے سایہ کا تھا عرش پر

نہ ہونے کی سایہ کے اک وجہ اور
مجھے خوب سوجھی یہ ہے قابلِ غور

جہاں تک کہ تھے یاں کے اہلِ نظر
سمجھ ما یہ نور کحل البصر

سبھوں نے لیا پتلیوں پر اٹھا
زمیں پر نہ جانے کو گرنے دیا

سیاہی کی پتلی کا ہے یہ سبب
وہی سایہ آنکھوں میں پھرتا ہے اب

وگرنہ یہ تھی چشم اپنی کہاں
اسی سے یہ روشن ہے سارا جہاں

نظر سے جو غائب وہ سایہ رہا
ملائک کے دل میں سمایا رہا

نظیر اکبر آبادی نعت گو کی حیثیت سے

میاں نظیر ۱۱۴۸ھ مطابق ۱۷۳۵ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے، ماں باپ کے سایہ میں پرورش پائی۔ یہی سال ہے کہ میر تقی میر گیارہ برس کی عمر میں اپنے سوتیلے ماموں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی کے پاس دہلی چلے گئے تھے، اس وقت آگرہ کا صوبیدار نصرت یار خاں تھا، علمی مجالس قائم تھیں، میر ہادی، فضائل خاں، ملا محمد سعید اعجاز، ملا زاہد خلعت قاضی محمد اسلم ہروی کے تلامذہ کی گرم بازاری تھی، یہ ضرور ہے کہ کچھ دن پہلے شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، اسد اللہ انسان آگرہ سے جا چکے تھے، احسان اللہ شیخ رفت کا دور تھا، عیدگاہ کے پاس قیام تھا، بایزید قلندر سرائے گیلانی میں رہتے تھے محمد باعث عالم صوفی کا ڈنکا بج رہا تھا، یہ عالم گنج میں مقیم تھے، ان کے پاس ہی میر تقی میر کے والد سید علی متقی رہا کرتے تھے، یہیں ابو الفتح اکبر آبادی طبیب کا مطب بھی تھا۔

میاں نظیر نے ہوش سنبھالا تو مولوی محمد کاظم ابن مولوی دوست محمد نبیرہ میر رفیع الدین محدث متوفی ۱۱۹۴ھ ملا ولی محمد شارح مثنوی مولانا روم متوفی ۱۲۰۱ھ اسلاف کے آثار علمیہ پر فضل و کمال کی مجلس قائم کئے بیٹھے تھے، مالا مال علم ان کی درسگاہوں سے فیض یاب ہوتے، ان ہی کی سیر میاں نظیر نے بھی کی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر آگرے میں نہیں دہلی میں پیدا ہوتے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مغل سلطنت کا ستارہ زوال کی طرف مائل ہو چکا تھا اور محمد شاہ ثانی کو سید حسین علی اور سید عبد اللہ نے جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہیں، شہنشاہ ہند کی حیثیت سے تخت پر بٹھا دیا تھا، اسی زمانے میں دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہو چکا تھا اور بعدہ جب ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے چڑھائی کی تو نظیر بائیس تیئیس سال کی عمر میں اپنی ماں اور نانی کے ساتھ دہلی چھوڑ کر اپنے سابق وطن آگرے میں مٹھائی والے پل کے پاس آکے آباد ہو گئے ہیں۔

پرانی کمائی پاس تھی، مکتب داری کا شغل لے بیٹھے، کچھ روز کو متھرا گئے پھر لوٹ آئے یہاں قلعہ دار مرہٹہ "بہاؤ" تھا، اس نے بلایا اور آپ سے پڑھنا شروع کیا یہاں سے چھٹے تو نواب محمد علی خاں جو امرائے آگرہ سے تھے مکان مائی تھان میں تھا، ان کے یہاں لڑکوں کو پڑھانے جانے لگے یہیں سے لالہ بلاس رائے کھتری سے راہ و رسم ہو گئی، جب نواب کے یہاں سے جدا ہوتے تو رائے صاحب نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے بچوں کو سپردگی میں دیا اور ان کی جملہ ضروریات کی کفالت اپنے ذمہ لی۔ لالہ کے چھ لڑکے من سکھ رائے، گوربخش، مولچند، بنسی دھر اور شنکر داس زیر تعلیم تھے۔

نظیر نے عمر کا بڑا حصہ معلمی میں گزارا، شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے ان میں حکیم میر قطب الدین باطن مولف تذکرہ گلستان بے خزاں (المعروف بہ نغمۂ عندلیب) شیخ مداری ضمیر، خود نظیر کے صاحبزادے گلزار علی اسیر، مہاراجہ بلونت سنگھ، راجہ لالہ بدھ سین صافی، حکیم میر محمدی ظاہر، شیخ حسین بخش بخشی، شیخ نبی بخش عاشق، منشی حسین علی خاں لہجہ، بیدار بخش لہر وغیرہ قابل ذکر ہیں، صاحب گلستان بے خزاں نے مرزا غالب کو بھی نظیر کے شاگردان رشید کی فہرست میں داخل کر دیا ہے، لیکن یہ چیز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی، پروفیسر شہباز نے تلمذ غالب کے متعلق متضاد بیانات جمع کر کے، آخری رائے یہ دی ہے کہ غالب جس زمانے میں اکبرآباد میں مقیم تھے، وہ ان کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا اور اس زمانہ میں آگرے کے ممتاز ملاؤں میں صرف وہی شخص خلیفہ معظم اور میاں نظیر تھے:

۱۲۴۳ھ میں فالج میں مبتلا ہوئے، مکتب داری شغل تھا، مجبور رہے، میاں گلزار علی اسیر ایسے بدشوق تھے کہ گلستان و بوستان سے آگے بڑھنے کی قسم کھا رکھی تھی جوان ہونے کو آئے، میاں نظیر نے ان کو بلایا اور کہا بیٹا اب یہ مکتب داری کا کام سنبھالو، ورنہ کہاں سے گذر اوقات ہوگی؟ وہ بولے میں فارسی کے منتہی طلبا کو کیسے درس دے سکتا ہوں، کوئی ابوالفضل پڑھتا ہے، کوئی قصائد بدر چاچ کا سبق لیتا ہے، میاں میں کیا پڑھا سکتا ہوں وہ بالاکڑائی بھاری آواز میں بولے، جاؤ میاں، خدا کا نام اور پڑھاؤ، چنانچہ یہ پڑھانے گئے اور ہر ایک طالب علم کو بخوبی تعلیم دیتے گئے اس دن سے اسیر ان کی ولایت کے قائل ہو گئے ۹۸ سال کی عمر ہو گئی تو ۲۴ صفر ۱۲۳۶ھ، مطابق ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو انتقال ہوا، امامیہ طریق پر تجہیز و تکفین ہوئی نماز جنازہ دو مرتبہ پڑھائی گئی، سنیوں نے علیحدہ پڑھی، ہندو مسلمان ہزارہا شریک تدفین تھے اپنے مکان ہی میں زیر نیم دفن کئے گئے، زمین دوز قبر پختہ بنوا دی گئی جو آج شکستہ حالی پر شبہ پڑھ رہی ہے۔

سالانہ عرس ہوتا تھا بے نواؤں کا مجمع ہوتا تھا، موسیقی نواز آتے تھے اور رات بھر یہ میلہ رہتا تھا، اب بند ہو گیا ہے:

ہے تاج گنج میں اب تو نظیر کا میلا
نظیر کیا کہ عجب ہے نظیر کا میلا

میاں نظیر کے ایک صاحبزادے خلیفہ سید گلزار علی اسیر اور ایک دختر امانی بیگم تھیں، جو میر تفضل علی عرف مرزا جان کو بیاہی گئی تھیں، ان ہی کی صاحبزادی ولایتی بیگم تھیں جن سے حضرت شہباز نے میاں نظیر کے حالات معلوم کئے تھے، میاں اسیر کی خواجگان وہنکوٹ کے یہاں شادی ہوئی، ان سے میاں نثار علی پذیر اور مصاحب بیگم تھیں جو مرزا آغا علی، ساکن تاج گنج کو بیاہی گئی تھیں، وارد مرزا نوازش علی بیگ ولایتی بیگم کے ہی داماد تھے:

تیلری کی زندگی کے بالاجمال حالات معلوم ہو جانے کے بعد اتنا تو آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ وہ بہت ہی زودگو اور چھوٹے بڑے ہر طبقے کی زبان اور ہر سوسائٹی کی معیاری بول چال کے ادا کرنے میں شانِ استادی کا مالک تھا۔ اب ذرا چلتے چلتے اس کے ادبی چٹخارے کا تھوڑا سا حظ اور اٹھا لیجیے وہ کہتا ہے :

بحرِ ہستی میں صحبتِ احباب!
یوں ہے جیسے بروئے آب حباب

سحر ہم نے چمن اندر جو نہی دیکھا گل اک دلبر
سہی قامت، پری پیکر، مقطع وضع خوش منظر

یک سرِ مو تو پریشاں نہ ہوا ہے کاکلِ یار
ہم ترے دام میں آ کر نہیں جانے والے
زیادہ اس سے اب لنخاتے ور دکیا ہوگا
کہ جان آنکھوں میں آ آ گئی پر آہ نہ کی

جب کہ الٹی ہم نے تو ازنظر پیا سیتیں
کھینچ لی اس نے رُخِ رشکِ قمر پا ستیں
اس پری رو کے دوانے کی ہے بے شکل لباس
"تار دامن خار پر شاخِ شجر پیا سیتیں!

تجھے کیا فصلِ گل ہے یا زمانِ خار ہو ساقی
تو خود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی

اے وصفِ مژگاں تکلّف برطرف
دیکھئی کیا ہے اُلٹ دے صف کی صف

دیکھ وہ گورا سا مکھڑا رشک سے
پڑ گئے ہیں ماہ کے مُنہ پر کلّف

اُٹھاویں نازاں کے ہم نہ کیوں کر، نظیرؔ دل سے کہ جن کے ہوویں
جفا، تلطف، عتاب، شفقت، غضب، توجہ، ستم، نوازش

شرمندہ رفو نہیں عاشق کا چاکِ جیب
کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا

آج تو خوش پر نہیں بُلبُل کو یہ معلوم
کل سر کو پٹکتا ہے چمن کی روشوں سے

کل شبِ وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں
آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے

کہتے ہیں جس کو زندگی، دم کی ہوا ہے اے نظیرؔ
ہم کو تو آج کھل گیا عقدہ یہ اک جناب[1] سے

ہماری رُوح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں
نظیرؔ اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

---

[1] جناب سے مراد شاید کوئی مجتہد صاحب ہوں گے، شیعوں کے یہاں اصطلاح میں "جناب" کا لقب مجتہد ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے (ر - ا - ج)

مر بھی جاویں گے تو جز پیرہن عریانی
آپ سے ہم نہیں لینے کے کفن یاد رہے

گل سے کوئی کہے کہ شگفتن سے باز آ
اس کو تو پھولنا ہے، نہ پھولے تو کیا کرے
جو ناقبول شے سے بنایا قبول کو!
پھر اس کو وہ بھلا نہ قبولے تو کیا کرے

آ گئے تھے سیر کرتے، تم کو دیکھا خوش ہوئے
اب خدا حافظ ہے ہم اے یار رخصت ہو چلے
گل رخوں کی بزم میں کیا بیٹھتے ہو اے نظیرؔ
تم بھی رخصت ہو کہ اب سب یار رخصت ہو چلے

ہمارے قطرۂ اشک اس کی سرد مہری سے
کسی زمانے میں موتی تھے، اب تو اولے ہیں

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم[1]

---

[1] کلیات نظیر اکبر آبادی، مرتبہ عبدالباری آسی مرحوم

نظیر بارگاہِ رسالت مآب میں

تم شہِ دنیا و دیں ہو یا محمدؐ مصطفےٰ
سرگروہِ مسلمیں ہو یا محمدؐ مصطفےٰ
حاکمِ دینِ متیں ہو یا محمدؐ مصطفےٰ
قبلہ اہلِ یقیں ہو یا محمدؐ مصطفےٰ
رحمۃ للعالمیں ہو یا محمدؐ مصطفےٰ

آسماں تم نے شبِ معراج کو روشن کیا
عرش و کرسی کو قدم اپنے سے دے نور و ضیا
رنگ و بو گلشن کے جنت کی بڑھائی برملا
جس جگہ وہمِ ملائک کو نہیں ملتی ہے جا
واں کے تم مسند نشیں ہو یا محمدؐ مصطفےٰ

ہے تمہاری پشت پر مہرِ نبوت کا نشاں
اور تمہارا وصف ہے طٰہٰ و یٰسیں میں عیاں
معجزے جو ہیں تمہارے ان کا کب ہووے بیاں
کشورِ اعجاز جو ہے اس کے تم باعز و شاں
صاحبِ تاج و نگیں ہو یا محمدؐ مصطفےٰ

تم کو ختم الانبیاء حق بھی حبیب اپنا کہے
اور سدا روح الامیں آئے با ادب سے ہی چلے

کس نبی کو یہ مدارج ہیں تمہارے سے ملے
ہے نبوت کا جو اقدس بحر تم اس بحر کے
گوہر یکتا ثمین ہو یا محمد مصطفیٰ

ہیں جو یہ دو نو جہاں کی آفرینش کے چمن
جس میں کیا کیا کچھ عیاں ہیں شئے خالق کے جتن
باعث خلق ان کے ہو تم یا حبیب ذوالمنن
اور ماک مطلع پڑھوں میں ہیں سے جس کے سخن
سو سعادت کے ستارے ہو یا محمد مصطفیٰ

(مطلع ثانی)

تم ظہور اولیں ہو یا محمد مصطفیٰ
ہم دم جان آفریں ہو یا محمد مصطفیٰ
وجہ قرآن مبیں ہو یا محمد مصطفیٰ
نزہت بستان دیں ہو یا محمد مصطفیٰ
زینت خلد بریں ہو یا محمد مصطفیٰ

احمد مختار ہو تم پادشہ ہر دو سرا
ہے تمہارے حکم کے تابع قدر بھی اور قضا
خلق ہیں خواہش سے تم جس امر کی رکھو بنا
دیر اک پل درمیاں آوے تو یہ امکان کیا
جس گھڑی چاہو وہیں ہو یا محمد مصطفیٰ

آپ کے نقش قدم سے جو مشرف ہو زمیں
دیکھتا ہے اس کی رفعت رات دن عرش بریں
راز تو خلقت کے تم کو ہی کھلے ہیں شاہ دیں
اور جو جو کچھ کہ ہیں اسرار رب العالمیں
سب کے تم برحق امیں ہو یا محمد مصطفےٰ

آپ کا فضل و کرم کونین میں مشہور ہے
اور تمھیں ہر طور سے لطف و کرم منظور ہے
حشر میں گرچہ سزا ملنے کا بھی دستور ہے
کیا ہوا لیکن دل اس امید سے مسرور ہے
تم شفیع المذنبیں ہو یا محمد مصطفےٰ

مخبر صادق ہو تم اور حضرت خیر الورا
سرور ہر دو سرا اور شافع روز جزا
ہے تمھاری ذات والا منبع لطف و عطا
کیا نظیر اک اور بھی سب کی مدد کا آسرا
یاں بھی تم واں بھی تمھیں ہو یا محمد مصطفےٰ

اقرار باللسان و تصدیق بالقلب

رکھ اپنے دل میں اے آدم کے بن کلمہ محمد کا
اور اپنی انگلیوں اوپر بھی گن کلمہ محمد کا
پڑھے ہیں سب پری اور دیو جن کلمہ محمد کا
مسلماں ہو تو مت بھول ایک چھن کلمہ محمد کا

پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

میاں یہ کلمۂ طیب تو شفیع المذنبیں کا ہے
خدا کے دوست برحق رحمۃ للعالمیں کا ہے
محمدؐ مصطفےٰ یعنی کہ ختم المرسلیں کا ہے
بھروسا آسرا تکیہ بھی یہ دنیا و دیں کا ہے

پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

اسی کلمہ سے کھلتا ہے سدا جنت کا ہر اک در
یہی کلمہ لکھا ہے عرش اور کرسی کے ماتھے پر
اسی کلمہ کو پڑھتے ہیں چمن کے پھول سب کھل کر
یہ سب کلموں سے ہے بہتر یہ سب کلموں سے ہے برتر

پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

اسی کے نور سے خورشید کہلاتا ہے نورانی
اسی کلمہ کے باعث چاند کی روشن ہے پیشانی
اسی کلمہ کے باعث دین و دنیا میں ثناخوانی
اسی کلمہ کو پڑھتے ہیں فلک ارض اور پون پانی

پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

اسی کلمے سے ہیں سارے دل زمیں و آسماں روشن!
مہ و خورشید تارے عرش و کرسی لامکاں روشن
اسی کلمے سے ہیں جنت کے باغ و باغباں روشن
غرض جنت تو کیسی اس سے ہیں دونوں جہاں روشن

پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

یہ وہ کلمہ ہے جس کا ہے رہا ارمان نبیوں کا
اسی کلمہ کے پڑھنے سے گئے ہیں لوگ عارف ہو

اسے حور و ملک غلماں پڑھتیں ہیں ہر لمحہ منہ دھو
وہ بے شک جنتی ہیں ایک باری جو پڑھیں اس کو!
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

اسی کلمے کی برکت سے تو اب یاں بھی سلامت ہے
اگر یاں سے تو جاوے گا تو واں پھر بھی سلامت ہے
پڑھے گا جو اسے اس کا دل و جاں بھی سلامت ہے
اسی کی عاقبت بھی خیر، ایماں بھی سلامت ہے
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

چلے گا جس گھڑی تو چھوڑ کر یہ عالم فانی
پڑے گا قبر کے جا کر اندھیرے میں جو زندانی
نکیر و منکر اگر جب کریں گے تجھ پہ طغیانی
یہی کلمہ کرے گا واں تری مشکل کی آسانی
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

اسی کلمے نے عزرائیل کی ہیبت کو ٹالا ہے
اسی کلمے نے تنگی کو لحد کی کھول ڈالا ہے
پڑے گا قبر کا تجھ پر میاں وہ دن جو کالا ہے
یہی کلمہ ترا واں بھی اندھیرے کا اُجالا ہے
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

صف محشر میں جب دہشت کا تجھ پر وار اترے گا
یہی کلمہ ترا اس جا رفیق و یار اترے گا!
گناہوں کا ترا جتنا ہے بوجھ اور بھار اترے گا
اسی کلمہ کی دولت سے میاں تو پار اترے گا
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

میاں جب پل صراط اوپر تو اپنا پیر ڈالے گا
تو وہ تلوار کی ہو دھار تیرا پاؤں کھالے گا
لگے گا جب وہاں گرنے تو یہ کلمہ بچالے گا
یہی بازو پکڑلے گا یہی تجھ کو سنبھالے گا!
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

سوا نیزے کے اوپر جب کہ ہو گا آفتاب آیا
ہر اک گرمی کی تابش سے پھرے گا سخت گھبرایا
پڑے گا جب ترے تن پر بھی شعلہ اس کا گرمایا
یہی کلمہ چھتر بن کر کرے گا تجھ پہ واں سایہ
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

تلیں گے جب وہاں سب کے عمل میزاں کے پلے پر
ہو بکھے ہیں پڑیں گے آتشیں گرزاں کے کلے پر!
تجھے تولیں گے جس دم اس ترازو کے محلے پر
یہی کلمہ میاں واں بھی ترا ہووے گا پلے پر
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

جو پورے ہیں میاں ان کی تو ہو گی گرم بازاری
کمی ہے جنس جس کی اس کی ہو گی واں بڑی خواری
ترا پلہ بھی جب کرنے لگے گا واں سبک ساری
یہی کلمہ بناوے گا ترے پلے کو واں بھاری
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

پڑے گا تشنگی کا شور اس میداں میں جب آکر
پھریں گے پانی پانی کرتے مارے پیاس کے اکثر
تری بھی جب لگے گی سوکھنے تالو زباں یکسر

یہی کلمہ تجھے پانی پلاوے گا میاں بھر بھر
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

یہی کلمہ تجھے دیدار حق کا بھی دکھاوے گا
محمدؐ کی شفاعت سے بھی تجھ کو بخشواوے گا
بہشتی کر کے حُلے نور کے تجھ کو پہناوے گا
بڑی عزّت حرمت سے جنت میں لے جاوے گا
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

یہی کلمہ تجھے واں جام کوثر کا پلاوے گا!
یہی کلمہ تجھے گلزار جنت کا دکھاوے گا
یہی کلمہ ترا منہ چاند سا روشن بناوے گا
یہی کلمہ ترے بوقت واں پر کام آوے گا
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

یہی کلمہ نجات اور مغفرت کا ہے ترے چارہ
اسی کلمے سے ہوگی روح تیری عرش کا تارا
اسی کلمے سے ہے ہم سب گنہگاروں کا چھٹکارا
اسی کلمے سے ہوگا دین اور دُنیا کا نستارا
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

میاں اب یہ جو کلمہ ہے تو حق کی خاص رحمت ہے
یہ صدقے سے رسول اللہ کے ہم پر عنایت ہے
اسی سے یاں نظیر عزت اسی سے واں شفاعت ہے
یہی سب مومنوں کے واسطے افضل عبادت ہے
پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمدؐ کا

ذوقؔ کا ذوقِ نعت

ذوقؔ بہادر شاہ ظفرؔ آخری مغلیہ فرماں روا کے اُستاد تھے، قصائد میں خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ خاقانیِ ہند کہا جاتا ہے اُنہوں نے اپنے ممدوح بہادر شاہ اور ان کے والد اکبر شاہ اور دُوسرے امراء و رؤسا اور اکابر کی شان میں بڑے طویل اور پُرزور قصیدے کہے ہیں، اور اپنے زورِ کلام کی دھاک بٹھا دی ہے لیکن حمد و نعت میں جو کچھ کہا ہے، وُہ صرف یہ ہے!

ہُوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا
الفِ الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

رہے نامِ محمدؐ لب پہ یارب اوّل و آخر
اُٹھے جاتے بوقتِ نزع جب سینہ میں دم میرا

محبت اہلِ بیتِ مصطفٰےؐ کی نورِ برحق ہے
کہ روشن ہو گیا دل شکلِ قندیلِ حرم میرا

دکھائی مجھ کو راہِ شرع اصحابِ پیمبرؐ نے
چراغِ راہ ہے، اکرام اصحابِ کرم میرا

کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا
کہ ہے دُرِ نجف ہو کر چمکتا دُرِّ یتیم میرا

رہے گا دانہ افشاں مزرعِ امیدِ بخشش میں
غمِ آلِ نبیؐ سے دانۂ ہر اشکِ نم میرا

شہِ بغداد کا خطِ غلامی ذوقؔ لکھتا ہوں
نہ کیوں دل اس خطِ بغداد سے ہو جامِ جم میرا

داغؔ کا نعتیہ کلام

داغؔ دلّی کے رہنے والے تھے، نواب شمس الدین خاں کے فرزند، تربیت اور تعلیم لال قلعہ میں ہوئی، بہادر شاہ کے ولی عہد مرزا فخرو سے ان کی والدہ نے بیوہ ہونے کے بعد عقدِ ثانی کر لیا تھا، یعنی سخن خاقانیِ ہند ذوقؔ سے حاصل کیا، اپنے رنگ کے یکتا شاعر تھے

لطفِ زباں ان پر ختم تھا، ان کا خاص رنگ سہل ممتنع تھا، جو کچھ کہتے تھے، روزمرہ کی زبان میں، معلوم ہوتا باتیں کررہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام گلی گلی اور کوچہ کوچہ پھیل گیا، خانقاہ و مکتب میں بھی ان کی غزلیں پڑھی جانے لگیں اور بزم ناؤنوش میں بھی ان کا کلام گایا جانے لگا:

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد یہ بھی مبتلائے مصیبت ہوئے، لیکن بالآخر بچ گئے دلی سے نکلے رام پور پہنچے، وہاں داروغہ اصطبل ہوتے، کسی من چلے نے کہا:

آیا دلی سے ایک شاعر

آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

نواب رامپور نے خوب خوب قدر افزائی کی، عیش سے زندگی کے دن کٹنے لگے ان کا انتقال ہوا تو حیدرآباد پہنچے، وہاں کافی عرصہ تک امیدواری کرتے رہے پھر نظام دکن کے دربار سے سرفرازی ہوئی، استاد نظام اور درباری شاعر بن گئے، گراں قدر مشاہرہ مقرر ہوا، خطاب ملا، جاگیر ملی، عزت بڑھی، شہرت میں اضافہ ہوا:

داغ کے چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے رنگ میں منفرد ہیں، منتخبہ کلام کا نمونہ یہ ہے:

——— حمد و نعت: ———

یارب ہے بخش دینا بندے کو کام تیرا

محروم رہ نہ جائے کل یہ غلام تیرا

بے چون و بے چگوں ہے بے شبہ ذات تیری

واحد، احد، صمد ہے اللہ نام تیرا

یہ داغ بھی نہ ہوگا تیرے سوا کسی کا

کونین میں ہے جو کچھ وہ ہے تمام تیرا

ایمان کی کہیں گے، ایمان ہے ہمارا

احمد رسول تیرا، مصحف کلام تیرا

شمس الضحیٰ محمدؐ، بدر الدجےٰ محمدؐ
ہے نور پاک روشن ہر صبح و شام تیرا

ہیں کلمہ گو ہوں خاص خدا و رسولؐ کا
آتا ہے بام عرش سے مژدہ قبول کا

دونوں جہاں ہیں بوئے محمدؐ سے عطر بیز
کونین ہیں ہے رنگ فقط ایک پھول کا

ـــــــ : یا مصطفےٰ : ـــــــ

کر و غم سے آزاد یا مصطفےٰ
تجھی سے ہے فریاد یا مصطفےٰ

نہ پامال مجھ کو زمانہ کرے
نہ مٹی ہو برباد یا مصطفےٰ

زباں پر ترا نام جاری رہے
کرے دل تری یاد یا مصطفےٰ

نہ چھوٹے کبھی مجھ سے راہ صواب
نہ ہو ظلم و بیداد یا مصطفےٰ

عطا مجھ کو اللہ ہمت کرے
بجا لاؤں ارشاد یا مصطفےٰ

رہوں حشر میں آپؐ کی ذات سے
طلبگار امداد یا مصطفےٰ

عنایت کی ہو جائے اس پر نظر
رہے داغ دل شاد یا مصطفےٰ

۴

اقبال کے عہد کا نعتیہ کلام

○

ظفر علی خان

○

بہزاد لکھنوی

○

حمید صدیقی

اقبال کے عہد کا نعتیہ کلام

اقبال سے پہلے کی ـــــ فارسی اور اردو ـــــ نعتیہ شاعری پر، ہم اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ نظر ڈال چکے ہیں، اب قبل اس کے کہ ہم اصل موضوع یعنی اقبال اور ذکرِ رسول پر گفتگو کا آغاز کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ اقبال کی نعتیہ شاعری پر بھی ایک نظر ڈال لیں:

اقبال کی شاعری سے پہلے کا دور سیاسی اعتبار سے، ادبار و انحطاط کا دور تھا، قوم تباہ ہو رہی تھی، مٹ رہی تھی، حکومت ہاتھ سے جا چکی تھی، اقتدار و اختیار کا دور ختم ہو چکا تھا، محکومی اور غلامی کے عہد کا آغاز ہو چکا تھا، ایک عجیب قسم کا اضمحلال، انفرادی اور اجتماعی زندگی پر چھایا ہوا تھا، عالمِ اسلام کے حصے بخرے ہو رہے تھے، حجازِ مقدس اور سرزمینِ عرب پر فرنگی استیلا شروع ہو چکا تھا، لیکن مسلمانوں پر خود فراموشی کا عالم طاری تھا وہ خاموشی بلکہ بڑی حد تک غیر جانب داری کے ساتھ یہ ہنگامہ آرائیاں اور تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے، فن کاروں پر جمود طاری تھا، اہلِ علم اپنا قلم توڑ چکے تھے جن کی نوا سنجیوں کی دھوم تھی ان پر سکوتِ مرگ طاری تھا، سارا ملی نظام مختل تھا، اس عالم میں اگر مذہبیت کا چراغ بھی ٹمٹماتا ہوا نظر آتا ہے، تو مقامِ حیرت نہیں، ہونا بھی چاہیے تھا:

لیکن اقبال کی شاعری نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں، وہ بڑا پُرآشوب زمانہ تھا اور پاکستان و بھارت کے مسلمانوں میں ایک نیا شعور انگڑائیاں لے رہا تھا، ملّتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے تین گراں مایہ ہستیاں تقریباً بیک وقت عالمِ وجود میں آئیں، یعنی محمد علی، ابوالکلام اور اقبال، ان تینوں نے اپنے اپنے حدود کے اندر، اپنے اپنے طرز و اسلوب سے، اپنے اپنے رنگ میں ملّت کو ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا، ایک نیا جذبہ عطا کیا، ایک نئی روح پیدا کی، اگر محمد علی کی شعلہ نوائیاں، ابوالکلام کی آتش مقالیاں، اور اقبال کی سحر خوانیاں تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دی جائیں تو گزشتہ ۳۰ ـ ۴۰ سال کی

قیامت خیز، آتش بدوش اور ہنگامہ پرور تاریخ کے صفحات سادہ رہ جاتیں گے، ہندوستان کی آزادی ادھوری رہ جاتی، پاکستان کا قیام ناممکن نظر آتے گا۔ ملت اسلامیہ کی خودنگری، خودشناسی اور تجدید احیا کا افسانہ داستان پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھے گا یہی آئمہ ثلاثہ تھے جنہوں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کیا اور انہیں ایک نئی زندگی اور نئے جذبہ سے روشناس کیا۔ یہ نہ ہوتے تو مسلمان قال اقول، اور قیل وقال میں اُلجھے رہتے، قبائے خلافت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اُڑتی رہتیں، اور وہ کچھ نہ کر سکتے، زمانہ کا طوفان انہیں زیر وزبر کر دیتا اور وہ خاموشی کے ساتھ مٹ جاتے:

ان تینوں بزرگوں میں، سب سے زیادہ دیرپا، ہمہ گیر اور ناقابلِ فراموش اثر اقبال کا ثابت ہُوا اقبال کی شاعری نوائے پریشاں بنی رہی لیکن بہت جلد اس نے قلبِ مسلماں کے دروازے پر دستک دی اور اس میں داخل ہوگئی، اقبال کے منہ سے نکلے ہوئے موزوں بول، گو ردیف وقافیہ کے پابند اور شعرو شاعری کے قالب میں ڈھلے ہوئے تھے، لیکن ان میں وہ اثر تھا، وُہ قوت تھی، وہ بے پناہ جذبہ تھا جس نے مسلمان کو مسلمان بنا دیا:

اقبال کی شاعری نے سب سے زیادہ اثر، مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر کیا یہ وُہ گروہ تھا جو مذہب سے نا آشنا تھا، قومیت کے مفہوم سے بیگانہ تھا، ملت کا ناموس اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، اسے اپنے اسلاف واکابر کے نام تک نہیں معلوم تھے، کارنامے کیا معلوم ہوتے، اس نے فرنگی تعلیم پائی تھی اور اسی سانچہ میں ڈھل کر ذہن ودماغ کے اعتبار سے یہ خود سرتاپا فرنگی بن گیا تھا، بقول اکبر؃ بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے واقعی تعلیم بدل جانے سے دل بدل گئے تھے، ضمیر بدل گئے تھے ہر چیز بدل گئی تھی، لیکن اقبال کی حدی خوانیوں نے اس کا رُخ بدل دیا، اقبال کی دُعا پوری ہوگئی:

ے یارب! دلِ مسلم کو وُہ زندہ تمنا دے

جو روح کو گرما دے، جو قلب کو تڑپا دے

پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرّہ کو چمکا دے

پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل

اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

مسلمانوں کا وہ تعلیم یافتہ طبقہ جو مذہب سے منحرف، ملت سے بیگانہ اور قوم سے ناآشنا ہو چکا تھا، اقبالؔ کی نوا سنجیوں اور حدی خوانیوں سے متاثر ہو کر اپنی حقیقت، اپنے اسلاف کی قدر و قیمت اپنی تاریخ کے جوہر اور اپنی قوم کی صلاحیت سے واقف ہو گیا:

یہاں سے مذہبیت کا نیا اور نہایت شاندار دور شروع ہوتا ہے اور اس کا سہرا اقبالؔ ہی کے سر ہے:

زندگی کی اس تبدیلی اور مقصدِ حیات کے اس تغیر نے جہاں صحیح قسم کا مذہبی اور ملی شعور پیدا کیا وہاں صحیح قسم کا مذہبی جذبہ و جوش بھی پیدا کیا، یہ جذبہ اور جوش زندگی کے ہر شعبہ میں رواں دواں اور کارفرما نظر آنے لگا — سیاست میں، تعلیم میں، تاریخ میں، معاشیات میں، قومی اور ملی زندگی میں، روزمرہ کے حوادث میں، یہاں تک کہ آرٹ اور فن میں بھی، آرٹ اور فن میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی، وہ شاعری تھی —

اب گل و بلبل کی داستانیں، داستانِ پارینہ بن گئی، اب زلف و کمر کے افسانے فراموش ہو گئے، اب انگیا اور چوٹی کی باتیں وقفِ طاقِ نسیاں ہو گئیں، اب صاف سیمیں اور ساعد بلوریں کا تذکرہ ممنوع قرار پایا، شاعری بدل گئی، صرف شاعری ہی نہیں بدلی، شاعری کا مزاج بدل گیا، اس کے کردار میں تبدیلی ہوئی اس کا موقف متغیر ہو گیا اس کا مرکزی نقطہ بدل گیا اشعار میں قومیت کی جھلک، غزل میں قومیات کا رنگ نظم میں ملت کی داستان، عقیدے میں قوم کی تاریخ شاعروں اور آرٹسٹوں کا فن بن گئی:

اس دور کی شاعری کی یہ بنیادی تبدیلی نظرانداز نہیں کی جا سکتی، ضروری ہے کہ اس دور کے نعتیہ کلام پر بھی، ہم ایک مختصر سی نظر ڈال لیں کہ بغیر اس کے ہم اقبال کو، اور اس کے جذبہ کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکیں گے؛

اقبال کے دور میں یا ان کے آخری دورِ حیات میں جن لوگوں نے اس طرف توجہ کی، یوں تو ان کی تعداد بہت کافی ہے لیکن ان میں تین آدمی ایسے ہیں جنہیں اگر نظرانداز کر دیا جائے تو بڑی زیادتی ہوگی، ہماری مراد مولانا ظفر علی خاں، بہزادؔ لکھنوی اور زائرِ حرم حمید صدیقی ہیں، ان میں سے ظفر علی خاں، اقبال کے معاصر ہیں، بہزاد اقبال کے دور سے تعلق رکھتے ہیں اور حمید صدیقی، اقبالؔ کے آخری دورِ حیات، بلکہ ان کی وفات کے بعد پڑھے اور لکھے ہیں لیکن ان تینوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے دور میں نعت گوئی کا صلہ، قبولِ عام خراجِ تحسین

اور لطفِ سخن کی صورت میں عوام سے وصول کرچکا ہے ——— ! اور اب ہم مذکورہ تینوں شاعروں کے کلام کا نمونہ آپ کی خدمت میں پیش کریں گے :

مولانا ظفر علی خاں

ظفر علی خاں ایک قومی لیڈر اور سیاسی بازی گر کی حیثیت سے، نیک نام بھی ہیں اور بدنام بھی، ان کا سیاسی مسلک تو چلتی پھرتی چھاؤں کی طرح ہمیشہ تغیر پذیر رہا آج کچھ، کل کچھ، آج خلافت کے نقیب، کل اس کے حریف، آج کانگرس کے علمبردار، کل اس کے نکتہ چیں، آج احرار کے سرپرست، کل اس کے مخالف، آج نیلی پوش تحریک کے روح رواں، کل اس کے نوحہ گر اور مرثیہ خواں ان کی زندگی کی طرح ان کے مسلک میں بھی سیماب وشی جاری و ساری رہی :

لیکن ظفر علی خاں کو جو چیز غیر متبدل اور غیر تغیر پذیر ہے، وہ ان کا عشقِ رسولؐ ہے انہیں ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق ہے اور یہ عشق ان کے ایک ایک شعر سے، ایک ایک مصرعہ سے، ہر لفظ سے پھوٹا پڑتا ہے، اس میں خلوص ہے اور نہایت شدید خلوص، اس میں جوش ہے اور نہایت غضب کا جوش، اس میں زور ہے اور سیل بے پناہ سے زیادہ زور، اس میں دل کا گداز ہے، روح کی تڑپ ہے نیت کا خلوص ہے، ظفر علی خاں ابھی زندہ ہیں (اور خدا انہیں مدتوں زندہ رکھتے) لیکن ان کی سیاست مر گئی، ظفر علی خاں مر جائیں گے (اور خدا انہیں عمر خضر نصیب کرے) لیکن ان کی شاعری خاص طور پر نعتیہ شاعری کبھی نہیں مرے گی جب تک اردو زبان زندہ ہے، اس وقت تک ظفر علی خاں کی شاعری اور خاص طور پر نعتیہ شاعری، زندہ رہے گی ———۔

ظفر علی خاں[ل] نے مدح رسولؐ میں بلا مبالغہ ہزاروں اشعار اور سینکڑوں نظمیں کہی ہیں، مشتے نمونہ از خروارے پیش کیا جائے تو بھی ایک طویل و ضخیم مجلد کی ضرورت ہے، ہم زیادہ سے زیادہ اختصار سے کام لے کر ان کے نعتیہ کلام کا نمونہ آئندہ صفحات میں پیش کرتے ہیں :

ل ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو انتقال کیا۔

خواجۂ دو جہاںؐ

اے کہ ترا شہود ہے وجہ نمودِ کائنات
اے کہ ترا فسانہ ہے زینتِ محفلِ حیات
اے کہ ہیں تیری ذات میں جمع زمانہ کے صفات
سب ملکی تصرفات، سب فلکی تجلیات
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات

بادۂ معرفت سے جب تم نے بھرا خمِ الست
بزم میں آ کے جھک پڑے سارے جہاں کے مے پرست
تھا یہ عجیب انتظام، تھا یہ عجیب بندوبست
ہو گئے مست ہوشیار بن گئے ہوشیار مست
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات

گردنِ خلق ایک ساتھ جھک گئی رب کے سامنے
چون و چرا نہ چل سکا اصل سبب کے سامنے
گرد ہوائی ہے کیمیا، خاکِ عرب کے سامنے
تو نے یہ گنجِ شائیگاں رکھ دیا سب کے سامنے
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات

سارے جہاں کی حکمتیں تیرے کلام پر نثار
سارے جہاں کی دولتیں تیرے نظام پر نثار
ہم تیری ذات پر فدا، ہم تیرے نام پر نثار
تیری گلی میں ہوں مقیم، تیرے مقام پر نثار
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات

سرورِ کائنات

اے کہ ترا جمال ہے زینتِ محفلِ حیات
دونوں جہاں کی رونقیں ہیں ترے حسن کی زکوٰۃ

تیری جبیں سے آشکار، پرتوِ ذات کا فروغ
اور ترے کوچہ کا غبار سرمۂ چشمِ کائنات

بارگہِ الست سے بخش دیئے گئے تجھے
سب ملکی تصرفات، سب فلکی تجلیّات

چہرہ کشا کرم ترا، قاف سے تا بہ تیہ داں
لطف ترا کرشمہ سنج کعبہ سے تا بہ سومنات

تیرے سلام کے لیے گلشنِ قدس کے طیور
گھومتے ہیں ڈال ڈال جھومتے ہیں پات پات

دیکھتے ہی ترا جلال کفر کی صف اُلٹ گئی
جھک گئی گردنِ ہبل، ٹوٹ گیا طلسمِ لات

آنکھ کے اک اشارہ سے تو نے بدل دیئے
ذہن کے سب تصورات، قلب کے سب تاثرات

چون و چگونہ و چرا تا بہ کجا و تا بہ کے
حل کئے ایک بات میں آپ نے یہ سرمدی نکات

کیا ہی بڑا انقلاب تھا ڈھل گئے جس میں ایک ساتھ
ترک و عرب و روس و دمشق، یمن و دہلی و ہرات

از سرِ نو کیا گیا وحدتِ آدم ارجمند :
اٹھ گئی قیدِ خون و رنگ مٹ گیا فرقِ نسل و ذات

شبِ معراج

اپنے اللہ سے ملنے کے لیے جاتا ہے
اپنے اللہ کا منظورِ نظر آج کی رات
ماہ و انجم نے سرِ راہ بچھا دیں آنکھیں
کیوں کہ ہے ناقۂ امیؐ کا سفر آج کی رات
کہکشاں جلوہ فشاں ہے کہ اسی رستہ سے
ہونے والا ہے محمدؐ کا گذر آج کی رات
چاند کیا چیز ہے سورج کی حقیقت کیا ہے
پرتوِ نور سے روشن ہے نظر آج کی رات
مل گئی دونوں جہانوں کے خزانوں کی کلید
اپنی معراج کو پہنچا ہے بشر آج کی رات
فرش اس کے لیے بن جائے گا ہم پایۂ عرش
اور ثریا سے بھی ہے تو برتر ز ثریا ہوگا
دل میں جلوے اسے نادان کے آئیں گے نظر
اور دماغ اس کے لیے سینۂ سینا ہوگا
شیوۂ مصطفوی سیکھ وگرنہ اسلام
تجھ کو مسلم سببِ نازشِ بےجا ہوگا
کشورِ ہند میں گنگا کے بہانے والو!
کہیں اک چشمۂ زمزم بھی اُبلتا ہوگا

اُمت پہ رسُول کا احسان

ہم خاک تھے حضور نے اکسیر کر دیا
کتنا بڑا حضور کا احسان ہوگیا

بھر کر دیا وہ جام جہاں بیں حضور نے
پی کر گدا اسے سے کرہ سُلطان ہو گیا

اسلام کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
بجلی گری وُہ دل پہ کہ فاران ہوگیا

رونقِ بزمِ دودۂ آدم

رونقِ بزمِ دودۂ آدم صلے اللہ علیہ وسلم
خواجۂ گیہاں سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم

جادہ شناسِ منزلِ وحدت جلوہ نمائے نورِ حقیقت
ہادیٔ اکبر مصلحِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم

خیرِ مجسّم فضلِ مجسّم صورتِ احساں پیکرِ رحمت
آیۂ لطفِ ربک الاکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ہوگئی اس پر ختم رسالت دیتے گئے ہیں جس کی شہادت
موسیٰ عمراں، عیسےٰ مریم صلی اللہ علیہ وسلم

خیلِ ملک تھا اس کے جلو میں یعنی قضا کا رخش تھا زیں
تا کہ جہاں ہو در ہم و برہم صلے اللہ علیہ وسلم

صاحبِ قابَ قوسین اَو اَدنیٰ

دل جس سے زندہ ہے وُہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو

پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اس نورِ اولیں کا اُجالا تمہی تو ہو :

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اُولیٰ تمہی تو ہو

جلتے ہیں جبرائیلؑ کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہی تو ہو

پیتے ہی جس کے زندگیِ جاوداں ملی
اس جاں فزا زلال کی مینا تمہی تو ہو

اُٹھ اُٹھ کے لے رہا ہے جو پہلو میں چٹکیاں
وُہ درد دل میں کر گئے پیدا تمہی تو ہو

دُنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے؟
جس کی نہیں نظیر وُہ تنہا تمہی تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ یثرب و بطحا تمہی تو ہو

بپتا سنائیں جا کے تمہارے سوا کسے؟
ہم بے کسانِ ہند کے ملجا تمہی تو ہو

ہے اک نگار خانۂ حیرت یہ نام بھی
جس کی نظر پڑی وہی حیران ہو گیا

شرق اور غرب منسلک اک سلک میں ہوگئے
کتنا دراز رشتۂ قرآن ہوگیا

رسول اللہ پر قربان ہو جا

رسول اللہ پر قربان ہو جا
خود اپنے درد کا درماں ہو جا

حریفِ دولتِ افرنگ بن کر
حلیفِ دولتِ عثمان ہو جا

ضرورت کیا ہے کابل کے سفر کی
یہیں بیٹھا ہوا افغان ہو جا

امان اللہ خاں بن جائے گا تو
پر اوّل عاملِ قرآن ہو جا

ڈبو کر کشتیٔ کفر آنسوؤں میں
بغل میں نوحؑ کا طوفان ہو جا

غلامی کر محمد مصطفیٰؐ کی
گدائی چھوڑ دے سلطان ہو جا

مرے سانپ اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے
نظام الملک کا فرمان ہو جا

تزلزل میں ہے ایوانِ خلافت
تو اس ایوان کا پشتیبان ہو جا

بہزاد لکھنوی

بہزاد مشہور شاعر ہیں غزل، گیت، نعت، منقبت کسی چیز میں بند نہیں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں نعت پر خصوصی توجہ ہے، دلی میں جب یہ ریڈیو پر آتے تھے ان کی نعتیں گھر گھر پڑھی جاتی تھیں، اب بھی ان کا سارا زور کلام اسی عزیز اور مقدس صنف پر صرف ہوتا ہے لکھنؤ کے رہنے والے ہیں، زبان ان کی خانہ زاد ہے محاورے مطیع ہیں حسن بیان کے مالک ہیں، کلام میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی، ذیل میں ان کے نعتیہ کلام کا کچھ حصہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ان کی نعت گوئی کا رنگ کیا ہے؟

مدینہ کی جانب مدینہ کی سمت
ہر اک دن چلو، ہر مہینہ چلو
یہاں تو نہ بہزاد پاؤ گے چین
مری بات مانو مدینہ چلو

کبھی خواب ہی میں مدینہ کو دیکھوں
نگاہوں کو ہے انتظار مدینہ
مری کشت دل ہائے سوکھی پڑی ہے
ادھر کو بھی ابر بہار مدینہ
خدا کی قسم اس کو حاصل سکون ہے
وہ دل جو کہ ہے بے قرار مدینہ

شاہ عرب ہو مالک کون و مکاں ہو تم
ہم بیکساں دہر کے روح رواں ہو تم
ہر درد مند شاد ہے ہر درد مند خوش
حقا کہ چارہ ساز غم بیکساں ہو تم

رحمت تمہاری عام ہے ہر خاص و عام پر
ہر خاص و عام کے لیے رحمت نشاں ہو تم

وہ کون سا ہے راز جو تم پر عیاں نہیں
آگاہ کل ہو واقف سرِ نہاں ہو تم

غیروں پہ بھی کرم ہے یگانوں پہ بھی کرم
تم ہو کریم اور بڑے مہرباں ہو تم

ذرے بھی جانتے ہیں ستارے بھی ہیں گواہ
لاریب انیس و حبیبِ زمین و زماں ہو تم

انہیں کے لیے ہے یہ ساری خدائی
انہیں کے لیے یہ زمین و زماں ہے

ارے قافلے والو مڑ کر تو دیکھو
کوئی اور بھی تو پسِ کارواں ہے

نہ پوچھو ذرا اپنے دل میں تو دیکھو
مدینہ کہاں ہے مدینہ کہاں ہے

مدینہ کی دنیا ہے سب سے نرالی
وہاں کا ہر اک ذرہ خود آسماں ہے

مرا حال دل پوچھ تو سب سے چاہو
جو سینے میں نہاں تھا وہ سب پر عیاں ہے

بس انہیں کی ذات، حالِ مکمل ہے میری کائنات
میری دنیا، میری عقبیٰ دونوں قربانِ رسولؐ

اہلِ ایماں کو بھی اس میں کچھ نہیں تابِ زدن
مثلِ فرمانِ خداوندی ہے فرمانِ رسولؐ

تم کو شاید نہیں معلوم مدینے والو
ہند میں کوئی ہے مغموم مدینے والو
میں دن و رات تڑپتا ہوں مدینہ کیلئے
پر اچھا نہیں مقسوم مدینے والو
تم ہو اور شام و سحر دیدِ مزارِ اطہر
لٹے میں اس سے ہوں محروم مدینے والو
ہم سے پوچھو کہ خطاؤں میں گرفتار ہیں ہم
تم تو ہر طرح ہو معصوم مدینے والو!
دل کا کیا ذکر ہے دل سب کا ہی تم پہ قرباں
روح بھی ہے مری مغموم مدینے والو

نہیں کون بیمارِ عشقِ محمدؐ
غرض چار سو ہے مدینہ کا ارماں
میں ہائے حسرت صبر تجھ کو کروں کیا
مرے رگ و پے میں ہے مدینہ کا ارماں
مری زندگی ہے مدینہ کی خاطر
مری گفتگو ہے مدینہ کا ارماں
ہیں سرمستِ صہبائے عشقِ نبیؐ ہم
مری یاد ہر سُو ہے مدینہ کا ارماں

شاہِ زمیں شہِ زماں دونوں جہاں کے تاجدار
ہیں ترے نام پر فدا، دل ترے نام پر نثار

چشمِ نظر کی آرزو تیری زمیں ترا دیار!
جن و بشر کی سجدہ گاہ تیرا مکاں ترا مزار

دیکھے ہزار چشم بد مٹ نہ سکے گی تا ابد
تیری مہک تری شمیم تیرا چمن تری بہار

تیرے ہی فیض جود سے بن گیا وجہ لا الٰہ!
تیرا حسین کربلا وارثِ تیغ ذو الفقار

ہادیِ دو جہاں ہے تو واقفِ کن مکاں ہے تو
دہر کا راز داں ہے تو، کل کا تو ہی ہے رازدار

کون سی بات ہے یہاں ہو وہ زمیں کہ آسماں
تیرا کرم عیاں عیاں تیری عطا ہے آشکار

تیرے دیار کے لیے اپنے قرار کے لیے
چشم و نظر ہیں مضطرب قلب و جگر ہیں بیقرار

کئے جا صبا تو مدینے کی باتیں
یہی ہیں یہی میرے جینے کی باتیں
مرے دل کی حسرت مٹے اک ذرا بھی
مدینے کا قصہ، مدینے کی باتیں

نہ پوچھو کہ کیا ہیں مدینے کی گلیاں
کسی کا پتہ ہیں مدینے کی گلیاں
ہر اک ذرہ پر ماہ و انجم تصدق

بڑی پرضیا ہیں مدینے کی گلیاں
وہاں کا ہر اک ذرہ مشکل کشا ہے
مرا آسرا ہیں مدینے کی گلیاں
چلو ساز و ساماں کی حاجت نہیں ہے
اگر دیکھنا ہیں مدینے کی گلیاں

(حاجیوں سے خطاب)

مدینے جاؤ تو اتنا پیام کہہ دینا
کہ ہند میں ہے تپاں اک غلام کہہ دینا
تڑپ تڑپ کے گذرتے ہیں رات دن اس کے
عجیب طرح کے ہیں صبح و شام کہہ دینا
مسلسل آنکھ سے گرتے ہیں اشکِ خونِ جگر
دلِ حزیں میں تڑپ ہے مدام کہہ دینا
یہ کہنا ان سے گرفتارِ بندِ دنیا ہے
غموں کا اس پہ ہے اک اژدہام کہہ دینا
یہ کہنا بھول گیا میں کہ پیشِ گنبدِ سبز
ادب کے ساتھ تو پہلے سلام کہہ دینا
جو تجھ سے پوچھیں کہ وہ شخص کون ہے تبلا
تو ان سے چپکے سے بہزاد نام کہہ دینا

زائرِ حرم حمید صدیقی

عہدِ جدید کے نعت گو شعراء میں زائرِ حرم حمید صدیقی صاحب بہت نمایاں ہیں اور کوئی شبہ نہیں ان کے کلام میں بے ساختگی اور روانی ہے شگفتگی اور کیف ہے ایک ایک شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر پر واقعی ایک والہانہ کیف طاری ہے

اور وُہ اِس میں سرشار اور مست، نغمہ سرائی کر رہا ہے ۔ ذیل میں نمونہ درج کیا جاتا ہے :

معراجِ شوق

دیکھا ہے جب سے جدہ کا ساحل نہ پوچھیے
کیفِ نگاہ و شیفتگیٔ دل نہ پوچھیے !
پیشِ نظر ہے کون سی منزل نہ پوچھیے
اظہارِ لطفِ دید ہے مشکل نہ پوچھیے
دل جانبِ مدینہ ہے رُخ جانبِ حرم
اب انتہائے کشمکشِ دل نہ پوچھیے

عالمِ بیخودی

دلِ غم زدہ کیوں نہ مسرور ہو گا
جو پیشِ نظر قبّۂ نور ہو گا
حضوری کے جلووں سے معمور ہو گا
یہ سینہ مرا وادیٔ طور ہو گا !

جوشِ تمنّا

اُس طرف دل مرے سینے میں تڑپتا ہو گا

اس طرف جلوہ فگن گنبدِ خضرا ہوگا
بجلیاں کوندرہی ہوں گی دمِ نظّارہ
قابلِ دید لگا ہوں کا تماشا ہوگا
سجدے میں ہوں درِ اقدس پہ کہ سُوئے کعبہ؟
کثرتِ شوق میں احساس کب اس کا ہوگا

خُلدِ آرزو

نزولِ رحمتِ پروردگار دیکھیں گے
کہ پھر حبیبِ خدا کا دیار دیکھیں گے
لگائیں گے اسے آنکھوں میں مثلِ خاکِ شفا
جہاں مدینے میں اُڑتا غبار دیکھیں گے

بحضورِ ساقیِ کوثرؐ

پھر مئے توحید کا ساغر پیے
پھر حضورِ ساقیِ کوثرؐ چلے
سوز و سازِ آرزو لے کر چلے
با دلِ پُر شوق و چشمِ تر چلے
اُف وہ داغِ دل جو پھر تازہ ہوئے
ہائے وُہ زخمِ جگر جو بھر چلے
گنبدِ خضرا پہ ہونے کو نثار
رات آئی اور مہ و اختر چلے

مقامِ تجلّی

صبا اس طرح جھومتی جا رہی ہے
کہ جیسے مدینے ہی جا رہی ہے
محبّت کا حاصل ملا جا رہا ہے
متاعِ محبّت لٹی جا رہی ہے

قربِ مقصود

تیرے کوچے میں حمید خستہ حال آ ہی گیا
اپنے بندوں کا تجھے آخر خیال آ ہی گیا
اے دلِ دردآشنا اے جانِ مضطر ہوشیار
ہاں سنبھل، اب وہ مقامِ وجد و حال آ ہی گیا

بہار در بہار

نہ کوئی اضطراب ہے نہ کوئی انتشار ہے
سکون ہی سکون ہے، قرار ہی قرار ہے
قدم بڑھائے ساربان چلا ہے جھومتا ہوا
زباں پہ نغمہ حدی، ہاتھ میں مہار ہے
پہاڑیوں کے سلسلے جدا جدا سے ملے
کہیں یہ جوئبار ہے، کہیں یہ آبشار ہے

عید گاہِ عاشقاں

آگیا شاہ دو عالم کا دیار
ہوشیار اے جانِ مضطر ہوشیار
ڈھونڈتی تھی گنبدِ خضرا کو تو
دیکھ وہ ہے، اے نگاہِ بیقرار
یہ وہی پاکیزہ کوچے ہیں جہاں
چلتے پھرتے تھے شہِ عالی وقار
آنکھ رکھوں یا قدم اس خاک پر
ذرّہ ذرّہ ہو رہا ہے جلوہ زار

فردوسِ نظر

یہاں جرأتِ شوق ہوتے ادب ہے
نگاہوں کو غافل ادب سے جھکا لے
غلاموں کے آقا غریبوں کے مونس
مجھے بھی گدا اپنے در کا بنا لے

نظارۂ مدینۃ الرسولؐ

کیا بتاؤں کہ کیا نظر آیا
جلوہ کبریا نظر آیا
جان میں جان آگئی واللہ

جب درِ مصطفیٰؐ نظر آیا
تو حیرت ہے اس قدر تو کیوں؟
چشمِ پُر شوق کیا نظر آیا
سر جھکا جا رہا ہے سجدے میں
کس کا یہ نقشِ پا نظر آیا

حسنِ نظر

خود ان کی نظر پڑتی ہے اب دیکھئے کس پر
سنتے ہیں کبھی اور کبھی دیکھ رہے ہیں
جو دیکھنا چاہا تھا وہی دیکھ رہے ہیں
یعنی حرمِ پاک نبیؐ دیکھ رہے ہیں
احساس سا ہوتا ہے پہنچتے ہی حرم میں
جیسے کہ رسولِ عربیؐ دیکھ رہے ہیں

جلوۂ ناز

مدینے اور جلوہ سامانیاں ہیں
حبیبِ دو عالمؐ کی جہانیاں ہیں
اُدھر عاصیوں کو پشیمانیاں ہیں
اِدھر رحمتوں کی فراوانیاں ہیں

حضوریٔ حریمِ رسالتؐ

دماغ اپنا نہ کیوں اب عرش پر ہو
نبیؐ کی خاکِ پا ہے اور میں ہوں
بحمد اللہ کھلا ہے بابِ رحمت
مری آہِ رسا ہے اور میں ہوں

دواعیٔ نظر

قابلِ ضبطِ غمِ قلب و جگر ہو کہ نہ ہو!
رُخ سے پردہ تو اُٹھنے تابِ نظر ہو کہ نہ ہو
دل بھر آیا ہے تو جی کھول کے رو لینے دو
پھر کبھی جوشش پہ یوں دیدۂ تر ہو کہ نہ ہو
در و دیوار سے سر پھوڑ کے مر جانے دو
پھر کبھی کوچۂ طیبہ میں گذر ہو کہ نہ ہو

اوّل اوّل

وُہ نظارۂ بے نقش پہلے پہلے
وُہ اک منظرِ حجاب نواز اوّل اوّل

وہی بن گیا دردِ دل آخر آخر
بظاہر جو تھا سوز و سازِ اوّل اوّل
وہ اک جلوۂ بے جہت آخر آخر
وہ اک پردۂ نیم بازِ اوّل اوّل

سوزِ ہجر

وہیں سے ہو کے فدا سوئے خلد جانا تھا
حمید تجھ کو مدینہ سے پھر نہ آنا تھا
یہ اضطرابِ حضوری، ارے دلِ بیتاب
بہت ادب سے تجھے حالِ غم سنانا تھا
درِ حضور پہ دل تھا کچھ اس طرح غنی!
کہ جیسے قبضہ میں کونین کا خزانہ تھا

سرور و نور

وہ عجیب وقت تھا، جب چلے تھے دیارِ بہجت و نور سے
وہ عجب سماں تھا جدا ہوئے تھے جو آستانِ حضور سے
وہ درود پڑھنا حرم میں بکمالِ کیف و سرور سے
کبھی جالیوں کے قریب سے، کبھی ہٹ کے سامنے دور سے
وہ نظر نواز تجلیاں، وہ سکوتِ دل، وہ سکونِ جاں
یہ کسے مجال ملا سکے جو نظر کو پردۂ نور سے؟

مدینہ کی باتیں

کرو ہم صفیرو! مدینہ کی باتیں
یہی ہیں حقیقت میں جینے کی باتیں!
تقاضا غلامی کا یہ کہہ رہا ہے
کہ دن رات ہوں بس مدینے کی باتیں
فضائے مدینہ ہے یا بزمِ جنت؟
نہ غم ہے حسد کے نہ کینے کی باتیں

تجلیاتِ حرم

پیشِ نظر حریمِ رسالت ہے آج کل
دُنیا مرے خیال کی جنت ہے آج کل
اک اہتمامِ خاص ہے بیت الحرام میں
صف بستہ قدسیوں کی جماعت ہے آج کل
عالم تمام مطلعِ انوار بن گیا
اتنی تجلیات کی کثرت ہے آج کل

صبحِ حرم

گنبدِ خضرا کا وہ زریں کلس

وہ شعاعِ مہر کی رعنائیاں
وہ اذاں کے نغمہائے دل فروز
گونجتی ہیں جس طرح شہنائیاں
وہ سکوتِ خاص وہ بابُ السلام
وہ سکونِ قلب وہ تنہائیاں
اللہ اللہ یہ تصور کا فروغ
رُوبرو ہیں جیسے کچھ پرچھائیاں

شوقِ دید

لوگ جاتے ہیں کہ اللہ کا گھر دیکھیں گے
اور ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھیں گے
ایک ہم ہیں کہ شبِ غم میں تڑپتے ہوں گے
ایک وہ ہیں کہ مدینہ کی سحر دیکھیں گے
جانے والوں پہ حرم کے مجھے رشک آتا ہے
اللہ اللہ وہ تری راہگزر دیکھیں گے

پیامِ حمید

تڑپ رہا ہے یہ مشتاقِ دید کہہ دینا
درِ نبیؐ پہ سلامِ حمید کہہ دینا
جو حالِ دل ہے وہ ان پہ ہے سب کہے روشن

پر شوق نگاہیں اٹھتی ہیں بیتاب دعائیں ہوتی ہیں
دربارِ نبیؐ میں چھائی ہوئی رحمت کی گھٹائیں ہوتی ہیں
بخشش کے خزانے لٹتے ہیں مقبول دعائیں ہوتی ہیں
وہ چاندنی راتوں کا منظر وہ صحنِ حرم وہ گنبد و در
جب نورِ قدم کے جلوؤں سے معمور فضائیں ہوتی ہیں

نورٌ علےٰ نورٌ

صبحِ حرم یا جلوۂ طور
اللہ اللہ ، نور ہی نور

ہر جلوہ مسرورِ نظر
ہر شے نور سے ہے معمور

چپہ چپہ رشکِ ارم
ذرہ ذرہ بقعۂ نور

گوشہ گوشہ طیبہ کا
جانِ تجلی نازشِ حور

حجرۂ انور صلّ علےٰ
شرحِ جمال سورۂ نور

رحمت رحمت ارضِ بقیع
جنت جنت اہلِ قبور

جن کی اک اک موجِ نظر
ساغرِ کوثر ، جامِ طہور

دیدۂ باطن جلوہ نگر!
دیدۂ ظاہر میں مخمور

بیچارگیٔ عشق

اشکِ غم یوں ڈبڈبا کر رہ گئے
جیسے تارے جھلملا کر رہ گئے
جانے والے تو مدینہ چل دیئے
ایک ہم آنسو بہا کر رہ گئے
اضطرابِ شوق میں بے ربط سے
چند فقرے ساتھ لب تک آ کے رہ گئے
دل بھر آیا آنکھ پُرنم ہو گئی
اُف نہ کی، لب تھرتھرا کر رہ گئے

اقبال اور ذکرِ رسولؐ

◎

مرد حق از کس نگیرد رنگ و بو
مرد حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر
ہر زماں او را چو حق شانے دگر

جز بحرم منزل نہ دارد کارواں
غیر حق در دل نہ دارد کارواں

○

من نمی گویم کہ راہش دیگر است
کارواں دیگر نگاہش دیگر است

○

اقبال اور ذکرِ رسولؐ

گزشتہ صفحات میں ہم نے اردو کی نعتیہ شاعری کا بڑی حد تک اور فارسی کی نعتیہ شاعری کا کسی حد تک جائزہ لے لیا، اب اقبال کی باری آتی ہے :

بزمِ رسالت میں مدح خواں اور نعت گو کی حیثیت سے، بہت سے شعرا آئے، ان شاعروں کے پاس لفظ و معنی کا طلسم تھا، جذبات کا تموج تھا، خیالات کی بلندی تھی، احساسات کی رفعت تھی، اسلوبِ بیان کی جدت بھی، اندازِ کلام کی ندرت تھی، الفاظ پر حاکمانہ اقتدار تھا، پیرایۂ بیان پر ملوکانہ فرماں روائی تھی۔ ان کے یہاں خلوص بھی تھا، محبت بھی تھی، ذاتِ رسالت مآب سے والہانہ عشق بھی تھا، لیکن مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ عرض کروں کہ ان سب میں مل کر بھی وہ بات نہ تھی جو اقبال میں تھی :

عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں ؟

اقبال کی تعلیم کسی مسجد اور مکتب میں نہیں ہوئی، انھوں نے عربی کی تحصیل و تکمیل نہیں کی، انھوں نے زاویہ اور خانقاہ سے فیض نہیں اٹھایا، انگریزی کی تعلیم حاصل کی، فرنگیوں کے ملک میں جا کر اس کی تکمیل کی، فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا، ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں اسی فن کی تعلیم و تکمیل پر صرف کر دیں، اقبال کا زمانہ وہ تھا جب عام طور پر فلسفی کے معنی دہریے کے لیے جاتے تھے، ایک فلسفی کی پاس سے بڑھ کر تو دین کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس پر مذہب پرستی کا اتہام لگایا جاتے، ایک فلسفی اور مذہب پرست یہ اتنی انہونی بات تھی کہ یہ صرف تمسخر اور استہزاء کا موضوع بن سکتی تھی، فلسفی کی آزاد خیالی، وسیع المشربی، عقلی اور منطقی کسوٹی اس بات کو گوارا ہی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اپنا وقت مذہب پر صرف کرے، اس زمانہ کے روشن خیال، آزاد طبع، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فلسفیانہ مزاج و طبیعت رکھنے والے اصحاب کے لیے مذہب صرف ایک تفریحی مشغلہ تھا، یہ متنور الفکر اور روشن نظر لوگ مذہب کا مذاق اڑایا کرتے تھے، روایاتِ مذہبی پر قہقہہ لگایا کرتے تھے، عقائدِ مذہبی کو مزخرفات کا مجموعہ سمجھتے تھے، عبادت و ریاضت ان کے نزدیک وقت ضائع کرنے کا بہترین اور دلچسپ مشغلہ تھا، مذہبی نظام

مذہبی شخصیتوں اور مذہبی پیام بروں کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی، یہ اپنے فلسفہ کی کسوٹی پر سب کو کس چکے تھے اور سب کو غلط، بر خود غلط اور باطل قرار دے چکے تھے، یہ اتنے آگے بڑھ چکے تھے کہ ان میں ملّی اور قومی عصبیت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی، یہ اپنے بزرگوں کا نام لیتے ہوئے شرماتے تھے یہ اپنے اکابر اور اسلاف کے کارناموں سے نہ واقف تھے، نہ واقف ہونے کی ضرورت محسوس کرتے تھے، یہ اپنی تاریخ تک سے نابلد تھے، یہ خدا کے تو قائل نہیں تھے لیکن قدرت سے سخت برہم تھے کہ اس نے انہیں مسلمان گھرانے میں کیوں پیدا کیا؟ مسلمانوں کی کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں تھی جس پر یہ فخر کر سکتے جس پر انہیں ناز ہوتا جسے یہ اپنے نکری اور ذہنی آقاؤں کے سامنے اپنا کر پیش کر سکتے :

یہ تھا وہ عہد جب اقبال اسکول سے نکلا، کالج میں پہنچا، کالج سے نکلا یونیورسٹی میں آیا، یونیورسٹی سے جست کی، لندن پہنچا، وہاں سے اُڑا، برلن کے دانش کدوں کا طواف کرتا رہا پھر علم مغرب اور دانش کدہ افرنگ سے جو کچھ اور جتنا کچھ بھی لیا جا سکتا ہے وہ سب لیکر، اپنی جھولی بھر کر اپنے وطن میں واپس آ گیا :

لیکن کیسی عجیب بات تھی کہ یہ اقبال اس ساری مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی احساس کمتری کا شکار نہیں بنا اس نے دیارِ فرنگ کا رُخ دیکھا، ہر جلوہ کا نظارہ کیا، کوئی پہلو ایسا نہ تھا جسے ٹٹولا اور پرکھا نہ ہو لیکن نہ اُسے اپنے مذہب پر شرم آئی، نہ اپنے اسلاف پر اور جب علوم عصریہ اور فنونِ جدیدہ اور حکمت مغربی اور فلسفۂ فرنگ کا محرم راز بن کر اپنے دیس ہی واپس پہنچا تو اس کی زبان پر جو ترانہ تھا، وہ یہ تھا :

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

یہ قرآن پڑھ کر روتا تھا، ذکرِ رسولؐ کے وقت اس کی آنکھوں سے موتی کی طرح آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے، فلسفۂ اسلام کے سامنے دُنیا کا ہر فلسفہ اس کی نگاہ میں ہیچ تھا، اُسے معلوم تھا کہ دنیا کے بڑے بڑے فلسفی اور مفکر، ایک "انسان برتر" (SUPERMAN.) کی تلاش میں سرگرداں رہے تھے، لیکن اسے وہ انسان برتر اُمّی عرب کی صورت میں نظر آ گیا تھا اور یہ دل کی گہرائیوں سے، دُنیا کو دعوت دینے لگا کہ اے گم گشتگانِ راہِ ضلالت، آؤ، یہ ہے راہِ صواب، اس پر رہروی کرو، یہ ہے وہ دُنیا کا سب سے بڑا، سب سے بہتر اور سب سے اونچا انسان جس کے نقش قدم پر چل کر جس کی دعوت قبول کر کے تم فلاح و کامرانی حاصل کر سکتے ہو :

دنیا میں بڑی بڑی تحریکیں اُبھرتی ہیں، ان تحریکوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دکھ درد دور کیے جائیں، اس کی پریشانیاں کم کی جائیں، اُسے ذہنی اور جسمانی سکون بہم پہنچایا جائے، کسی کو یہ راستہ تخت و ملوکیت کے پیچھے نظر آیا، کسی نے اسے میر و سلطان، خاقان و فغفور کی گردن کاٹ کر تلاش کیا، کسی نے جمہوریت کو مداوا قرار دیا، کسی نے سوشلزم کا پرچار کیا، کسی نے نیشنل سوشلزم کا علم اٹھایا لیکن اقبال جس تحریک کو انسانیت کی تمام بیماریوں اور دشواریوں کا واحد حل قرار دیتا تھا، وہ تھی اسلام:

اور اسلام سے یہ شیفتگی اور وابستگی جو اقبال کے دل میں پیدا ہوئی تھی، یہ نتیجہ تھی وسیع اسلام کی سیرت اور کردار کے گہرے مطالعہ کا:

دوسرے شاعروں نے رسولؐ کی نعت پر اس لیے قدم اٹھایا کہ انہیں اپنے رسولؐ سے محبت تھی، لیکن اقبال کی زبان پر جب ذکرِ رسول آتا ہے، تو وہ بے خود ہو جاتا ہے اس کے ان معلومات اور تاثرات کا جو دنیا کی تحریکوں، دنیا کے مذہبوں اور اکابر رجال کے تقابلی مطالعہ سے اس کے ذہن و دماغ پر محیط ہوتے ہیں دوسرے لوگ صراطِ مستقیم سے مرادِ مستقیم تک پہنچے، مسلمان گھر میں پیدا ہوئے، مسلم ماحول میں زندگی بسر کی، مسلمانوں کی سی باتیں کرنے لگے، لیکن اقبال اس راستہ تک بہت دیر میں پہنچے، اس لیے کہ انہیں چکر کاٹ کر آنا پڑا تھا:

دیر آمدہ ز راہِ دور آمدہ!

انہوں نے شک و ارتیاب کی گھاٹیاں قطع کیں، انہوں نے اس وسیع دنیا کو وسعتِ نظر کے ساتھ دیکھا، یہاں کے مذہبوں کو دیکھا، علومِ جدیدہ کے طوفان سے آشنا ہوئے، منطق و فلسفہ کے پہاڑ پر چڑھے اور دنیا کے افکار دینی انہیں بہت چھوٹے نظر آنے لگے، انہوں نے انسانیت کی بے چارگی دیکھی، انسان کی مظلومی اور غلامی دیکھی، انسان کی سفاکی اور درندگی دیکھی، انسان کی خودفریبی اور فریب کاری دیکھی، انسان کے بنائے ہوئے انسان کش آلات و اسلحہ دیکھے، تجارتی امپیریلزم کا دور دیکھا، آقاؤں کی فرعونیت دیکھی، محکوموں کی ذلت و خواری دیکھی، مہذب، متمدن اور روشن دماغ مفکروں اور مدبروں کے بنائے ہوئے نظام و دستور دیکھے اور یہ دیکھا کہ یہ مہذب متمدن، روشن دماغ اور روشن بصر لوگ جب حاکم ہوتے ہیں تو کیا بن جاتے ہیں، جب باہر کی تحریک ہوتی ہے تو ان کی "پالیسی" کیا ہوتی ہے اور جب یہ مجبور ہوتے ہیں تو کس طرح "شاندار پسپائی" اختیار

کرتے ہیں :

اقبال نے دیکھا "ڈیموکریسی" کیسا ہمہ گیر اور رنگا رنگ پہلو رکھنے والا لفظ ہے، یہ عہدِ جدید کے دانشور، فلسفی، مدبّر، مفکر، فاتح، کشور کشا، کس طرح زور شور سے انسانیت کا کلمہ پڑھتے ہیں، بین الاقوامی رواداری، انصاف اور عدالت کا وعظ کہتے ہیں لیکن میز پر بیٹھ کر جو فیصلہ کرتے ہیں، وہ خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے، میدانِ جنگ میں پہنچ کر جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہ سوا انسانیت کشی کے کچھ نہیں ہوتا، قلم ہاتھ میں لے کر جو تاریخ لکھتے ہیں، اس میں اپنے گناہوں کو ہنر اور دوسروں کی بھلائیوں کو شر بنا دیتے ہیں، علم پڑھاتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں، تاریخ لکھتے ہیں تو افسانہ طرازی کرتے ہیں، دوسری قوموں اور ملتوں کا ذکر کرتے ہیں تو تعصب کی چادر اوڑھ لیتے ہیں، یہ تماشہ دیکھ کر وہ حیران ہو گیا کہ یہ کیسے دانش ور ہیں، یہ کیسے مفکر ہیں، یہ کیسے مدبّر ہیں یہ کیسے فاتح و کشور کشا ہیں جو دھڑلے سے ظلم کرتے ہیں، منافقت سے جھوٹ بولتے ہیں، بیباکی سے دوسروں کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں :

پھر اس کی نظر اس مذہب ـــ اسلام ـــ پر پڑی جو بے انتہا بدنام ہے، پھر اس کی آنکھوں نے سید البشر کا جمالِ جہاں آرا دیکھا جسے یورپ کے محققوں نے ہمیشہ غلط رنگ میں پیش کرنے کی مکروہ اور ناپاک کوشش کی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، اس دور میں باطل کس طرح حق بن سکتا ہے اور حق کو کس طرح باطل بنایا جا سکتا ہے :

اقبال کی چشمِ حقیقت بین نے دیکھا کہ اسلام کا داعی، مسلمانوں کا رسولؐ اور کائنات کا سردار بھی اس دنیا کے ایک حصے پر حکومت کر چکا ہے لیکن اس کی زندگی کتنی پاکیزہ تھی، اس کے اوصاف و اخلاق کتنے پسندیدہ تھے، اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، اس نے کبھی ڈپلومیسی (تزویر) سے کام نہیں لیا اس نے کبھی پالیسی (مصلحت) کو اپنا شعار نہیں بنایا، اس نے کسی پر ظلم نہیں کیا، اس نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا، اس نے میدانِ جنگ میں پہنچ کر بھی خود کبھی تلوار نہیں چلائی اور اپنے مجاہدین کو بھی حکم دے دیا کہ وہ اقدارِ انسانی کو کبھی اور کسی حالت میں پامال نہ ہونے دیں، اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے رسولؐ نے غیر مسلموں کے ساتھ کیسا مربیانہ اور مساویانہ سلوک کیا، کس طرح انہیں گلے سے لگایا، کیوں کر ان کی شقاوتوں، درندگیوں اور سفاکیوں پر خطِ عفو کھینچ دیا، اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے رسولؐ نے محکوموں کے ساتھ کیا سلوک کیا، انہیں کیسے حقوق دیئے، ان کی آزادیٔ فکر، آزادیٔ رائے، آزادیٔ گفتار، آزادیٔ اجتماع کو کس طرح ہر حالت میں محفوظ رکھا، اس نے یہ

(۱)

خوابگاہِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

○

"بلادِ اسلامیہ" کے عنوان سے اقبال نے ایک طویل نظم کہی ہے اور اس میں اپنی ذہانت و فطانت کے خوب خوب گوہر بکھیرے ہیں۔ دلّی، قرطبہ، بغداد اور قسطنطنیہ وغیرہ کا ذکر ہے اور والہانہ انداز میں عظمتِ ماضی کی مرثیہ خوانی روایاتِ ملی کی نگہبانی، قوم و ملک کی زبوں حالی، ملتِ اسلامیہ کی تباہی اور بربادی، کیا نہیں ہے اس میں؟

لیکن جب مدینہ منورہ کا ذکر آجاتا ہے تو اقبال کے نطق و کلام پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس کے الفاظ الفاظ نہیں رہتے، جہانِ معنی بن جاتے ہیں، ان میں تاریخ بھی ہے روایاتِ ماضی بھی، ذکرِ حال بھی اور وارداتِ قلب کی ایسی کیفیت جس کی نقاشی صرف اقبال ہی کا قلم کر سکتا ہے، اس طویل نظم کے یہ چند اشعار اپنی اندر ایسے حیات آفریں تاثرات رکھتے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد ممکن نہیں ہے کہ قلبِ مسلمان میں، ایک نیا طوفان انگڑائیاں نہ لینے لگے، ایک نئی ہلچل پیدا نہ ہو جائے، ان میں ملت کی مرکزیت کا ایسا انقلاب جاذب اقبال نے پیش کیا ہے جس کی ٹھوس صداقت اپنی جگہ مسلّم ہے، ساتھ ہی ساتھ جذبات اور واردات و کیفیات کی دنیا میں اس کا ایک خاص مقام ہے:

اقبال، حکیمِ امت اقبال کہتا ہے:

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفےٰ
دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی ظلمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی

بھی دیکھا کہ اس کے رسولؐ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد بھی فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، اس نے سونا لٹایا، موتی بانٹے، چاندی تقسیم کی لیکن گھر میں تیل نہ تھا کہ چراغ جلتا، آٹا نہ تھا کہ روٹی پکتی، روپیہ نہ تھا کہ پوشش کی ضرورتیں اپنے طور پر پوری ہو سکتیں :

یہ سب کچھ دیکھ کر اقبالؔ اقبال بن گیا، اس کی زبان سے جو ترانے نکلے وہ اثر و تاثر کے اعتبار سے کچھ اور بن گئے، اس نے جو نعت کہی، اس کی کیفیت کچھ اور ہو گئی، اس نے اپنے رسولؐ کی مدح میں جو زبان کھولی تو سب سے بازی لے گیا، اس لیے کہ دوسروں سے ذاتِ رسالت مآبؐ کا جلوہ اتنے زاویوں اور پہلوؤں سے نہیں دیکھا جتنے زاویوں اور پہلوؤں سے اقبال نے دیکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ اقبال کے الفاظ جدا ہیں، اس کا انداز الگ ہے، اس کے اسلوب میں جو انفرادیت ہے وہ کسی اور کے ہاں نہیں ملتی، اس کا ڈھنگ سب سے نمایاں اور یکتا ہے اس کی ادا کسی سے نہیں ملتی، اس کا سوز و گداز، اس کا اثر و تاثر، اس کی کیفیت اور حالت، اس کی عقیدت اور محبت، اس کا عشق اور اس کی بے خودی، اس کا جوش اور جذبہ، اس کا نالہ اور فریاد، اس کا بیان اور کلام، ہر چیز الگ ہے، ہر چیز جدا ہے، لوگ اس کی تقلید کر سکتے ہیں، لیکن وہ ایسی ہے کہ اس کی تقلید کی جائے، دوسرے اس کا رنگ اڑا سکتے ہیں لیکن وہ کسی کے رنگ پر رشک نہیں کر سکتا، کیونکہ جو کچھ اس کے پاس موجود ہے، وہ دوسروں کے پاس نہیں ہے :

اقبال کی نعتیہ شاعری کے تین پہلو ہیں اور وہ یہ ہیں :

۱۔ ذاتی ——— یعنی ذاتی تاثرات و کیفیات :

۲۔ قومی ——— یعنی قوم کے عروج و زوال اور ادبار و انحطاط میں حُبِّ رسولؐ کی کمی بیشی کی کارفرمائی اور اس کے اثرات و نتائج :

۳۔ صفاتی ——— یعنی ذاتِ رسالت مآبؐ کے اوصاف و محامد :

ان میں ہر پہلو اپنے اندر ایک جہانِ معنی آباد رکھتا ہے جی تو یہ چاہتا تھا کہ ان تینوں پہلوؤں کو الگ الگ شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جاتا لیکن یہ تینوں اس درجہ مشترک اور ممزوج ہیں کہ انہیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، جیسے جیسے یہ سامنے آتے جائیں گے، ان کی تشریح و توضیح اپنے اپنے موقعہ سے قارئین کی خدمت میں پیش ہوتی رہے گی :

جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

پھر کتنے ولولہ انگیز الفاظ میں اس حقیقتِ کبریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہیں

نام لیوا جس کے ـــــ شاہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے ـــــ وارث مسندِ جم کے ہوئے

اور اس کے بعد فلسفۂ قومیتِ ملت کو مدینہ کی مرکزیت سے وابستہ کر کے فرماتے ہیں :

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو، ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

اور بالکل آخر میں کہتے ہیں اور کتنی سچی اور دل نشیں بات کہتے ہیں :

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں[1]

اس نظم کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب اقبال کی شاعری پورے طور پر مذہب آشنا نہیں ہوئی تھی اور وہ قومیتِ ہند کی عظمت کے قائل تھے اور اپنے اشعار میں ہندوستان کی عظمت و رفعت کا ذکر بڑے شاندار اور اثر انگیز الفاظ میں کیا کرتے تھے لیکن اس دور میں بھی ان کی بصیرت وہ کچھ دیکھ رہی اور محسوس کر رہی تھی جو بالآخر مسلمانانِ ہند کا مسلک اور مطمحِ نظر بنا اور جس کی مرکزیت کو نہ صرف مسلمانانِ ہند و پاکستان نے، بلکہ،

---

[1] بانگِ درا ص ۱۸۱

سارے عالم اسلام نے، تلخیاں برداشت کرنے، ٹھوکریں کھانے اور استعمار و استبداد کے مظالم برداشت کرنے اور استعباد کی مصیبت میں گرفتار ہونے کے بعد تسلیم کیا:

مرکزِ ملّت

حلقۂ ملّت محیط افزاستے

مرکزِ او وادیِ بطحاستے

ما ز حکمِ نسبت او ملتیم

اہل عالم را پیامِ رحمتیم

(۲)

ترانۂ ملی میں میرِ حجاز کا ذکر صلی اللہ علیہ وسلم

○

اقبال کا ترانۂ ملی زبان زدِ خاص و عام ہے، وہ کون سی محفل ہے جس میں یہ گایا نہیں جاتا؟

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اقبال نے یہ ترانہ لکھا اور بہت جلد، پاکستان و بھارت کے گوشہ گوشہ میں، یہ ترانہ زبانوں پر جاری ہو گیا تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل، دولت مند ہوں یا غریب، مسلم لیگی ہوں یا قوم پرست، احرار اسلام ہوں یا خاکسار نیلی پوشس ہوں یا خلافتی، کسی مسلک، کسی گروہ، کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یہ ترانہ حدی خوانی کا کام کرتا ہے اسکولوں کے طلبہ، کالجوں کے اسٹوڈنٹ، یونیورسٹیوں کے اسکالر، مدارس کے اساتذہ، کلیات کے معلم، جامعات کے پروفیسر، سیاسی پلیٹ فارم کے رہنما، ملی و قومی اسٹیج کے قائد، سرکاری دفاتر کے سربراہ، ایوانِ تجارت، کے دولت مند، ملوں میں کام کرنے والے مزدور، ہر جماعت میں یہ ترانہ پڑھا جاتا ہے، گایا جاتا ہے اور اس کا یہ ترنم ساری محفل پر سارے مجمع پر، ایک عجیب سرگشتگی کی والہانہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے، وہ بھی سرِ دھنتے تھے جو اقبال کے حریف تھے، مخالف تھے، نکتہ چیں تھے، بد خواہ بھی تھے اور وہ بھی جو اقبال کے ہم مشرب تھے حلیف تھے، دوست تھے، بہی خواہ تھے، قدر شناس اور مرتبہ داں تھے:

ہر قوم اپنا ایک "نیشنل انتھم" و نغمۂ ملی رکھتی ہے:

اقبال نے یہ ترانہ اس وقت لکھا جب اس نیم براعظم (پاکستان و بھارت) کی ملتِ اسلامیہ غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی، فرنگی سامراج کے جال میں جکڑی ہوئی تھی، ہندو امپیریلزم کا طوفان، اُسے اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کر رہا تھا، ایک طرف فرنگی نخوت تھی، حاکمانہ اقتدار تھا مطلق العنانی تھی، دوسری جانب ہندو اکثریت تھی، جمہوریت کے نعرے تھے، مسلمانوں کو ایک اقلیت کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا وعظ تھا اور

مسلمان سعادت مندی کے ساتھ، اکثریت کے ظلِ عاطفت میں، اقلیت کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ اور تیار تھے
مسلمانوں کے کسی گوشہ میں، عام اس سے کہ وہ سیاسی لیڈروں کا گروہ ہو، یا علمائے دین متین و مفتیانِ شرعِ مبین
کا علم کدہ، ہندوؤں کا پنڈال ہو یا انگریزوں کا ایوان اور اس ایوان اور پنڈال کی زیب و زینت بڑھانے والے
مسلمان کہیں بھی ایک لمحہ کے لیے یہ تصور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ مسلمان جداگانہ قومیت کے حامل ہیں، وہ اپنی
ملی انفرادیت کے تحفظ اور دفاع کی تیاریاں کر سکتے ہیں انہیں اس کا حق ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ملحوظ،
رکھیں، اپنا جداگانہ قومی وجود قائم رکھیں اصول موضوعہ کی طرح یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ اس نیم براعظم کے آٹھ کروڑ
سے زائد مسلمان مجبور ہیں کہ غلامی کی زندگی بسر کریں، آج انگریزی کی، کل ہندوؤں کی، اس لیے کہ وہ اقلیت میں
ہیں اور اس جمہوری دور میں کسی اقلیت کو یہ حق نہیں مل سکتا کہ وہ اکثریت سے کٹ کر، اس سے الگ ہو کر اپنا
جداگانہ تشخص قائم کرے مجبور ہے کہ جمہوری "تحفظات" کے ساتھ ـــــ وہ تحفظات، جو اکثریت اور حکمران طبقہ از راہ
عنایت خسروانہ اسے مرحمت فرمادے ـــ وفاداری کی زندگی بسر کرے، اس راہ سے انحراف کے معنی
ہیں، بغاوت، سرکشی، طغیان اور ایسے لوگوں کا وہی حشر ہوتا ہے جو آج ـــــ آزاد اور خود مختار جمہوریت
مآب اور عوام دوست اکثریت پرست اور اقلیت بیزار ہندوستان میں ـــــ ناگاؤں کے ساتھ
ہو رہا ہے: ناگا قبائل اس کے سوا کیا چاہتے ہیں کہ وہ خود ارادیت سے بہرہ ور ہوں، لیکن ان کی یہ جائز خواہش
ومتشدد کے علمبردار اور اہنسا کے پجاری توپ بندوق سے جواب دے رہے ہیں یا پھر کشمیر کو دیکھیے، ناگاؤں کے ساتھ تو خیر
ہندوستان کی سابق اور موجودہ ـــ انگریز اور ہندو ـــــ آقاؤں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا لیکن کشمیر کے
چالیس لاکھ مسلمانوں سے برطانوی سامراج کے سب سے بڑے نمائندے، ماؤنٹ بیٹن اور ہندو راج کے مظہر
اتم جواہر لال نہرو نے صاف، واضح اور غیر مشکوک الفاظ میں، کان میں نہیں، ساری دنیا کے سامنے مجلس
اقوام متحدہ کے ایوان میں اور اقوام عالم کو گواہ کر کے، بیان حلفی دیا تھا کہ ہم کشمیریوں کو غلام بنانا نہیں چاہتے
ہم ان کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرتے ہیں، ہم انہیں اس کا موقعہ دیں گے کہ وہ بغیر دباؤ کے، آزادانہ طور پر اپنی
رائے کا اظہار کریں اور جس طرح چاہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں لیکن اس بین الاقوامی معاہدہ کا جو حشر ہوا اور جو
حشر ہو رہا ہے وہ دنیا کے سامنے ہے :

بہرحال یہ تھی وہ فضا جس میں یہ مسلمانانِ ہند سانس لے رہے تھے اور یہ بات گویا طے ہو چکی تھی کہ انہیں بہرحال ایک تابع و مطیع اقلیت کی حیثیت سے ہندو راج میں زندگی بسر کرنی ہے۔ خود اقبالؔ جو اس وقت ایک قومی سی زیادہ ملکی شاعر تھے اور آگے چل کر شاعرِ مشرق اور حکیم الامت بننے والے تھے، نہیں جانتے تھے کہ اس دامِ ہمرنگ زمیں سے رہائی کی صورت کیا ہو گی؟ اور آیا مسلمان اس مصیبت سے نجات پا بھی سکیں گے یا نہیں؟ لیکن دفعتاً اقبالؔ کی زبان پر، اشعار کی صورت میں الہام جاری ہوا۔ مسلمانوں کے ملی شاعر کی زبان پر ترانۂ ملی جاری ہو گیا۔ یہ سب اور دل نشیں بول اس کے منہ سے نکلنے لگے جو اس کے بول نہ رہے، ہر مسلمان کے دل کی آواز بن گئے:

اقبالؔ اس ترانہ میں مسلمانوں کے ملی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے اور ان کے قومی خصائص بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اے گلستانِ اندلس، وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اور پھر ارضِ حرم کو مخاطب کر کے کس جوش و خروش سے کہتے ہیں:

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

اور یہ سب کچھ کیوں ہے، کس لیے ہے؟ کس جذبے کے ماتحت ہے؟

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا[1]

---

[1] بانگِ درا ص ۱۷۳

اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد اقبال بجا طور پر توقع رکھتا ہے :

اقبال کا ترانہ بانگِ دَرا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما اب کارواں ہمارا

اور کوئی شبہ نہیں ، یہ توقع پوری ہوئی اور ملّت کا کارِ رواں حرّیت و استقلال کے راستہ پر چل پڑا ۔

---

(۱۳)

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اقبال کی ایک خاصی مفصل نظم "وطنیت" کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ وطنیت کی تشریح خود اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے:

یعنی وطنیت بحیثیت ایک سیاسی تصور کے

اور وہ سیاسی تصور کیا ہے؟ اس کے بارے میں اقبال نے خود تو کوئی تشریح نہیں کی ہے لیکن چند، اشعار میں جو کچھ کہا ہے وہ ایک دفتر سے زیادہ ہے؟

قبل اس کے کہ ہم اقبال کے الفاظ پیش کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وطن کے سیاسی تصور پر بھی مختصر الفاظ میں گفتگو کریں، کہ بغیر اس کے ہم اقبال کے اشعار کی روح تک نہیں پہنچ سکیں گے اور اس کے پیام کی اہمیت پورے طور پر نہیں محسوس کر سکیں گے:

وطن کا ایک تصور تو وہ ہے جو ہر عامی اور عوامی آدمی کے علم میں ہے یعنی زاد بوم، زاد بوم سے، انسان کو جو فطری لگاؤ ہوتا ہے اور اس سے جو تعلق خاطر ہوتا ہے اس کی خوشگوار یادیں جس طرح انسان کے حافظہ میں نقش ہوتی ہیں، اس کی منقصت اور مذمت کوئی بھی نہیں کر سکتا وہ ایک فطری اور طبعی چیز ہے

لیکن عہد جدید میں وطن نے بت بلکہ نعوذ باللہ خدا کی حیثیت اختیار کر لی ہے ایک بت پرست سہل انکاری یا غفلت کے باعث بت پرستی کے عوائد و رسمیات سے کنارہ کش ہو سکتا ہے ایک وہ شخص جو خدا کو مانتا ہے، اپنے اس غیر متزلزل عقیدے کے باوجود دن بھر بہت سی معصیتیں اور نافرمانیاں کرتا رہتا ہے، لیکن ایک وطن پرست، کبھی اور کسی حالت میں اپنے "خدا" سے منحرف نہیں ہو سکتا وہ اپنے "خدا" یعنی وطن کے لیے آزادوں کو غلام بنانے میں کبھی تامل نہیں کرے گا، غریبوں کو لوٹے گا، قوموں اور ملتوں پر بم پھینکے گا

بے گناہوں کی جانیں لے گا، بچوں، عورتوں، بوڑھوں تک کو معاف نہیں کرے گا اپنے خدا یعنی وطن کی سربلندی کے لیے ہر گناہ کر گزرے گا، ہر معصیت کا ارتکاب دھڑلے سے کرے گا اس خدا کی پرستش اختیار کرنے کے بعد بے ایمانی کار خیر بن جاتی ہے ظلم، درندگی بہیمیت، شقاوت اور قساوت کو بزرگ ترین افضل ترین مقام حاصل ہو جاتا ہے، غارت گری، خون آشامی، ہلاکت آفرینی ایک مقدس مشغلہ بن جاتی ہے:

وطن کی پرستش، ہر اصول سے، ہر سچائی سے، ہر حق سے بے نیاز کر دیتی ہے، وطن پرست صرف اپنے وطن کا مفاد دیکھتا ہے، اسے دوسروں کے مفاد سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی، اپنے وطن کے ذرا سے نفع کے لیے ایک پوری قوم کو ہلاک کر سکتا ہے، ایک پورے ملک کو غلام بنا سکتا ہے، ایک پورے گروہ انسانی کو تہ تیغ بے دریغ کر سکتا ہے ـــ بغیر شرماتے ہوئے، بغیر ہچکچائے ہوئے بغیر ذرا بھی ضمیر کی خلش محسوس کیے ہوئے!

برطانیہ، آج بھی ملایا[1]، سنگاپور اور دوسرے نوآبادیات پر قابض ہے وہاں کے عوام کی مرضی کے، خلاف قابض ہے، کیوں؟

اس لیے کہ اس کے وطن کا مفاد اسی میں ہے!

فرانس آج الجزائر میں حریت مآب اور آزادی خواہ مسلمانوں کا اس طرح شکار کر رہا ہے جس طرح جنگل میں وحشی جانوروں اور درندوں کا شکار کیا جاتا ہے، وہاں کی آبادی آزادی مانگتی ہے اور فرانس کی جمہوریت دوست حکومت اسے توپ کے گولے اور بندوق کی گولیاں عطا کر رہی ہے، کیوں؟

اس لیے کہ اہل فرانس کا وطن پکار پکار کر کہہ رہا ہے اگر تم نے الجزائر کو آزاد کر دیا تو ہمارا استعمار دم توڑ دے گا؟

جنگ عظیم ثانی کو ختم ہوئے دس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں (occupied Japan) مقبوضہ جاپان، آزاد ہو چکا ہے، دنیا کی قوموں سے اور خود امریکہ سے برابری کا معاہدہ کر چکا ہے مجلس اقوام متحدہ میں اس کی نشست کا انتظام اور بندوبست کیا جا رہا ہے، لیکن بایں ہمہ جاپان کے جن جن جزائر پر امریکہ کا قبضہ ہے

---

[1] ملایا اور سنگاپور اب آزاد ہو چکا ہے

[2] بادل نخواستہ فرانس بڑی حد تک الجزائر کو آزاد کر دیا ہے)

اس سے وہ دست بردار نہیں ہوا حالانکہ جاپانی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں، جاپان سے تشریف لے جائیے ہم نے
پایا ——— امریکہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟

اس لیے کہ اس کا "وطن" یہی چاہتا ہے اور وطن سے سرتابی نہیں کی جا سکتی ہے، خدا سے بغاوت کی جا سکتی ہے مگر وطن سے نہیں، کیوں کہ اب افکار و اقدار میں انقلاب آ چکا ہے اور

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور

ہندوستان کشمیریوں سے عہد کر چکا تھا کہ انہیں حق خود ارادیت اور استصواب رائے عامہ سے نوازے گا لیکن اس کے باوجود وہ اس پر کیوں قابض ہے؟ اس کی فوجیں کشمیریوں پر کیوں مسلط ہیں، اس کی تلواریں کشمیریوں کے سروں پر کیوں چمکتی ہیں؟ وہاں حق خود ارادیت کا نام لینا کیوں جرم ہے؟ وہاں استصواب رائے عامہ اور حق خود ارادیت کا نعرہ بغاوت سے زیادہ سنگین اور ناقابلِ معافی جرم کیوں بن گیا ہے؟ وہاں کے حریت طلب لوگ دھڑا دھڑ کیوں نذرِ زنداں کیے جا رہے ہیں، شیخ محمد عبداللہ جو ایک عرصہ دراز تک کانگرس کے کلمہ گو، پنڈت نہرو کے جاں نثار اور گاندھی جی کے عقیدت مند رہ چکے تھے، کیوں بغیر مقدمہ چلائے بغیر وجہ بتائے حوالۂ حبس کر دیے گئے؟

کیا ان سوالات کے جواب میں "وطنِ مقدس" کے علاوہ کوئی اور نام لیا جا سکتا ہے؟

پنڈت نہرو کا "وطن" یہ چاہتا ہے کہ کشمیر پر ہمارا قبضہ رہے لہٰذا وہ مجبور ہیں کہ حق و صداقت کو چھوڑ دیں، اصول اور وعدے کو بھول جائیں، بین الاقوامی طور پر ذلت و رسوائی مول لیں لیکن وطن کے حکم سے انحراف نہ کریں:

غرض یہ "وطن" ایک مصیبت بن گیا ہے ان قوموں اور ملتوں کے لیے جو کمزور ہوں، جو بے مایہ ہوں، جن کا کوئی سہارا نہ ہو، جن کے کام نہ مجلس اقوام متحدہ آ سکتی ہے، نہ میثاق اوقیانوس، نہ اکابر ثلثہ (برطانیہ، امریکہ، روس) کے روزِ روشن ہیں کتنے سستے وعدے!

اقبال نے وطن کے اس سیاسی تصور کو دیکھا اور لرز اٹھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

اور ——— ۔

جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

کیونکہ مذہب نام ہے حق و صداقت کا اور وطن نام ہے استحصال اور استعمار کا، لہٰذا وہ وطن سے بیزار ہو گیا اور اس نے اپنی قوم یعنی مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اس نے بت اور اس نئے خدا سے وہ کوئی مطلب اور واسطہ نہیں، مسلمان کا دیس کوئی خاص سرزمین نہیں، اسلام ہے مسلمانوں کو اگر نسبت ہو سکتی ہے تو کسی قطعۂ ارض سے نہیں اس ذاتِ گرامی سے جس نے ہمیشہ حق کی حمایت کی اور باطل سے مقابلہ کیا جس نے وطن، قوم، ملک اور وقت سے بے نیاز ہو کر سچائی کا ساتھ دیا اور باطل سے بیزاری کا اعلان کیا جس نے ان عہدوں کو نبایا جو اس نے غیر مسلموں سے کئے تھے ان مسلمانوں کی بھی سرزنش کی جنہوں نے اسلام کے لیے کفن سر سے باندھ کر میدانِ جہاد کو زینت بخشی تھی اور اپنے جذبۂ اسلام میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ دشمن کو اماں طلبی کے باوجود قتل کر دیا تھا اس نے اپنے وطن سے، وطن والوں سے محبت کی تھی لیکن یہ محبت کبھی بھی حق و صداقت کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل نہیں ہوئی تھی، لہٰذا مسلمان "وطن" بنا سکتے ہیں تو اسلام کو، اگر نسبت قبول کر سکتے ہیں، تو صرف ذاتِ رسالت مآب کی!

چنانچہ وطن کے سیاسی تصور پر جی بھر کر نکتہ چینی کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں:

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

اور —

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اور پھر کس جوش اور جذبہ کے ساتھ مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی، خاک میں اس بُت کو ملا دے

اور پھر فرماتے ہیں:

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سُنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

یعنی ہم تو اس نبی کے پیرو ہیں جو حق کے لیے ترکِ وطن کر سکتا ہے پھر وطن کی پرستش ہم سے کیوں کر ممکن ہے ؟ سیاست کی زبان میں وطن ایک بُت ہے ایک خدا ہے اور رسالت پناہ کی زبان میں وطن وہ زاد بوم ہے ، وُہ قطعۂ ارض ہے جہاں انسان رہتا اور بستا ہے :

وطن کے نام پر سیاست اور دین کی یہ آویزش صرف اقبالؔ ہی نے محسوس کی اور اس پرستش کو اس نے مزاجِ نبوت کے خلاف سمجھ کر[1] پہلی مرتبہ اس خطرہ سے آگاہ کیا جو رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر مسلمانوں کے دلوں میں گھر کرنے لگا تھا :

---

۱ بانگِ درا منظومہ

(۴)

عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا؟

○

اب زمانہ بدل گیا ہے اور زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ حجاز کے حالات بھی بدل گئے ہیں:

آج سے (۴۰ ۔ ۵۰) سال پہلے مکہ اور مدینہ کا سفر خطرات سے بھرا ہوا تھا، ترکوں کی حکومت حجاز کے باشندوں پر سختی سے گریز کرتی تھی، خواہ وہ کیسے ہی شدید و سخت جرائم کے مرتکب ہوں، جدہ سے مکہ اور مدینہ تک کا راستہ، اونٹوں کی سواری پر طے کرنا پڑتا تھا، کیونکہ نہ لاری کا سفر ممکن تھا، نہ موٹر کا، راستہ طویل، دشوار گذار اور مہالک سے معمور، سب سے بڑا خطرہ بدوؤں کا وجود تھا، یہ دیہاتی اجڈ گنوار اور خوانخوار عرب، غریب و مفلس تھے، بھوکے اور ننگے تھے، تند خو اور ظالم تھے، حکومت ان کی دست گیری نہیں کرتی تھی، انہیں کھانے پینے کو نہیں دیتی تھی، ان کے لیے روزگار نہیں مہیا کرتی تھی، ان کے لیے وسائل حیات کی آسانیاں پیدا نہیں کرتی تھی، یہ بھی تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق کمیں میں گھات لگا کر بیٹھتے تھے اور ساربان حجاز کو لوٹتے تھے، اس لوٹ مار میں بہت سے لوگ، کچھ مزاحمت کرتے ہوئے کچھ مقابلہ کرتے ہوئے، کچھ ڈر میں، اگر ہلاک بھی ہو جاتے تھے حکومت ان بدوؤں کے سامنے اتنی بے بس تھی کہ کچھ نہ کر سکتی تھی، آج سعودی دور میں راستہ کا جو امن و امان حاصل ہے اور حاجیوں اور زائروں کو اس امن و امان کی جو سہولت حاصل ہے، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، بڑے بڑے قافلے جدہ سے چلتے تھے، لیکن عرب کے ریگزار میں گم ہو جاتے تھے، مسافروں کے خون کا نشان بھی نہیں ملتا تھا، ہڈیوں کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا!

یہ سفر، گو خطرات و مہالک سے بھرا ہوا تھا، لیکن اس کے متوالے اور شمع نبوت کے پروانے ان سب سے بے نیاز ہو کر، بلا جھجک، خطرات و مہالک سے بے پروا ہو کر سفر کرتے تھے ــــــ اگر منزل مقصود تک

پہنچ گئے تو زہے نصیب اور نہ پہنچے تو بھی فدائیانِ رسولؐ میں نام تو لکھا گیا یہ سعادت کیا کم تھی ؟

اقبال کے دل میں حبِ رسولؐ کی چنگاری ہمیشہ سلگتی رہی یہ جذبہ کبھی سرد اور مضمحل نہیں ہوا حجازِ مقدس کی خاکِ پاک سے انہیں ہمیشہ ایک عجیب قسم کی وابستگی رہی چنانچہ راستہ کی ان ناہمواریوں کے دوران بھی یہ جذبہ ترقی کرتا اور پروان چڑھتا رہا :

ایک مرتبہ انہیں خبر ملتی ہے کہ حجاج کا ایک مسافر سفرِ حجاز کے دوران میں بدوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گیا ان کی چشمِ تصور ایک حاجی کو دیکھتی ہے جو اس قافلہ میں شریک تھا جس نے اپنی آنکھوں سے حجاج کے اس نوجوان کو خاک و خون میں لتھڑتے دیکھا تھا اور پھر اس کے تاثرات کو جو درحقیقت خود انہی کے واردات و تاثرات ہیں وہ اشعار کی صورت میں بیان کرتے ہیں پوری نظم تو ممکن نہیں اس کا ایک اثر انگیز اور وجد آور حصہ یہ ہے :

حاجی کہتا ہے :

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور
اس بیاباں یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے دور

خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بیباکانہ چل

اور پھر غیرتِ عشق اسے یوں ابھارتی اور آمادہ کرتی ہے :

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا ؟
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا ؟

پھر اپنے دل کو تسلی دیتا ہے :

خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز
گو سلامت محملِ شامی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

یہ تاثرات صرف اسی شخص کے ہو سکتے ہیں جس کی رگ رگ میں عشقِ رسولؐ سمایا ہوا ہو، اقبال کی نعت اول تو

(۵)

خوابِ گاہِ نبیؐ پر فریاد

○

اقبال کو جو چیز سب سے زیادہ کھلتی تھی اور جو چیز ان کے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت تھی وُہ یہ کہ مسلمان اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف کرے اور اس کے بعد عصرِ حاضر کے سیاست دانوں سے متاثر ہو، اس کے باوجود ان نظریات کو قبول کرے اور ان افکار کو اپنا لے جو اسلام کی تخریب کے لیے وضع کئے گئے ہیں، جو ملّتِ اسلامیہ کے لیے زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتے ہیں جن کے قبول کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اپنے دین کی بنیادی حقیقتوں کو بھی، دشمنوں سے مرعوب یا متاثر ہو کر نظر انداز کر سکتے ہیں:

وُہ بارگاہِ رسالؐت میں صرف اپنے ذوق و شوق کی حکایت نہیں بیان کرتے، اپنے واردات و کیفیات پر سے پردہ نہیں اٹھاتے، اپنے تاثرات اور محسوسات کی نقاب کشائی نہیں کرتے وُہ ملّت کا حال بھی بیان کرتے ہیں ملّت کے ادبار و انحطاط کا قصہ بھی سناتے ہیں اور "خیر امت" کی ان بداندیشیوں، غلط کاریوں اور گمراہیوں کا جائزہ بھی لیتے ہیں جنہوں نے امّت کو خوار و رسوا کر دیا اور مسلمان اس شکوہ و منزلت سے محروم ہو گئے جس نے انہیں کبھی، دُنیا کی سب سے زیادہ باوقار اور با اقتدار قوم بنا دیا تھا انہیں قوم کی زبوں حالی کا اتنا صدمہ، نہیں ہوتا، جتنا قوم کی گمراہی کا ہوتا ہے وُہ اسے گوارا کر سکتے ہیں کہ قوم دنیاوی اعتبار سے غریب ہو، دولتِ دُنیا سے محروم ہو، تباہ و برباد ہو لیکن وُہ اسے گوارا نہیں کر سکتے کہ مسلمان مسلمان کہلائے لیکن طوطے کی طرح دُوسروں کے سکھائے ہوئے الفاظ دُہرائے، اپنے کانوں کو معطل کر دے اور دوسروں کے کانوں سے سُنے، اپنے دماغ کو ماؤف کر دے اور دوسروں کے دماغ سے سوچے اپنی زبان بند کر لے اور دُوسروں کی زبان سے بولے، اپنے افکار و خیالات فراموش کر دے اور دوسروں کے افکار و خیالات کو فکر و تخیل کی سامعراج سمجھ لے:

اپنے ان جذبات و تاثرات کا متعدد مواقع پر بڑے اثر انگیز انداز میں اقبالؒ نے ذکر کیا ہے ذیل میں

ایک قطعہ کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں، یہ بھی انہی تاثرات و کیفیات پر مبنی ہیں، وہی شکایت ہے وہی جذبہ، وہی سوز :

فرماتے ہیں :

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائرانِ حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے !
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

اور پھر کس درد کے ساتھ کہتے ہیں :

سنے گا اقبال کون ان کو، یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

ؔ بانگ درا ص

(۶)

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو

○

ذاتِ رسالت مآبؐ سے اقبالؔ کو عشق تھا اور یہ عشق مختلف طریقوں سے نمایاں ہوا کرتا تھا۔ وہ طرح طرح سے نئے نئے اسلوب اور ڈھنگ، نئے نئے طرز اور ڈھب سے یہ ذکر کرتے ہیں اور نہیں تھکتے یہ وہ داستان ہے جسے کہے جاتے ہیں لیکن نہ خود سیر ہوتے ہیں، نہ سننے والے، یہ وہ بیان ہے، جسے وہ رنگا رنگ طریقوں سے پیش کرتے ہیں لیکن نہ تنوع میں کمی ہوتی ہے، نہ ندرت میں، یہ وہ افسانہ ہے جسے کہتے کہتے ان کی زبان نہیں تھکتی جسے سنتے سنتے اہلِ بزم نہیں اکتاتے:

حضور رسالت مآبؐ میں پہنچنے کی تمنا نے اقبالؔ کو ہمیشہ سرگرداں رکھا، زندگی میں اگر ان کی کوئی حسرت اور تمنا تھی، تو صرف یہی۔ فکر و خیال کی دنیا میں انہیں بارہا دربارِ رسولؐ میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور اس حضوری کی داستان انہوں نے مزے لے لے کر بیان کی ہے، ہر مرتبہ جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ پہلے اسلوب سے بالکل الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے:

اسی طرح کی ایک حکایت وہ بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھکو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھکو

وہاں جا کر کیا ہوا؟

کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز!

ہمیشہ سرخوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجود و نیاز
اڑا جو پستیٔ دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

یہ بڑا نازک سوال تھا۔ اقبال کے لیے اس کا جواب دینا آسان نہ تھا:

اقبال تو اقبال تھے جن کی زندگی بہر حال تقوے اور ریاضت سے عبارت نہیں تھی، لیکن اگر یہ سوال ان لوگوں سے کیا جاتا جن کی صبح و شام صرف عبادت میں بسر ہوتی ہے، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے الٰہی میں صرف ہوتا ہے، جو میدانِ جہاد میں پہنچتے ہیں اور راہِ مولیٰ میں خاک و خون میں تڑپتے ہیں، وہ بھی فوراً اس سوال کا جواب نہ دے پاتے۔ ان کی زبان بھی گنگ ہو جاتی اور ان کے نطق و گفتار پر بھی سناٹا چھا جاتا۔

لیکن اقبال، اقبال تھا، اس کی طبع رسا نے جواب پیدا کر لیا جو صرف وہی دے سکتا تھا:

یہ وہ دور تھا جب سلطنتِ عثمانیہ پارہ پارہ ہو رہی تھی، خلافتِ اسلامیہ دم توڑ رہی تھی، مسلم ممالک پر فرنگی طاقتیں ایک ایک کر کے قابض ہو رہی تھیں، ساری دنیائے اسلام تباہی و بربادی کے گڑھے میں گر رہی تھی۔ حکومتِ ترکیہ کے حصے بخرے کرنے کی سازشیں ہو رہی تھیں، مصر اس سے چھینا جا رہا تھا، حجاز، عراق، شام اور دوسرے ترکی مقبوضات میں ہلچل پیدا کی جا رہی تھی، فرنگی سامراج ان علاقوں میں ترکوں کے خلاف بغاوت کرانے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا:

روس کا زار مسلمانوں پر ظلم توڑ رہا تھا اور جو مسلمان روس سے باہر لیکن اس کے پڑوسی تھے، انہیں بھی ہدفِ ستم بنانے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ فرانس اپنے محکوم مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا تھا، انگریز اپنے مقبوضات میں مسلمانوں کو لوٹ رہے تھے، پھانسیاں دے رہے تھے، قید و بند کی صعوبتوں میں گرفتار کر رہے تھے، ان کے مذہبی جذبات کو مجروح کر رہے تھے، ان پر طرح طرح کی ناروا اور ناقابلِ برداشت پابندیاں عائد کر رہے تھے غرض کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں مسلمان امن اور چین سے ہوں، جہاں وہ عافیت کی زندگی بسر کر رہے ہوں

ہر گوشۂ زمین ان کے لیے تنگ تھا، ہر قطعۂ ارض ان کے لیے اجنبی تھا، بقول مولانا شبلیؒ :

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو اے شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیروان کب تک ؟

یہ حالات تھے جب طرابلس الغرب کے غیور مسلمان اطالیہ کی ہوسِ جوع الارض کے خلاف شوقِ شہادت لے کر میدان میں آئے۔ ان مسلمانوں کے پاس نہ دولت تھی، نہ ساز و سامانِ جنگ، نہ اسلحہ نہ وسائل اور ذرائع، نہ لشکرِ گراں، نہ اتحادیوں کا فوج در فوج اور موج در موج عسکرِ بے نہایت :

ان کے پاس صرف یہ جذبہ تھا کہ اپنی آزادی اور استقلال کے لیے کٹ مریں، ان کے پاس، صرف یہ تھا کہ اپنی حریت پر جان دے دیں، ان کے پاس کچھ نہ تھا لیکن جو کچھ ان کے پاس تھا وہ دوسروں کے پاس نہ تھا۔ یہ حق کے لیے، سچائی کے لیے، حریت و استقلال کے لیے اپنی گردن کٹا سکتے تھے :

اطالیہ کے درندوں نے طرابلس کے مسلمانوں کا یہ چیلنج قبول کر لیا اور وہ بہیمیت، درندگی اور خون آشامی کے تمام اسلحہ اور ساز و سامان کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان مسلمانوں پر کوئی ناپاک سے ناپاک ظلم الیسا نہ تھا جسے روا نہ رکھا ہو، پھر بعد نہ جانے کتنے مسلمان ان ظالموں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرتے تھے جواب دیتے وقت اقبالؒ کی چشمِ تصور کے سامنے طرابلس کے شہیدوں کی تصویر پھر گئی اس نے کہا

حضور، دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وُہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وُہ کلی نہیں ملتی

یہ مجبوریاں اور معذوریاں پیش کرنے کے بعد اقبالؒ اپنی نذر بارگاہِ رسالت میں پیش کرتا ہے :

مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
یہ چیز وُہ ہے کہ جنت میں بھی نہیں ملتی

وُہ چیز کیا ہے، جو اقبال کے پاس ہے، مگر جنت اس سے محروم ہے ؟

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ذرا سوچیے تو سہی، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی نذر پیش کی جا سکتی تھی ؟

ے بانگ درا ص ۲۱۸-۱۹

(۷)

چراغِ مصطفویؐ اور شرارِ بولہبی

○

"ارتقا" کے عنوان سے اقبال نے ایک نظم کہی ہے نظم میں وہ تمام خوبیاں اور رعنائیاں موجود ہیں جو اقبال کی خصوصیت خاصہ بن چکی ہیں، شان دار الفاظ دل نشین اندازِ بیان، سحر آفریں اسلوب کلام دل میں کھب جانے والی، اور اُتر جانے والی ترکیبیں اور بندشیں :

لیکن ان سب خوبیوں سے بالا جو خوبی اس نظم کی ہے، وُہ ہے اس کا فلسفہ :

اس نظم میں اقبال بتاتے ہیں کہ حق و باطل کی کشمکش، نہ کوئی نئی چیز ہے نہ اس میں تعجب کی کوئی بات ہے یہ نہ ہو تو کلامِ کائنات میں ایک خلا پیدا ہو جائے، وہ ذوقِ حیات نابود ہو جائے جس نے زندگی کو قائم اور باقی رکھا ہے، باطل بے شک باطل ہے اور اسی لیے ہے کہ خائب و خاسر ہو، ناکام و نامراد ہو لیکن حق کی سربلندی اور رفعت کے لیے اس کا وجود بہر حال ضروری اور ناگزیر ہے! ——— !

اقبال بتاتا ہے کہ "چراغِ مصطفویؐ" اور "شرارِ بولہبی" میں آویزش اور کشمکش آج سے نہیں ہمیشہ سے قائم ہے اور جب تک دُنیا قائم رہے گی یہ کشمکش بھی موجود رہے گی :

وُہ کہتا ہے ———.

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اور پھر نہایت شاندار الفاظ میں، نہایت شاندار مفہوم کی طرف بازگشت کرتے ہوئے کہتا ہے :

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

وُہ چیز کیا ہے، جو اقبال کے پاس ہے، مگر جنت اس سے محروم ہے؟

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ذرا سوچیے تو سہی، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی نذر پیش کی جا سکتی تھی؟

---

۵ بانگِ درا ص ۲۱۸-۱۹

(۷)

چراغِ مصطفویؐ اور شرارِ بولہبی

○

"ارتقا" کے عنوان سے اقبالؔ نے ایک نظم کہی ہے نظم میں وہ تمام خوبیاں اور رعنائیاں موجود ہیں جو اقبال کی خصوصیت خاصہ بن چکی ہیں، شان وار الفاظ دل نشین اندازِ بیان، سحر آفریں اسلوبِ کلام دل میں کھب جانے والی، اور اُتر جانے والی ترکیبیں اور بندشیں :

لیکن ان سب خوبیوں سے بالاتر خوبی اس نظم کی ہے، وُہ ہے اس کا فلسفہ :

اس نظم میں اقبال بتاتے ہیں کہ حق و باطل کی کشمکش، نہ کوئی نئی چیز ہے نہ اس میں تعجب کی کوئی بات ہے یہ نہ ہو تو کلام کائنات میں ایک خلا پیدا ہو جائے، وہ ذوقِ حیات نابود ہو جائے جس نے زندگی کو قائم اور باقی رکھا ہے، باطل بے شک باطل ہے اور اسی لیے ہے کہ خائب و خاسر ہو، ناکام و نامراد ہو لیکن حق کی سربلندی اور رفعت کے لیے اس کا وجود بہرحال ضروری اور ناگزیر ہے! ——!

اقبال بتاتا ہے کہ "چراغِ مصطفویؐ" اور "شرارِ بولہبی" میں آویزش اور کشمکش آج سے نہیں ہمیشہ سے قائم ہے اور جب تک دُنیا قائم رہے گی یہ کشمکش بھی موجود رہے گی :

وُہ کہتا ہے ——.

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اور پھر نہایت شاندار الفاظ میں، نہایت شاندار مفہوم کی طرف بازگشت کرتے ہوئے کہتا ہے :

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

"مشکل کشی اور صفا طلبی" کی داستان بیان کر چکنے کے بعد، وہ ایک نیا رُخ، ایک نیا پہلو پیش کرتا ہے:

سکوتِ شام سے نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

اور اب وہ خاکِ تیرہ دروں اور شیشۂ حلبی پر روشنی ڈالتا ہے:

کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش خراش
ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

اور اس کے بعد وہ "قطرۂ نیساں" اور "آتشِ عنبی" کو سامنے لاتا ہے:

مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی

اور پھر بتاتا ہے:

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

---

(۸۱)

دہر میں اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اُجالا کر دے

○

"اقبال کا شکوہ اور جوابِ شکوہ" ایک زمانہ تھا کہ بچہ بچہ کی زبان پر تھا، یہ نظم بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں چھپی ہے اور اس کا ان گنت آدمیوں نے ذوق و شوق اور جوشش و خروش سے مطالعہ کیا ہے اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ اقبال کی اردو شاعری میں شکوہ اور جواب شکوہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے یہی نظم ہے جس نے اقبال کی شاعری کو مسلم عوام سے روشناس کرایا اور ہر مسلمان کے گھر میں ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جانے لگا :

شکوہ میں اقبالؔ نے خداوند جل وعلیٰ سے شکایت کی ہے کہ :

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

کوئی شبہ نہیں، زبان و بیان، شکوہِ الفاظ اور وقارِ معنی کے اعتبار سے یہ نظم اردو شاعری میں ایک مرتبہ خاص کی حامل ہے :

جوابِ شکوہ خدا کی طرف سے مسلمانوں کے شکوہ کا جواب ہے، اس میں اقبال نے بتایا ہے کہ اس کا شکوہ جب بارگاہِ الٰہی میں پہنچا تو وہاں سے کیا جواب ملا :

یہ نظم بھی جوشش و اثر کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی، بلکہ متعدد حیثیات سے شکوہ سے بڑھی ہوئی ہے اس میں پہلے تو مسلمانوں کی بے عملی اور بدعملی پر زجر و توبیخ کی گئی ہے پھر ان کی زبوں حالی اور پستی کے اسباب و عوامل بیان کئے گئے ہیں اور پھر انہیں اُکسایا گیا ہے کہ ان تباہیوں اور بربادیوں سے وہ متاثر نہ ہوں اپنی حقیقت اور حیثیت پہچانیں اور اپنے اندر پھر وہی خصوصیات و صفات پیدا کریں جنہوں نے مسلمانوں کو آدھی سے زیادہ دُنیا

پر حکمران کر دیا تھا، اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی طلبِ صادق رکھتا ہو تو ہم :

ڈھونڈنے والوں کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں

نئی دُنیا ، یعنی امریکہ :

اس نظم میں اقبالؔ خدا کی طرف سے بندۂ مومن کو مخاطب کرتے ہیں اور کیسے تیور کے ساتھ کہتے ہیں

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

اور اس اطمینان دہی اور یقین دہانی کے بعد ، کتنے دل لبھا لینے والے انداز میں مسلمان کو مخاطب کر کے اُسے آمادۂ عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں :

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ ، تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

اور یہ سب کچھ کر کے اے مردِ مسلماں !

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

اور جس "اسمِ محمدؐ" کی یہ برکت ہے ، اس کی توصیف خدا کی طرف سے ، اقبالؔ اپنے الفاظ میں یُوں کرتے ہیں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دُنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

کیونکہ :-

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اور یہ نام، یہ اسمِ گرامی وہ کون مقام ہے جہاں نہیں لیا جاتا؟ مسلم آبادی کا وہ کونسا حصّہ ہے جہاں یہ نام بالیدگیٔ روح کا سبب نہیں، دُنیا کے دانش کدوں، علم کے میدانوں اور یقین کے ایوانوں میں وہ کون سی جگہ ہے جہاں اس کا چرچا نہیں، جہاں اس کی شانِ جلال وجمال کا ذکر نہیں؟ جہاں اس کی تطہیر اور تعمیر کا شور نہیں؟ یہ نامِ نامی تو وہ ہے کہ دشمن بھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اس کی بڑائی اور بزرگی کے قائل ہیں:

ہاں، تو یہ نام ہے کہ:

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کے آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایماں میں ہے

نہ دیکھنا چاہے تو بھی:

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے[1]

اقوامِ عالم کے ادیان و مذاہب کے برعکس اسلام اپنے اندر کچھ عجیب خصوصیتیں اور امتیازات پوشیدہ رکھتا ہے:

اسلام شخصیت پرستی کا سخت مخالف ہے، لیکن اوصاف و محامد کی اتباع و تقلید کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ دُوسرے مذاہب کچھ اصول دیتے ہیں ماننے والوں کو، کچھ پند و تلقین سے کام لیتے ہیں، لیکن اسلام، تعلیم کے ساتھ معلّم کا اہتمام بھی کرتا ہے، وہ اصول بھی دیتا ہے اور اصول پر عمل کرنے کے لیے ایک نمونہ بھی دیتا ہے، وہ پند و تلقین کرتا ہے لیکن ایک ایسا اسوۂ کامل بھی عطا کرتا ہے جو اس پند و تلقین کے اجمال و تفصیل پر عمل کر کے دکھا دیتا ہے، دُوسرے مذہب والے اپنے جنیوں اور پیمبروں کو صرف مانتے ہیں ان کی تقلید

---

[1] بانگِ درا، ص ۲۳۱

کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنے نبی اور پیمبر کی تاریخ سے اس کے سوانح حیات سے، اس کے کردار اور سیرت سے، اس کی شخصیت اور اسوہ سے قطعاً ناواقف ہیں، اس سلسلے میں ان کا علم داستان اور افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ہے دنیا کے پیمبروں میں صرف محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات ایسی ہے جن کی حیات طیبہ کا ایک ایک جزیہ اور ہر ہر تفصیل پوری شرح و بسط اور صحت و استناد کے ساتھ موجود ہے، اس نے قرآن پر کس طرح عمل کیا، اس نے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، اس کا دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ میدانِ جنگ میں اس کی شان کیا تھی؟ گھر میں اس کا دستور کیا تھا؟ دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ وہ کس طرح پیش آتا تھا؟ مخالفوں اور بدخواہوں سے اس کا انداز کیا تھا؟ وقت کے سلطانوں اور بادشاہوں سے وہ کس طرح نامہ و پیام کرتا تھا؟ اور اپنے محکوموں کے ساتھ اس کا طرزِ عمل کیا تھا؟ اپنی اُمت کے ساتھ اس کا رویہ کیا تھا؟ دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم اور برگشتہ بخت ہستی —— عورت —— کو اس نے کیا کچھ دیا عبادت و ریاضت کے اعتبار سے اس کی کیا کیفیت تھی؟ وہ راتوں کو کس طرح جاگتا تھا؟ دن کو کس طرح مصروفِ عبادت رہتا تھا؟ اندھوں، بوڑھوں، اپاہجوں اور معذوروں کے ساتھ اس کی شفقت کا کیا عالم تھا؟ غیر مسلموں کے ساتھ جب کہ وہ کوئی چارہ کار نہ رکھتے ہوں وہ کس رواداری، اپنائیت اور محبت کے ساتھ پیش آتا تھا، غیر مذاہب کے رہنماؤں اور سرداروں کے ساتھ دینی اختلاف کے باوجود اس کی معاملت کا کیا ڈھنگ تھا؟ اس کی سادگی، فقر اور فروتنی کی شان کیا تھی؟ غلاموں اور ناچاروں کے ساتھ اس کا برتاؤ کیا تھا؟ گھر میں عزیزوں کے ساتھ، دوستوں کے ساتھ، بیویوں کے ساتھ، خادموں کے ساتھ اور غلاموں اس کی شفقت محبت اور سلوک و احسان کا حال کیا تھا؟ یہ ساری باتیں اپنی پوری تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ صحت و استناد کی، پوری احتیاط کر ملحوظ رکھتے ہوئے اگر دنیا میں کسی شخص کے بارے میں حاصل کی جا سکتی ہیں تو وہ ایک ہی شخص ہے

—— محمدؐ، بابا تنا داحہاتنا :

اسی ایک ہستی کو خدائے بزرگ و برتر نے مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اسی ایک ذات کے بارے میں فرمایا ہے :

(وما ینطق عن الھوٰی، ان ھو الا وحی یوحٰی)

مسلمان جب تک اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے رہے، سربلند رہے جس روز سے انہوں نے اسے فراموش کر دیا، ان کا ادبار و زوال شروع ہو گیا، اب بھی اگر وہ سربلند و سرفراز ہونا چاہتے ہیں، تو ان

کے لیے وہی ایک راستہ ہے ———— اتباعِ محمدؐ
چنانچہ خدا کہتا ہے :

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم تیرے ہیں

لے بانگِ درا

(۹)

قومِ رسولِ ہاشمی

مغرب کی قومیت، رنگ و نسل اور ملک و نسب پر مبنی ہے، اسلام کی قومیت ہم خیالی اور اشتراک عقائد پر مبنی ہے، یورپ کی قومیت قدرت کا عطیہ ہے جس میں انسان کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، یہ کس انسان کے بس میں ہے کہ وہ فلاں ملک یا فلاں خاندان میں پیدا ہو؟ اسلام کی قومیت اختیاری اور رضاکارانہ چیز ہے، ہر شخص اپنی قوتِ مدرکہ سے کام لے کر اسلام کے حصارِ قومیت میں داخل ہو سکتا ہے کیونکہ نہ یہاں رنگ کی قید ہے، نہ ملک کی، نہ منسب کی، نہ نسل کی:

ہٹلر نے جب جرمنی میں آرین قوم کی برتری کا پرچار شروع کیا تو اس نے سب سے پہلے جو فریضہ انجام دیا، وہ یہ تھا کہ جتنے غیر آرین یعنی نسلی اعتبار سے غیر جرمن وہاں بستے تھے، انہیں جرمنی چھوڑنے پر مجبور کر دیا حد یہ ہے کہ نظریۂ اضافیت کا خالق اور دنیا کا سب سے بڑا ماہر سائنس دان یعنی آئن سٹائن تک اپنا وطن ہٹلر کی دراز دستیوں کے باعث چھوڑنے پر مجبور ہو گیا، جنوبی افریقہ میں آج ۱۹۵۶ء کے وسط میں بھی غیر سفید فام اقوام کو یہ اجازت نہیں کہ وہ یورپین رقبہ میں مکان خرید سکیں، جائداد بنا سکیں، رہائش اختیار کر سکیں، پاکستان اور ہندوستان کے جن باشندوں نے جنوبی افریقہ کے جنگلوں کو کاٹا، صحراؤں کو آباد کیا، جنہوں نے وہاں فلک بوس عمارتیں بنائیں، کاروبار کو فروغ دیا، تجارت بڑھائی، وہاں کا معیارِ حیات بلند کیا، جنہوں نے اس ویرانہ کو گلزار بنا دیا، آج وہ ریل کے ان ڈبوں میں سفر نہیں کر سکتے، جو یورپینس کے لیے مخصوص ہیں ان شاہراہوں سے نہیں گذر سکتے جو یورپین ہیں، ان کلبوں اور ہوٹلوں میں قدم نہیں رکھ سکتے جہاں صاحب جاتا ہے، امریکہ کتنا بڑا جمہوریت پرست، انسانیت دوست اور مظلوم پرور ملک ہے لیکن اسی امریکہ میں، امریکہ کے اصل اور قدیم باشندوں — حبشیوں — کو عام شہری حقوق بھی حاصل نہیں ہیں، وہ گوروں کے ساتھ

پڑھ نہیں سکتے، تعلیم نہیں حاصل کر سکتے، سیر و تفریح نہیں کر سکتے اور اگر قسمت کا مارا کوئی حبشی کسی امریکن گرل سے ملوث ہو جائے تو عدالت کے فیصلہ کا انتظار کئے بغیر گوری مخلوق اس کالے کو دن دھاڑے برسرِ عام آگ کے شعلوں میں جھلس دیتی ہے اور حکومت کچھ نہیں کر سکتی، ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں آج بھی ایسے لوگ رہتے ہیں جو اچھوت کہلاتے ہیں ان کا اور ہندوستان کی فرماں روا قوم کا مذہب ایک ہے لیکن خاندان مختلف ہے اور اس کی سزا یہ ملتی ہے کہ وہ عام اسکولوں میں تعلیم نہیں حاصل کر سکتے، مندروں میں نہیں داخل ہو سکتے، کنوؤں سے پانی نہیں بھر سکتے، وید مقدس کی تعلیم نہیں حاصل کر سکتے، رشتہ و پیوند کے تعلقات نہیں قائم کر سکتے ——— ہندوستان کا آئین اصولی طور پر اچھوتوں کو یہ تمام حقوق دیتا ہے جو بھارت کے دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں، صرف کاغذ پر عملاً وہ آج بھی اتنے ہی ذلیل اور پسماندہ ہیں جتنے آج سے ہزاروں برس پہلے تھے :

اس کے برعکس اسلام ان حد بندیوں کا قائل نہیں ہے وہ ملک و نسب اور رنگ و نسل کا قائل نہیں ہے وہ انسان کی رفعت و منزلت کو پیدائشی اور خاندانی طور پر تسلیم نہیں کرتا اسے موقع دیتا ہے حق دیتا ہے کہ وہ خود اپنی خوش کرداری سے کام لے کر اپنے لیے ایک مقام متعین کر لے یہ اس پر منحصر ہے نہ کہ رنگ و نسل پر کہ وہ اچھا مانا جائے یا بُرا ؟ رنگ اور نسل انسان کی اختیاری چیز نہیں ہے لیکن خوش اطواری حسنِ عمل اور کارِ نمایاں یہ تو انسان کے بس میں ہے، اسلام اسی کو مدارِ فضیلت قرار دیتا ہے اور اس طرح دُنیا میں پہلی مرتبہ صحیح بنیادوں پر ایک بلند و برتر معاشرہ عالمِ وجود میں آتا ہے :

لیکن اس سے بڑھ کر بھی رنج و افسوس اور حسرت و تاسّف کا کوئی مقام ہو سکتا ہے کہ مسلمان نے اسلام کی صحیح تعلیم کو فراموش کر دیا اور وہ ملک و نسب اور رنگ و نسل کے بت کی پوجا کرنے لگے اقبال کا حساس دل جب یہ دیکھتا ہے تو تڑپ اٹھتا ہے وہ مسلمانوں کی ہر کمزوری معاف کر سکتا ہے لیکن نہیں بخش سکتا تو یہ جرم کہ مسلمان خواجہ دوجہاں کے بتلائے ہوتے راستہ سے روگرداں ہو جاتے : کتنی بے ساختگی اور جوش کے ساتھ لیکن کتنی صفائی سے کہتا ہے :

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسُولِ ہاشمی

تجھ میں اور اقوام عالم میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ :

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اور پھر بتاتا ہے کہ :

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت ، تو ملت بھی گئی[1]

---

[1] بانگِ درا صـ ۲۷۹

(۱۰)

جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ میں

○

جب رسول کا جو واقعہ بھی اقبال کو مل جاتا ہے اُسے وہ اپنا موضوع بنا لیتے ہیں اور پھر ایسے جوش و خروش اور والہانہ سرشگی کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کے قلوب پر اپنی تاریخ بھی نقش ہو جاتی ہے اور اپنے اکابر کے ناقابلِ فراموش واقعات بھی :

جنگ یرموک، تاریخ اسلام میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے اس نے دنیا کو ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت یاد کرا دی کہ فتح و شکست کا انحصار قلت و کثرت پر نہیں ہوتا، ساز و سامانِ جنگ پر بھی نہیں ہوتا حتیٰ عصبیت اور ملی برتری کے جذبہ پر بھی نہیں ہوتا، میدان صرف انہی کے ہاتھ رہتا ہے جو مرنا جانتے ہیں جو شوق اور مسرت کے ساتھ موت کا استقبال کر سکتے ہیں، جن کے سر میں سوائے شہادت ہو، جو زندگی دے کر موت خرید سکتے ہیں :

جنگ یرموک میں مسلمان بہت کم تھے، اتنے کم کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اور رومی لشکر حدِ شمار سے خارج تھا، دشمن کے پاس ہر طرح کا ساز و سامان تھا۔ نہ اسلحہ کی کمی تھی نہ آلات حرب کی، وسائل غذائیہ کی بہتات تھی، رسد رسانی کا مکمل انتظام تھا اور مسلمان فاقہ مست تھے تیر ہے تو کمان نہیں، تلوار ہے تو میان نہیں، روٹی ہے تو سالن نہیں، تہمد ہے تو پیراہن ندارد، پھر بھی وہ اس جوش و خروش، تہوّر اور دلیری، شجاعت اور بہادری سے لڑے کہ دشمن کے چھکے چھڑا دیئے، قتل ہوئے نقصان اُٹھایا لیکن دشمن کو ایسی شکست دی کہ اس نے میدانِ جنگ میں پھر نہ آنے کی قسم کھالی یہ جنگ بڑی فیصلہ کن معرکہ آرائیوں میں اپنی اسی خصوصیت کے باعث شمار ہوتی ہے :

اقبال نے اس جنگ کا ایک واقعہ چنا اور اُسے اپنے خاص انداز میں بیان کر دیا یہ عاشقِ حُبِ رسول

کا ایسا اثر انگیز اور وجد آور نمونہ ہے کہ واقعی مسلمانوں کے لیے شمعِ ہدایت کا کام ابد تک دیتا رہے گا :

اقبالؔ میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتے اور اس کی کیفیت بتاتے ہیں :

صف بستہ تھے ، عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظر حنا کی ، عروسِ زمینِ شام

اتنے میں ایک نوجوان شوقِ جہاد سے چور اور نشۂ شہادت سے مخمور ، سپہ سالار لشکر ، ابو عبیدہؓ کے پاس حاضر ہو کر ، اذنِ پیکار طلب کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس رزم آرائی کا محرک کیا ہے ؟

بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہؐ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

مردِ مجاہد کی یہ کیفیت دیکھ کر سپہ سالار لشکر کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے :

جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغِ بے نیام

اور —— :

بولا امیرِ فوج کہ وہ نوجوان ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیںؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے

ے بانگ درا ص ۲۷۹

(۱۱)

کرم اے شہِ عرب و عجم

طرح طرح سے، نئے نئے رنگ اور نئے نئے ڈھب سے اقبال مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں، پند و موعظت سے کام لیتے ہیں تاریخ اور روایات سے کام لیتے ہیں، جوشش و خروش کو سہارا بناتے ہیں، غیرت و حمیت کی آڑ لیتے ہیں تقابل اور موازنہ کرتے ہیں، آئینِ زمانہ بتاتے ہیں، دُنیا کی ریت رسوم پر توجہ دلاتے ہیں اور بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لانے کی کوشش کرتے ہیں، اور آخر شہِ عرب و عجم سے فریاد کرتے ہیں اور الفاظ کی صورت میں دل کے ٹکڑے پیش کر دیتے ہیں:

اقبال کی نظم میں اور تو اسی قسم کے جذبات و تاثرات کی آئینہ دار ہے، چند اشعار آپ بھی سُن لیجے:

تری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

یعنی اصل چیز شررِ حیات ہے یہ اگر ہے تو سب کچھ ہے، حیدرِ کرار کا گذارہ جو کی سوکھی روٹی پر ہوتا تھا لیکن وہی خیبر شکن بھی ثابت ہوئے، پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو، وہی سرشتِ سمندری

وہی جذبہ جو پہلے شعر میں اُبھرا تھا، اس شعر میں اور زیادہ نمایاں ہو گیا ہے، چراغِ حرم سے بڑھ کر شرارِ آرزو کس کے سینہ میں بیتاب ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس سے ایسا طرزِ طواف دریافت کرتے ہیں جو سرشتِ سمندری یعنی محبوب و مطلوب کے لیے جل مرنے کی ہمت اور جرأت پیدا کر دے، پھر دفعتاً اقبال کے سامنے مسلمانوں کی

موجودہ حالت آجاتی ہے ، ان کے باہمی اختلافات چھوٹے مقاصد پر بڑے مقاصد کو قربان کر دینے کی کمزوری، قوم وملت کے مقابلہ پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کی ذہنیت ذرا ذرا سی باتوں پر پیکار، باہمی تکفیر کا شوق ، تفسیق کے فتوے ، دین سے بے رغبتی ، دنیا طلبی کی حرص میں ملت فروشی اور خدا فراموشی ، اسلام کے اصول سے روگردانی ، اسلام کی تعلیم سے غفلت داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیام سے بے پروائی اور جب یہ سب چیزیں سامنے آتی ہیں تو بے ساختہ ان کی زبان پر یہ الفاظ آجاتے ہیں :

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

یعنی یہ اختلاف تو بت پرستوں میں ہونا چاہئیں تھے ، لیکن ہم موحدوں میں انہوں نے ایسی جڑ پکڑ لی ہے کہ اصنام پرستوں سے بھی ہم بازی لئے جا رہے ہیں ، ان حرکتوں کا علم بتکدے کے کسی بڑے پجاری کو ہو جائے تو وہ بھی ہری ہری پکار اٹھے :

اور اب وہ ایک بہت پرانی بات بالکل نئے رنگ میں پیش کرتے ہیں :

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی ، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی ، وہی مرحبی وہی عنتری

پھر یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد وہ آستانہ نبوی پر حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں :

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری[۱]

---

۱ بانگ درا صـ۲۸۵

(۱۲)

سیّدِ کُلؐ، صاحبِ اُمّ الکتابؐ

اقبال کسی ایسی چیز کے قائل نہیں ہیں جس پر دین کی ، اور داعیِ اسلامؐ کی مہرِ تصدیق ثبت نہ ہو۔ وہ علم دین کی تحصیل و تکمیل کی طرف اگر اپنی قوم کو راغب کرتے ہیں تو اس لیے کہ خدا نے ایسا کہا ہے اور رسُولؐ نے ایسی تعلیم دی ہے ان کا اوڑھنا بچھونا مذہب ہے ان کی زندگی کا مقصد صرف رسولؐ کے نقشِ قدم کا دیکھنا، اسے آنکھوں سے لگانا اور اسی راہ پر رہ روی کرنا ہے۔

دُوسرے مذاہب کی طرح اسلام "علم" پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ وہ طرح طرح سے مسلمانوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ علم حاصل کریں، قرآنِ کریم کی آیتیں اور حدیثِ نبویؐ کی مثالیں اس دعوے کی بہترین شاہد ہیں:-

لیکن مسلمانوں نے جہاں اور بہت سی چیزیں چھوڑ دیں وہاں علم سے بھی ترکِ تعلق کر لیا، ایک وہ زمانہ تھا کہ یورپ کے جہالت کدے میں، انہوں نے علم کی شمع جلائی اور جب یورپ کے پادری اور حکمران طالبانِ علم و حق کے گلے کاٹ رہے تھے انہیں اذیتیں دے رہے تھے، انہیں لرزہ خیز اور عبرت انگیز سزاؤں کا ہدف بنا رہے تھے مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو علم دیا، نئے نئے علوم سے آشنا کیا، ایجادات و اختراعات کی دُنیا میں نام پیدا کیا، علومِ عصری میں اضافہ کیا، محققینِ قدیم کے علمی اور تصنیفی کارناموں میں شاندار اضافے کئے اور انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا:

لیکن وہی مسلمان ادبار و فلاکت کے گڑھے میں گرے، انحطاط و زوال سے دوچار ہوئے تو انہوں نے علم سے منہ موڑ لیا، ہندوستان کی حکومت جب ان کے ہاتھ سے گئی تو وہ بہت جلد اپنے اس نقصانِ عظیم کی تلافی کر سکتے تھے اگر انہوں نے علم حاصل کیا ہوتا لیکن وہ اس طرف متوجہ نہ ہوئے اور برادرانِ وطن ان سے اس

میدان میں گرتے سبقت لے گئے، رفتہ رفتہ وہ آگے بڑھے اور حکومت کے کاروبار پر حاوی ہو گئے اور مسلمان پستی کے گڑھے میں گرتے رہے ــــ جن روشن ضمیر مسلمانوں نے اس طرف توجہ کی، انہیں کفر کے فتووں سے نوازا گیا، اور ان کی بات سنی ان سنی کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی پستی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا :

اس حقیقت کو اقبالؔ نے محسوس کیا اور غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی یہ غفلت یہ علم بیزاری، فرمانِ الٰہی اور ارشادِ رسولؐ سے بے خبری اور لاعلمی کا نتیجہ ہے ورنہ ممکن نہ تھا کہ مسلمان اس راستہ کو اختیار کرتے، چنانچہ سب سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ علم و حکمت کے بارے میں باری تعالٰے کا ارشاد کیا ہے ؟

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی ــ بگیر

پھر بتاتے ہیں کہ سرورِ کائناتؐ نے علم اور حصولِ علم کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے ؟

سیدِ کُلؐ، صاحبِ اُم الکتاب
پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب

اس تعریف کے بعد کہتے ہیں اور کتنے پتے کی بات کہتے ہیں :

گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید
ربِّ زدنی، از زبانِ او چکید

یعنی اگرچہ سرورِ کائناتؐ کے اختصاص کا یہ عالم تھا کہ ہر محجوب چیز ان پر روشن تھی، انہوں نے ذاتِ باری تعالٰے تک کو بے پردہ دیکھا تھا لیکن ان کی زبان پر بھی :

رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا

اے میرے رب میرے علم میں اضافہ کر

کے الفاظ جاری رہتے تھے جب ان کے شوقِ علم کا یہ عالم تھا تو ہم، ان کے اُمتی، علم سے بے بہرہ کیوں ہو گئے ہیں ؟ کیوں نہیں طلبِ علم پر آمادہ ہوتے ؟

اور پھر آخری بات کہتے ہیں کتنے دل فریب اور دل آویز انداز میں :

علمِ اشیا علّم الاسماستے
ہم عصا و ہم ید بیضاستے[1]

یعنی علم اشیا ہی درحقیقت وہ علم ہے جو عصا کا کام بھی کرتا ہے اور ید بیضا کا بھی :

---

[1] پیام مشرق ص ۱

(۱۳)

ذرۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب

ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے ؟ ایک مسلمان کو کس طرح کی زندگی بسر کرنی چاہیئے ؟ ایک مسلمان کے لیے وہ کون سا نمونہ اور اسوہ ہے جو دلیلِ راہ اور شمعِ ہدایت کا کام دے سکتا ہے ؟

یہ ہے وہ سوال جس کا جواب دنیا کے دوسرے مفکر جو چاہیں دیں لیکن اقبالؔ کے دانش کدے سے اس کا صرف ایک ہی جواب مل سکتا ہے اور وہ یہ ہے :

ذرہ عشقِ نبیؐ از حق طلب !

جس کا دل عشقِ نبیؐ کا گنجینہ بن گیا اس نے سب کچھ پالیا اسے سب کچھ مل گیا ، بحر و بر کی حکومت اس کے ہاتھ آگئی :

اس حقیقت کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

یعنی جس کی پونجی عشقِ مصطفےٰؐ ہے اس کے گوشۂ داماں سے بحر و بر لپٹے رہتے ہیں یہ ایسی بڑی پونجی ہے کہ اس کے سامنے ، دولت کونین کوئی ہستی نہیں رکھتی یہ حاصل ہے تو کائنات کی سب سے بڑی نعمت حاصل ہے۔ اس نعمت کا حصول ممکن کس طرح ہے ؟ اس کی تدبیر و ترکیب کیا ہے کہ یہ نعمتِ بیکراں حاصل ہو جائے اور بحر و بر دامن سے وابستہ ہو جائیں :

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب

سوزِ صدیقؓ و علیؓ اگر مل جائے اور عشقِ نبی کی دولت تھوڑی سی ہی حاصل ہو جائے تو مقصد حاصل ہو گیا زندگی بن گئی، آرزو پوری ہو گئی :

پھر آگے چل کر بتلاتے ہیں مسلمانوں کی انفرادی زندگی نہیں، ملّت کی اجتماعی زندگی جس چیز پر منحصر ہے وہ یہی عشقِ رسولؐ ہے :

زانکہ ملّت را حیات از عشق اوست !
برگ و سازِ کائنات از عشقِ اوست [1]

---

[1] پیامِ مشرق ص

(۱۴)

نگاہِ محمدؐ عربی

○

نکتہ توحید اور حُبِ رسولؐ کی نعمت سے مالامال ہونے کے بعد اقبال کی نظر میں ہر چیز ہیچ اور بے حقیقت ہو کر رہ گئی تھی، انہوں نے دانش کدوں کو بھی کھنگالا تھا اور بُت کدوں کی سیر بھی کی تھی، انہوں نے عقل کی گرہ کشائیاں بھی دیکھی تھیں اور یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ عقل ہی ہے جس کی نارسائی کا یہ عالم ہے کہ گرہ پر گرہ لگاتی چلی جاتی ہے انہوں نے یہ سب کچھ دیکھ کر محسوس کیا تھا وہ نگاہ کیمیا اثر صرف رسالت مآبؐ ہی کی ہے جو طلسم مجاز کو آن کی آن میں توڑ دیتی ہے اور حقیقت برافگندہ نقاب کا جلوہ نگاہ کے روبرو پیش کر دیتی ہے: ان ہی حقائق و معارف کو بیان کرتے ہوئے اقبال نئے انداز اور نئے اسلوب سے اپنے عمیق تاثرات بیان کرتے ہیں، جن میں حلاوت بھی ہے اور تندی بھی یہ وہ بادۂ سرجوش ہے جو اپنے اندر نشہ بھی رکھتا ہے اور فکر و خیال کی رعنائیاں بھی:

چنانچہ فرماتے ہیں اور کیسے پرخروش انداز میں فرماتے ہیں:

تب و تاب بُت کدۂ عجم، نرسد بہ سوز و گداز من
کہ بیک نگاہِ محمدِ عربی گرفت مجازِ من

کہتے ہیں:-

چہ کنم کہ عقل بہانہ جو گرہے بروئے گرہ زند
نظرے اگر گردشِ چشمِ تو شکند طلسمِ مجازِ من[۱]

---

۱ پیام مشرق ص ۲۰۸

گفتۂ خیر البشر

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشر
ہست شیطاں از جماعت دُور تر

(۱۵)

گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست

○

نعت میں بہت سے لوگوں نے زبان کھولی ہے اور حق یہ ہے کہ خوب کہا ہے، خوب تر کہا ہے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ، خیال اتنا رفیع اور عالی کہ اس کی مثال ملنا مشکل، جدت و ندرت کی یہ کیفیت کہ دوسروں کے دواوین اور کلیات پر ایک قصیدہ بھاری ہے، بندش کی دلکشی، گہرائی، عنائی ترکیب کا حسن، ردیف و قافیہ کی بادیہ پیمائی یہ سب چیزیں مل کر ایک طلسم بن جاتی ہیں ایک ایسا طلسم جو دل کو موہ لیتا ہے، دماغ کو خرید لیتا ہے :

یہ حربے اقبالؔ کو بھی آتے ہیں ان میں سے کوئی حربہ ایسا نہیں ہے جو اقبالؔ کے اسلحہ خانے میں نہ ہو لیکن ان سب سے بالا و برتر اقبالؔ کے پاس ایک چیز اور بھی ہے اور یہ چیز جس فراوانی سے اقبالؔ کے ہاں ملتی ہے، بے خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے، کسی اور کے ہاں نہیں ملتی، کم از کم اس شان اور کثرت سے نہیں ملتی اور وہ چیز ہے نشۂ عشق :

یہ ایک شعر ہے لیکن اس ایک شعر میں اقبالؔ نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ دوسرے ہزاروں صفحات میں بھی نہیں کہہ سکتے :

اگرچہ زیبِ سرش افسر و کلاہے نیست
گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست [1]

کتنے سبک الفاظ ہیں، کتنا واضح مفہوم ہے کیسی سادہ ترکیب ہے، کتنا دل آویز انداز بیان ہے لیکن روحِ جانِ سخن ــــ یہ ایک شعر ہے گھنٹوں اور پہروں، دنوں اور ہفتوں مہینوں اور برسوں، بلکہ ساری عمر اسے پڑھتے رہیئے اور ہر مرتبہ ایک نیا تاثر ایک نئی کیفیت اپنے اوپر طاری کر لیجئے :

---

[1] پیامِ مشرق ص۱۴۸

(۱۹)

یا رسول اللہ

○

اقبال جب کبھی حضورِ رسالت میں زبان کھولتے ہیں تو ان کی کیفیت قابلِ دید ہوتی ہے ان کا اندازِ گفتار کچھ عجیب قسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے وہ خدا کی بارگاہ میں تو شوخ اور بے باک نظر آتے ہیں لیکن بارگاہِ رسالت میں پہنچ کر ان پر کچھ ایسی از خود رفتگی اور ربودگی کی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں لیکن اس خود فراموشی میں بھی وہ کام کی باتیں نہیں بھولتے :

دیوانہ بکارِ خویش ہشیار

اقبال پر پوری طرح صادق آتا ہے :

ذرا تصور کیجئے، اقبال اپنے وطن سے رختِ سفر باندھ کر دیارِ حبیب میں پہنچتے ہیں اور وہاں پہنچ کر روضۂ رسول پر حاضری دیتے ہیں، فرماتے ہیں :

بہرِ ولیز تو از ہندوستاں آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

اور پھر یہ برہمن زادہ کس جوش اور والہانہ سرگشتگی کے عالم میں کہتا ہے :

تیغ لا در پنجۂ ایں کافرِ دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الّائے من

اور آخری شعر میں تو دل نکال کر رکھ دیتے ہیں :

باخدا در پردہ گویم ، با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من

سفینہ پیام حق ص ۱۴۱ او پنہاں و تو پیدائے من کا کوئی جواب ہو سکتا ہے دنیائے شاعری میں ؟

(۱۷)

اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ

اقبالؔ کی زندگی درحقیقت مختلف کیفیات کی آئینہ دار تھی ـــــ مختلف کیفیتیں گذرتی رہتی تھیں اس فلسفی شاعر پر۔

لیکن جس کیفیت کو ثبات و دوام حاصل تھا، وہ تھی عشق رسولؐ کی کیفیت انہیں ذات رسالت مآب کے ساتھ عشق تھا اور یہ عشق مختلف صورتوں اور پہلوؤں کے ساتھ نمایاں ہوا کرتا تھا، یہ عشق خود دار بھی تھا غیور بھی تھا، اس میں نیاز بھی تھا اور ستائش بھی اس میں درد بھی تھا اور سوز بھی، اس میں گداز بھی تھا اور رقت بھی، اس میں رفعت بھی تھی اور سپردگی بھی اور یہی سپردگی اس عشق کی جان تھی:

حبِ رسولؐ سے سرشار اور عشقِ رسولؐ میں مست الست ہونے کے بعد، انسان، نہ پھر کسی در پر جاتا ہے نہ کسی کوچے میں صدا دیتا ہے اس کی غیرتِ عشق اسے گوارا نہیں کرتی کہ وہ بھکاری بن کر کسی اور آستانہ پر پہنچے اور صدا لگائے:

یہی کیفیت ہے جسے اقبالؔ نے صرف ایک شعر میں بیان کر دیا ہے، اسے شاعری کا اعجاز کہیے یا عشق کا، لیکن بہرحال اس کے اعجاز ہونے میں کلام نہیں، اب وہ شعر سن لیجیے:

خواجۂ من! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پر نہ کند پیالہ را[1]

طرزِ تخاطب دیکھیے، الفاظ و معنی کا طلسم دیکھیے حسرت اور التجا دیکھیے، ہر چیز اپنی جگہ پر ایک مستقل اور ناقابلِ فراموش کیفیت رکھتی ہے:

---

[1] زبورِ عجم صـ ۹

(۱۸)

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

○

حق کا بول ہمیشہ بالا رہتا ہے، دشمن بھی حق کو چھپانے کی طاقت نہیں رکھتا :

نجاشی کے دربار میں ابوسفیان اس لیے پہنچے تھے کہ مکہ کے مہاجروں کو، جو کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے، تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے، واپس لے آئیں اور انہیں پھر ہدفِ ستم بنائیں، پھر ان پر ظلم توڑیں اور انہیں خدائے واحد کی پرستش نہ کرنے دیں، یہ مہاجر بے سہارا تھے، بے مایہ تھے ابوسفیان ایک پوری قوم کے نمائندے بن کر تشریف لے گئے تھے، بظاہر انہیں کامیاب ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا، نجاشی نے، جب ابوسفیان پر جرح کی اور ذاتِ رسالت مآب کی صداقت، شخصیت اور کردار و سیرت سے متعلق سوالات کئے تو بدترین مخالف ہونے کے باوجود، ابوسفیان کو سچ بات کہنی پڑی، انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ محمد میں اس کے سوا کوئی برائی نہیں کہ وہ ایک نئے دین کے علمبردار اور پرانے قومی اور قبائلی مذہب کے مخالف ہیں نجاشی کی نظر میں یہ "گناہ" اتنا ہی حقیر تھا جتنا ابوسفیان کی نظر میں عظیم :

اسی طرح ابولہب کی روح، اپنے ہواخواہوں میں بیٹھ کر محمد کے جرائم گناتی ہے، اس کے نقطۂ نظر سے ان جرائم کی سنگینی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی لیکن درحقیقت اس طرح، وہ آں حضرت کی سیرتِ پاک بیان کرتا تھا، وہ ان خصائص اور محامد و فضائل کو جتنا برا سمجھتا ہو لیکن انسانیت پر، دنیا پر اور اقدارِ انسانی پر اسلام کی پکار سنانے والے کا یا اتنا بڑا احسان تھا جس سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی :

اب یہ سنیے ابولہب کی روح کیا کہتی ہے اور کتنے درد و سوز کے ساتھ کہتی ہے :

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ

وُہ محمدؐ ہے جس نے میرے سینے کو چھلنی کر ڈالا ہے جس نے کعبہ کا چراغ گل کر دیا ہے یعنی اب وہاں بُت پرستی نہیں ہوتی :

دُوسرا جُرم :

از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرور
نوجواناں را ز دست ما ربود

اور یہ نوجوان کیوں اور کس طرح ہاتھ سے نکل گئے ؟ آخر اس کی کوئی وجہ تو ہوگی ؟ کچھ سبب تو ہوگا ؟ جواب اس سوال کا بھی موجود ہے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ موجود ہے :

ساحر و اندر کلامش ساحری است
ایں دو حرف لا الٰہ خود کافری است

وُہ جادوگر ہے ، اس کا کلام و پیام بھی بجیبر سحر ہی ہے وُہ لا الٰہ کی دعوت دیتا ہے اور یہ کر بجائے خود کفر ہے :

دینِ آبا کا ماتم ملاحظہ ہو :

تا بساطِ دینِ آبا در نورد
با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد

اور اس پیغمبر نے دینِ آبا اور خدایانِ کہن کے ساتھ کیا کیا ؟

پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وے بگیر اے کائنات

لات و منات جیسے خداوندانِ کہن اس کی ضرب بے دریغ کی تاب نہ لا سکے اور ریزہ ریزہ ہو گئے :

اے دُنیا اس دل افگار منظر کو تماشہ سمجھ کر نہ دیکھ ، اس کا انتقام لے :

ایک اور جرم ———.

دل بہ غائب بست و از حاضر گسست
نقشِ حاضر را فسونِ او شکست

یہ جو دین لایا ہے اس کی عجیب تعلیم یہ ہے کہ نادیدہ خدا کی پرستش کرتا ہے اور خدایانِ حاضر بتانِ کہن ——— سے رشتہ توڑ لیتا ہے اس کے سحر و افسوں نے نقشِ حاضر کو پاش پاش کر دیا ہے ———

——— اعداب، دینِ محمدی کی اساس و بنیاد پر حملہ کیا جاتا ہے :

دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست
آنچہ اندر دیدہ می ناید کجا است

غائب یعنی ان دیکھے خدا کو ماننا بہت بڑی غلطی ہے (اور محمدؐ کی تعلیم یہی ہے) ذرا غور تو کرو، جو چیز نظر نہیں آتی اس کا وجود ہی کیسے مانا جا سکتا ہے ؟

مزید "تحقیق"

پیشِ غائب سجدہ کردن کوری است
دینِ نو کور است، کوری دوری است

اس "انکشاف" کے بعد مزید "دلیل" پیش کی جاتی ہے :

خم شدن پیشِ خدائے بے جہات
بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰت

بلا، ایک خدائے بے جہات کے سامنے جھکنا اور رکوع و سجود کرنا کہیں ذوقِ عبادت کا موجب ہو سکتا ہے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی بدذوقی ہو سکتی ہے ؟

اب دیکھیے کس جوشش و خروش سے داعیِ اسلام پر الزامات کی فہرست تیار ہوتی ہے :

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب

یہ نیا دین جو محمدؐ نے پیش کی ہے کیسا عجیب اور ناقابلِ قبول دین ہے، یہ وہ دین ہے جو قاطعِ ملک و نسب ہے یعنی اس کی نظر میں وطن اور نسب کا کوئی احترام نہیں ہے یہ وطن اور نسب کی بنا پر کسی فضیلت کا قائل نہیں عجیب ہے کہ یہ قریش کی برتری اور عرب کی افضلیت تک کا قائل نہیں حالانکہ ہم قریش کی سرداری اور اقوامِ عالم پر عرب کی برتری کے ہمیشہ قائل رہے ہیں اسی لیے اپنے مقابلہ میں ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے رہے ہمارے نطق کے سامنے ان کے کلام کی اہمیت اور حیثیت ہی کیا تھی ؟

در نگاہ او یکے، بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست

اور یہاں محمدؐ کی نگاہ میں ہر انسان برابر کا درجہ رکھتا ہے وہ جس اخلاق سے اونچے اور بڑے آدمیوں سے ملتا ہے اس سے زیادہ محبت اور شفقت سے غریب اور ناوار آدمیوں کے ساتھ پیش آتا ہے ہم ساری عمر غلاموں کو حقیر اور ذلیل سمجھتے رہے اور یہ محمدؐ انہیں اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھاتا اور ان کے ساتھ کھانا کھاتا ہے —— کیا اس سے بڑھ کر بھی اندھیر ہو سکتا ہے؟

قدر احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ

یہ احرارِ عرب کی قدر و قیمت سے خود عرب ہونے کے باوجود ناواقف ہے، یہ کالے حبشیوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے:

احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند

یہ گوروں اور کالوں کے رشتہ و پیوند کا قائل ہے اور اس طرح اونچے خاندانوں کے ناموس و آبرو کو غارت کرتا ہے:

ایں مساوات، ایں مواخات، اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمان مزدکی است

اب سمجھ میں آگیا محمدؐ نے مساوات اور مواخات یعنی بھائی چارہ کا جو شور مچا رکھا ہے اس کی اصل عرب میں تو ملتی نہیں، ہو نہ ہو یہ عجمی سازش ہے" اور یہ سلمان فارسی کے ذریعہ بروئے کار آئی ہے جو عجمی ہونے کے باعث یقیناً مزدکی یعنی مزدک کے مذہبِ اباحی کا قائل ہے:

ابنِ عبداللہ فریبش خوردہ است
رستخیزے بر عرب آوردہ است

ابنِ عبداللہ (محمدؐ) سلمان کے فریب میں آگیا ہے اور اس طرح اس نے عربوں کو ایک عجیب مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے:

عزت ہاشم زخود مہجور گشت
از دو رکعت چشم شاں بے نور گشت

ہاشم کی اولاد : اس شخص کے باعث خود اپنے کسے مہجور ہوگئی ہے اس نے دو رکعت پڑھ کر اپنی آنکھوں کو بے نور کر لیا ہے :

اعجمی را اصل عدنانی کجاست
گنگ را گفتارِ سحبانی کجاست

ہم عرب ہیں : عدنان کی اولاد ، کیا عجم کے رہنے والے اس اعزاز میں ہمارے شریک ہو سکتے ہیں یہ گونگے عجمی ، سحبان کی روانی کلام ، بلاغت و فصاحت اور جوشش کلام کہاں سے لائیں گے ؟

چشم خاصانِ عرب گردیدہ کور
بر نیائی اے زہیر از خاکِ گور

خاصان عرب کی آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں ، وہ ان حقائق کو نہیں دیکھتے ، کاش زہیر جیسا جیالا اور دلیر عرب سردار ، خاک گور سے اٹھ کر اس فتنہ کا استیصال کر سکتا :

اے ترا مارا اندریں صحرا دلیل
بشکن افسون نوائے جبرائیل

اس صحرائے تیغ و سب ایک تو ہے جو میرا دلیل راہ اور رہنما ہے کوئی صورت ایسی کر کہ نوائے جبرائیل کا افسوں ٹوٹ جائے :

باز گوئے از سنگِ اسود باز گوئے
آنچہ دیدیم از محمد باز گوئے
اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر
خانہ خود را زبے کیشاں بگیر

یعنی :

اے ہبل : — اپنے گھر — کعبہ — کو ان بے دین لوگوں (مسلمانوں) سے چھین لے اور ہم اپنا ہبل بالاکر :

اور پھر بد دُعاؤں پر بد دُعائیں دیتا ہے :

گلہ شاں را بہ گرگاں کن سبیل !
تلخ کن خرمائے شاں را بر نخیل
صرصرے دہ با ہوائے بادیہ
اَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃ

اور اب وہ ہبل کو چھوڑ کر لات و منات سے مخاطب ہوتا ہے :

اے منات ، اے لات ازیں منزل مرو
گر ز منزل می روی ، از دل مرو[1]

ان چند اشعار میں سیرت نبوی کے ایک مخالف ، ایک دشمن ایک [illegible] کی زبان سے کتنا دل آویز اور روح پرور مرقع آنکھوں کے سامنے آگیا ہے :

اسلام کی تاریخ اور داعیٔ اسلام کے حالات و سوانح میں سب سے زیادہ ممتاز یہی خصائص ہیں جنہیں ابوجہل کی رُوح نے معائب اور نقائص کے رنگ میں پیش کیا ہے ، مساوات عام ، غلاموں سے حسن سلوک ، پست و بلند کی عدم تفریق ، ملک و نسب کے امتیاز و افتخار سے انکار ، غلاموں اور محکوموں کے ساتھ رفق و محبت کا برتاؤ ، عجم اور عرب کے درمیان فضیلت اور بزرگی کا معیار ، نسب نہ خاندان ، صرف تقویٰ ، یہ چیزیں کتنی نئی تھیں ؟ انسانیت کے لیے یہ کتنی بڑی نعمت تھیں ، لیکن چشم بدبیں نے انہی میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر کیسے برائی کے پہلو پیدا کر لیے ؟

---

[1] جاوید نامہ ص ۵۹-۶۰

(۱۹)

ذکرِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

○

اقبال کی کیفیت کیا تھی؟ ——— وہ کس حال میں رہتے تھے؟ خود ہی کہتے ہیں :

شریکِ درد و سوزِ لالہ بودم!
ضمیرِ زندگی را وا نمودم
ندانم با کہ گفتم نکتۂ شوق
کہ تنہا بودم و تنہا سرودم

اور واقعی ان کی یہی کیفیت تھی، وہ ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جو

تنہا بودم و تنہا سرودم

کی مصداق ہو، انہیں محفل طراز بہت ملے، اہلِ دل بہت کم ملے، سخن کی داد دینے والوں کی کمی انہوں نے کبھی محسوس نہیں کی، لیکن سخن کو دل میں بٹھانے اور دل پر نقش کرنے والے بہت کم ملے دوست، رفیقوں اور ساتھیوں کی انہیں کبھی کمی نہ رہی لیکن ان کے پیام کو سمجھنے اور پرکھنے والے شاذ و نادر ہی ان کی بزم تک پہنچے اور جھولی میں حقائق و معارف کے گوہر لے کر واپس پہنچ گئے، حالانکہ اس کا خلق گوہرباری کرتا رہا؛

اقبال کو مسلمان سے شکوہ ہے، اور کتنا بجا شکوہ ہے :

دل از دستِ کسے بُردن ندانند
غم اندر سینہ پروردن ندانند!
دمِ خود را دمیدی اندریں خاک

کہ غیر از خوردن و مردن نداند

یعنی مسلمانوں میں نہ اب ناز باقی ہے، نہ نیاز، نہ وہ عاشق ہیں نہ محبوب، نہ ان میں سپہ گری ہے نہ ربودگی۔ ان کی زندگی کا مقصد اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ کھائیں پئیں اور مر جائیں:

اور اس کے بعد، وہ مسلمانوں کی زبوں حالی، فکر و عقیدہ کی گمراہی اور سوزِ آرزو سے محرومی دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد
کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا
پرستد، مومن و کافر تراشد

وہ مسلمان سے کہتا ہے:

شوقِ غزل سرائے را رخصتِ ہاؤ ہو بدہ
باز بہ رند و محتسب بادہ سبو سبو بدہ
شام و عراق و ہند و پارس خو بہ نبات کردہ اند
خو بہ نبات کردہ را تلخیِ آرزو بدہ
تا بہ یمِ بلند موج معرکہ بنا کند
لذتِ سیلِ تند رو، با دلِ آبجو بدہ

اور پھر بتاتے ہیں:

مردِ فقیر آتش است، میری و قیصری خس است
فال و فرِ ملوک را حرفِ برہنہ بس است

اور ان تمام باتوں کی اصل یہ ہے کہ اقبالؔ مقامِ رسولؐ کا عارف ہے۔ اسی لیے ذاتِ رسالت مآبؐ سے والہانہ عشق رکھتا ہے۔ وہ کسی موضوع پر گفتگو کر رہا ہو، بظاہر عنوان کچھ بھی ہو، روح کی بحث ہو یا جسم کی، علم کی یا سائنس کی، حکمت کی یا معرفت کی، اقوامِ ماضی کی یا اقوامِ حاضر کی تاریخ پر گفتگو ہو رہی ہو یا فلسفۂ تاریخ پر، انسانی نظامِ حیات کی گرہیں کھولی جا رہی ہوں یا ملوکیت، اشتراکیت اور آمریت پر خیال آرائیاں

ہورہی ہوں، اقبالؒ ان سب کو صحیح سمجھتا ہے، اس کی نگاہ میں رسولؐ کا جلوہ بسا ہوا ہے جس نظام میں جس ماحول میں جس نظریہ میں جس خیال میں یہ حامل محض نظر نہیں آتا، وہ اسے بیکار اور لغو بلکہ اور بیچ ناقابل قبول اور ناقابل التفات سمجھتا ہے :

وہ مسلمانوں کو، نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ساری دُنیا کو بار بار بتاتا ہے کہ رسالت کیا ہے؟ اور انسانیت پر اس کے اثرات کیا ہیں؟ قومیں اور ملتیں کیوں کر اس کے پرتو سے کچھ سے کچھ بن جاتی ہیں؟ ذرہ کیوں کر اس کے زیر سایہ آکر آفتاب بن جاتا ہے؟ انسانیت کے ہر دُکھ اور روگ کا یہ علاج یہ اور صرف یہ ہے کہ وہ ذاتِ رسالت کو دلیلِ راہ بنائے، کامیابی اور کامرانی کا راستہ صرف یہی ہے :

اقبالؒ عالمِ خیال میں رومیؒ سے ملتے ہیں یہ رومیؒ ان کے مرشد ہیں، رہبرِ طریق ہیں ہماری گتھیاں یہی حل کرتے ہیں، جب کوئی سوال در پیش ہو، جب کوئی مشکل پیش آرہی ہو، جب کسی پیچیدگی کا سامنا ہو، انہوں نے آنکھ بند کی اور مرشد رومیؒ کے آستانہ پر پہنچے اور اس دریا کی غواصی کر کے لولوئے لالاسے جھولی بھر لائے :

دُنیا کے تمام معاملات و مسائل پر، وہ مرشد رومیؒ سے ہدایت اور روشنی حاصل کرتے ہیں اب دل میں کرید ہوتی ہے کہ رسالت کیا ہے، اس کی حقیقی حیثیت اور اہمیت کیا ہے، اس کا پایہ اور مقام کیا ہے نظر خود بخود مرشد رومیؒ پر پڑتی ہے، وہاں پہنچتے ہیں اور دونوں میں گفتگو شروع ہو جاتی ہے اور اس گفتگو کی دل آرا اور روح پرور تفصیل وہ خود عالم وجد و حال میں بیان کرتے ہیں :

گفتمش از پیغمبری ہم باز گوئے!
سرِ او با مردِ محرم باز گوئے

سوال بڑا اہم ہے لیکن اس سوال کا جواب بھی کتنا دل کشا ہے :

گفت اقوام و ملل آیاتِ اوست
عصرہائے ما ز مخلوقاتِ اوست
از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت
باہمہ مانند حاصل ہا و چو کشت
پاک ساز استخوان و ریشہ را

بالِ جبریلے دہد اندیشہ را!
پائے وہمے اندرونِ کائنات
از لبِ او، بحر و نور و نجات

یہ تو تھا رسالت کا بیان، اس کے فرائض اور ذمہ داریوں کا انکشاف اب دیکھیے کس جوش وخروش کس ولولہ اور از خود رفتگی کے ساتھ وہ اس کی کیفیت بیان کرتے ہیں —— یہ الفاظ نہیں نگینے ہیں، یہ حرف نہیں، موتی ہیں یہ انسان کا کلام ہے لیکن درحقیقت الہام :

آفتابش را زوالے نیست نیست
منکر او را کمالے غنیمت نیست
رحمتِ حق، صحبتِ احرار او
قہرِ یزداں، ضربتِ کرار او
گرچہ باشی عقلِ کل، از وے مرم
زاں کہ او بیند تن و جاں را بہم

ذکرِ رسول کا یہ مکمل بیان، صرف وہی شخص اس صحت و صداقت کے ساتھ کر سکتا ہے جو عشقِ رسولؐ سے سرشار ہو جس کی عقل اور حب کے دل میں تضاد اور کشمکش نہ ہو جو حقیقت کو پہچان چکا ہو اور اسے بیان کرنے کی اہلیت و استعداد رکھتا ہو :

مذکورہ اشعار میں جو کیف و اثر ہے وہ بجائے خود بہت اہم اور بے انتہا قابلِ قدر ہے لیکن اس سے بھی زیادہ جو چیز دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، وہ ہے ذاتِ رسالت مآبؐ سے کسی طرح کم نہ ہونے والی شیفتگی :

محمدؐ

قلبِ مؤمن را کتابش قوت است
حکمتش حبل الورید امت است
دامنش از دست دادن مردن است
چون گل از بادِ خزان افسردن است

(۴۰)

زندہ تر ° جوئندہ تر ° یابندہ تر

○

اقبالؔ کا دل، نورِ مصطفےٰ سے مستنیر تھا اس کا دماغ عظمتِ رسالت مآبؐ کا اسیر تھا، اس کی زبان ذاتِ بابرکاتِ نبیؐ کی ثناخواں تھی :

وہ مورخ نہیں تھا، فلسفۂ تاریخ کا ماہر نہیں تھا، بحث ومناظرہ سے اسے دلچسپی نہیں تھی وہ بہت بڑا مفکر تھا، بہت بڑا فلسفی تھا، سیرتِ رسولؐ کا کوئی گوشہ اس کی نظر سے پنہاں نہیں تھا، آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ کے تمام واقعات اس کے علم میں تھے وہ جانتا تھا رسالت مآبؐ نے اپنی دعوت وتبلیغ کا کام کس طرح اکس نہج واسلوب سے شروع کیا، وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ اس دعوت کے رد وقبول کے سلسلہ میں کیا حالات وواقعات پیش آئے وہ اس سے بھی بے خبر نہ تھا کہ اس پیام نے کس طرح پورا کو دوست، دوستوں کو ارادت مند اور ارادت مندوں کو جاں نثار بنادیا، وہ آپؐ کی سیرتِ طیبہ، گفتار ورفتار اور کردار کے ایک ایک گوشہ، ایک ایک جزیئہ اور ایک ایک واقعہ سے واقف تھا، اس کے ذہن ودماغ کی صلاحیتیں اپنا صرف، ایک ہی مصرف رکھتی تھیں :

"ایسا کیوں تھا ؟"

"اس میں کیا مصلحت پیش نظر تھی ؟"

"اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا اور سبق لیا جاسکتا ہے" ؟

آنحضرتؐ کی حیاتِ گرامی کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے قبل آپؐ غارِ حرا میں کبھی کبھی تشریف لے جایا کرتے تھے اور وہاں، کبھی کم مدت تک کبھی زیادہ عرصہ تک قیام فرمایا کرتے تھے خلوت کے ان اوقات کا کیا مصرف تھا؟ معرفتِ حق اور معرفتِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔

اس واقعہ سے اقبال یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خیالات کی طہارت نفس کی تربیت اور خلاق کی معرفت کے لیے خلوت گزینی لازمی اور ضروری چیز ہے، بغیر اس کے نفس کی تربیت نہیں ہو سکتی، خیالات کی تطہیر نہیں ہو سکتی، حقائق و معارف تک رسائی نہیں ہو سکتی، مختصر یہ کہ انسان انسان نہیں بن سکتا، فرماتے ہیں:

اے ز ونیش عصر حاضر مردہ تاب
فاش گویم با تو اسرار حجاب

اور یہ "اسرار حجاب" کیا تھا جسے فاش و برملا طور پر اقبال بیان کرنا اور لوگوں پر واضح کرنا چاہتا ہے؟

ذوق تخلیق آتشے اندر بدن
از فروغ او فروغ انجمن!
ہر کہ بر دارد ازیں آتش نصیب
سوز و ساز خویش را گردد رقیب
ہر زماں بر نقش خود بندد نظر
تا بگیرد لوح او نقش دگر!

یہ تو تھی تمہید، اب اصل بیان ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

مصطفٰے اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقش ما را در دل او ریختند
ملتے از خلوتش انگیختند

یعنی خلوت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معرفت نفس، عرفان حقیقت اور سوز و ساز خویش سے آشنائی ایک نئی ملت کی تخلیق کی موجب بھی ہوتی ہے:

اس نکتہ کو مجدد بتاتے ہیں:

می توانی منکر یزداں شدن
منکر از شان نبیؐ نتواں شدن

کتنی بڑی بات کہی ہے ؟ ——— لیکن کتنی مبنی بر حقیقت ———!

ایک آدمی اپنی لاعلمی، جہالت اور دوسرے وجوہ کے باعث یہ تو کہہ سکتا ہے کہ خدا میری سمجھ میں نہیں آتا لیکن منکرِ خدا ہونے کے باوجود وہ منکرِ رسول نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک واقعہ آپ کی سیرت اور شخصیت کی ایک ایک تجلی اس کے سامنے ہے اور اس طرح سامنے ہے کہ چاہے تو بھی انکار نہیں کر سکتا اور اس عدم انکار کا لازمی نتیجہ اقرارِ رسالت ہے :

پھر خلوت کے برکات پر مزید روشنی ڈالتے ہیں :

گرچہ داری جان روشن چوں کلیم

ہست افکار تو بے خلوت عقیم

از کم آمیزی تخیل زندہ تر

زندہ تر، جوئندہ تر، یابندہ تر

کیا اس برہنہ حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے ؟

---

(۲۱)

مردِ حق

○

اقبالؔ مردِ مومن کو بار بار جس طرف متوجہ کرتے ہیں، وہ اس کی خود شناسی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ، مسلمان اپنے آپ کو پہچان لے، اپنی حقیقت جان لے، اپنے مقام و منزلت سے واقف ہو جائے اور یہ سب کچھ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مسلمان کتاب یعنی قرآن اور صاحبِ کتاب یعنی ذاتِ رسالت پناہؐ سے والہانہ رابطہ و تعلق نہ رکھے ایک مسلمان اگر مسلمان ہونے کے باوجود، نہ اسرارِ کتاب سے واقف ہے نہ رمزِ سُنت سے، نہ اس کے سامنے وہ تعلیم ہے جس کے لیے خدا نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، نہ اس کے سامنے وہ نمونہ ہے جو دنیا میں صرف پہلی اور آخری بار، آنحضرتؐ کے وجود باجود کی صورت میں آیا تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ اپنی صحیح منزلت اور اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے:

اقبالؔ بتلاتے ہیں اسلام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی مسلمان بن کر گوشہ عافیت میں بیٹھ جائے ترکِ ماسوا کر دے، لذاتِ حیات سے کنارہ کش ہو جائے، معاملاتِ دنیاوی سے سروکار نہ رکھے دنیا کی ہر چیز کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھے ان کے نزدیک اسلام یہ ہے کہ آدمی مسلمان بن کر، دُنیا کو پورے طور پر پہچانے اور اس سے پورا فائدہ اُٹھائے اس کی اچھی چیزوں کو اپنائے، اس کی بری چیزوں سے کنارہ کش ہو جائے وُہ دنیا سے ترکِ تعلق نہ کرے دنیا پر متصرف ہے، دُنیا کو اپنا اوپر حاوی نہ ہونے دے، خود اس پر سلطانی اور حکمرانی کرنے لگے، دُنیا سے پورا پورا رابطہ و تعلق رکھنے کے باوجود، وہ مسلمان بنا رہے، تب وہ اپنے تئیں صحیح معنیٰ کا مردِ مومن ثابت کر سکے گا، غور کیجیے تو یہ اقبالؔ کا اجتہاد نہیں ہے، نہ یہ ان کی ذاتی رائے ہے بلکہ اسلام خود یہی کہتا ہے، اسلام کی ترجمانی کرتے ہوئے اقبالؔ جو کچھ کہتے ہیں، وہ درحقیقت اسلام ہی کی ترجمانی ہوتی ہے نہ کہ خود ان کی اپنی:

اس تمہید کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اب ذرا اقبال کا ترانہ سنئے :

من نہ گویم درگذر از کاخ و کوے
دولت است ایں جہانِ رنگ و بوے

جب یہ عالمِ کاخ و کو اور جہانِ رنگ و بو تیرا اور صرف تیرا ہے :

دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر
صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر

پھر تاکید کرتے ہیں :

تیشۂ خود را بکہسارش بزن
نورے از خود گیر و بر نارش بزن

لیکن ہاں، یہ سب کچھ کر "مگر" اپنی حقیقت، اپنے مقام، اپنے منصب اور اپنی ذمہ داریوں کو نہ فراموش کر، اس کا خیال رہے کہ :

از طریقِ آذری بیگانہ باش!
بر مرادِ خود جہانِ نو تراش
دل برنگ و بوے و کاخ و کو مدہ
دل حریمِ اوست جز با او مدہ
مردن بے برگ و بے گور و کفن
گم شدن در نقرہ و فرزند و زن

اس تعلیم و ہدایت کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ اگر مسلمان ان اصولوں پر کاربند ہے تو وہ بجبر و بزور حکومت کر سکتا ہے، دنیا میں انقلاب لا سکتا ہے، خیالاتِ عوام و حکام کی رو پلٹ سکتا ہے لیکن شرط یہ اتنی ہے کہ کاخ و کو کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں دل نہ اٹکے، یہ بات ہر وقت پیشِ نظر رہے کہ دل حرمِ خدا ہے اس میں کسی اور کی گنجائش نہیں پیدا ہونی چاہیئے یہ جگہ کسی اور کو نہ ملنی چاہیئے اور یہ سب کچھ بتا چکنے کے

جد کتنی بلند آہنگی کے ساتھ فرماتے ہیں :

ہر کہ حرف لا الٰہ از بر کند
عالمے را گم بہ خویش اندر کند

اصل اسلام یہی ہے جو اس پر کاربند ہو گیا، دُنیا اس کی ہو گئی، وہ دُنیا کا مالک اور آقا بن گیا۔
پھر فرماتے ہیں :

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست
فقر سلطانی است رہبانی کجاست

اب اقبال ایک نیا موضوع پیش کرتے ہیں، وہ دین کی غربت اور وجاہت کی بحث چھیڑتے ہیں اور اس سلسلہ میں بدیع اندازِ تکلم کے ساتھ، جو صرف انہی کا حصّہ ہے، بڑے کام کی باتیں کرتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ اصل موضوع پر آئیں، ایک تبہ پھر یاد دلاتے ہیں کہ :

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بو
مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بُو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر
ہر زماں او را چوں حق شانے دگر

یعنی مردِ مسلمان کسی دوسرے سے رنگ و بو کی دریوزہ گری نہیں کرتا، اس کا رنگ و بو ذاتِ حق سے مستعار ہے، اس کی رعنائی و زیبائی، اس کا نکھار اور جلال و جمال ماخوذ نہیں ہے، دوسرے سے حاصل کیا ہوا نہیں ہے، نقل اور گل چینی نہیں ہے، یہ جو کچھ ہے، اس کا اپنا ہے یعنی یہ سب کچھ اس نے خدا سے حاصل کیا ہے، ہر دور میں، ہر عہد میں، ہر زمانہ میں اس کے جسم کے اندر جو روح تڑپتی ہے وہ اپنی ایک مخصوص اور منفرد شان رکھتی ہے جس طرح ذاتِ حق کی رنگا رنگی، ہر لحہ اور ہر لحظہ اپنی شان کا چولا بدلتی رہتی ہے : کل یوم ھو فی شان

اب وہ جمال الدین افغانی کی زبان سے سوال کرتے ہیں :

از حدیثِ مصطفیٰ داری نصیب
دینِ حق اندر جہاں آمد غریب

یعنی کیا تمہیں اس حدیث کا علم ہے (الاسلام جاء غریبا) کہ اسلام اس دُنیا میں غریب آیا تھا؟

اور اگر ہے تو، تم "غریب" کے معنی بھی جانتے ہو؟

با تو گویم معنیِ ایں حرفِ بکر
غربتِ دیں نیست فقرِ اہلِ ذکر
بہرِ آں مردے کہ صاحب جستجو است
غربتِ دیں، ندرتِ آیاتِ اوست

یعنی غربت کے اصل معنیٰ "ندرت" کے ہیں اور یہ ندرت ہر آن بدلتی رہتی ہے :

غربتِ دیں، ہر زماں نوعِ دگر
نکتہ را دریاب اگر داری نظر

دل بہ آیاتِ مبیں دیگر ببند
تا بگیری عصرِ نو را در کمند

یعنی، آیاتِ قرآنِ مبین سے اگر ربط و پیوستگی قائم کر لو تو تم وہ بن جاؤ گے جو عصرِ نو کو اپنی کمند میں گرفتار کر سکتا ہے جس کی گرفت سے عہدِ حاضر لاکھ تڑپے، پھڑکے، پھڑپھڑاتے لیکن باہر نہیں نکل سکتا :

پھر بتاتے ہیں اور کس حسرت و اندوہ کے ساتھ فرماتے ہیں :

کس نمی داند ز اسرارِ کتاب

شرقیاں، ہم غربیاں در پیچ و تاب
ہر دو سیاں نقش نوی انداختند
آب اونان بر وندودیں پرداختند

اور اس صورتِ حال کا علاج اور مداوا اس کے سوا کچھ نہیں کہ :

حق ببیں، حق گو تے و غیر از حق مجو ے

صرف یہی اصول ہے جس پر عمل کر کے مسلمان مسلمان ہو سکتا ہے :

از حدیث مصطفیٰ داری نصیب
دینِ حق اندر جہاں آمد غریب

یعنی کیا تمہیں اس حدیث کا علم ہے (الاسلام بدأ غریباً) کہ اسلام اس دُنیا میں غریب آیا تھا ؟

اور اگر ہے تو تم "غریب" کے معنی بھی جانتے ہو ؟

با تو گویم معنیِ ایں حرف بکر
غربتِ دیں نیست فقرِ اہلِ ذکر
بہرِ آں مردے کہ صاحب جستجو است
غربتِ دیں ، ندرتِ آیاتِ اوست

یعنی غربت کے اصل معنیٰ "ندرت" کے ہیں اور یہ ندرت ہر آن بدلتی رہتی ہے :

غربتِ دیں ، ہر زماں نوعِ دگر
نکتہ را دریاب اگر داری نظر

دل بآیاتِ مبیں دیگر بہ بند
تا بگیری عصرِ نو را در کمند

یعنی، آیاتِ قرآنِ مبین سے اگر ربط و ہم آہنگی قائم کر لو تو تم وہ بن جاؤ گے جو عصرِ نو کو اپنی کمند میں گرفتار کر سکتا ہے جس کی گرفت سے عہدِ حاضر لاکھ تڑپے، پھڑکے، پھڑپھڑاتے لیکن باہر نہیں نکل سکتا :

پھر بتاتے ہیں اور کس حسرت و اندوہ کے ساتھ فرماتے ہیں :

کس نمی داند ز اسرارِ کتاب

شرمتاں، ہم غریباں در پیچ و تاب
لوسیاں نقش نوی انداختند
آب و ناں بر وندودیں پرداختند

اور اس صورتِ حال کا علاج اور مداوا اس کے سوا کچھ نہیں کہ :

حق بہیں، حق گوئے و غیر از حق مجوئے

صرف یہی اصول ہے جس پر عمل کر کے مسلمان مسلمان ہو سکتا ہے :

---

(۲۲)

تلاشِ مصطفےٰ

○

جاوید نامہ میں اقبال نے جنت کی ایک محفل کا تذکرہ کیا ہے، اس میں متعدد ارواح بزرگ موجود ہیں منصور حلاج، قرۃ العین طاہرہ، غالب وغیرہ تشریف فرما ہیں اور ان میں سوال وجواب اور بحث وگفتگو کا سلسلہ جاری ہے:

یہ سب مفکر ہیں روح وجسم کے مسائل پر، حقیقت اور وہم پر، عالم کون وفساد کی حقیقت وماہیت پر اور دوسرے مسائل پر تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔ یکایک غالب کی زبان پر موتی کی طرح تابندہ ہیرے کی طرح درخشندہ اور آئینہ کی طرح، برزندہ رود یہ الفاظ نکلتے ہیں:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

یہ ابتدا اور انتہا، یہ آغاز وانجام، یہ افتتاحیہ اور اختتامیہ، ایک بحث پر پیچ مسئلہ ہے اس کی گرہ کشائی پر بہت سے فلسفیوں اور مفکروں نے بحر خیالات کے غوطے لگاتے ہیں، لیکن گوہر مقصود سے محروم ہی رہے، غالب کی زبان سے، اقبال نے، چند الفاظ میں جتنے بڑے دفتر معنی کو کوزہ میں بند کیا ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہے، ایک مرتبہ پھر پڑھیے اور لطف لیجئے:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

اس پر زندہ رود کی طرف سے سوال ہوتا ہے:

من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز

آتشے داری اگر ما را بسوز

اس کا جواب بھی اقبالؔ، غالبؔ کی زبان سے دیتے ہیں اور کتنے اچھوتے انداز میں :

اے چو من بینندۂ اسرارِ شعر
ایں سخن افزوں تر است از تارِ شعر
شاعراں بزمِ سخن آراستند
ایں کلیماں بے یدِ بیضا ستند
آنچہ تو از من نخواہی کافری است
کافری کو ماورائے شاعری است

اس کا جواب حلاجؔ کی زبانی سنئے اور دیکھئے چہرۂ معنی سے پردہ کیونکر اٹھتا ہے، حقیقت و صداقت بے نقاب کس طرح ہوتی ہے؟ چند سیدھے سادھے ہیں، سادہ اور عام فہم الفاظ میں فلسفہ و حکمت، حقیقت و معرفت اور فلسفۂ تکوینِ عالم کی گرہ کشائی کیسے ہوتی ہے، بات بڑی گہری ہے —— لیکن اندازِ کلام میں سادگی ہے، بے ساختگی ہے اور اسی بے ساختگی نے بات کہیں سے کہیں پہنچا دی ہے —— ایک عامی بھی اس حقیقتِ حال پر وجد کرسکتا ہے اور ایک فلسفی بھی سر دُھن سکتا ہے :

حلاجؔ کہتا ہے :

مرکبا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

یعنی، اس جہانِ رنگ و بو کی خاک سے آرزو —— عشق، تمنا، جوتِ حیات، زندگی —— کا جو شرارہ پھوٹتا ہے، اس کی رونق اور تابندگی یا تو نورِ مصطفےٰ کا کرشمہ ہے اور اگر اس میں کچھ کمی ہے، تو سمجھ لو، وہ ہنوز نورِ مصطفےٰ کی تلاش میں ہے :

ان خیالات میں جو بلندی ہے، بے شک وہ رسائی فکر پہ دال ہے لیکن اس جذبے میں جو، صداقت جو وارفتگی، جو جوش اور جو کیفیت ہے، کیا وہ اقبال کے سوا کہیں اور بھی مل سکتی ہے؟

کتاب کے آغاز میں فارسی اور اردو کے بعض گو شعرا کا ذکر اور ان کے کلام فصاحت التیام کا تعارف میں نے قدرے تفصیل سے کیا ہے، ممکن ہے کتاب کے قارئین میں سے بعض کو یہ بات پسند نہ آئی ہو لیکن خدارا بتایئے، ان جواہر ریزوں کی حقیقی اور واقعی قدر و قیمت کا اندازہ کسی طرح بھی اقبال سے قبل کے اور اس کے ہم عصر شعراء کا جائزہ لیے بغیر ممکن تھا؟ اقبال کے نعتیہ کلام کو سمجھنے، اس کی زبان سے ذکر جمال سننے اور اس کے سخن آبدار کی کمیت اور کیفیت کا مکمل اندازہ اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھا، نور مصطفےٰ اور عشق مصطفےٰ پر اس نے دو مصرعوں میں جو کچھ کہہ دیا ہے، دوسرے اسے صدہا کلیاتوں اور دیوانوں میں بھی نہیں کہہ سکے۔ شاعر ہونا دوسری بات ہے اور شاعری سے صحیح کام لینا بالکل دوسری بات:

ہم جس پہ مرتے ہیں وہ کوئی بات ہی ہے اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں؟

(۲۴)

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است

○

ارواحِ بزرگ کی جو مجلس جنت میں جمی تھی وہ ابھی برخاست نہیں ہوئی قائم ہے:
حلاج نے "نورِ مصطفٰے" اور "تلاشِ مصطفٰے" پر جو کچھ کہا تھا قدرتاً اس کی روشنی میں کچھ دوسرے سوالات پیدا ہونے ناگزیر تھے چنانچہ زندہ رود کی طرف سے استفسار ہوتا ہے:

از تو پرسم، گرچہ پرسیدن خطاست
سرّ آں جوہر کہ نامش مصطفٰےؐ است

آدمے یا جوہرے، اندر وجود!
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود

سوال بہت اہم اور بڑا پیچیدہ ہے، اس گتھی کو صرف حلاج ہی کی زبان حل کرسکتی تھی چنانچہ وہ کہتا ہے:

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است

لیکن جس عبدہٗ کے سامنے گیتی جبیں فرسودہ ہوتی ہے، وہ عبدیت کیا ہے اس سوال کا جواب بھی حلاج دیتا ہے:

عبدہ از فہم تو بالاتر است!
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است

یعنی، یہ عبدیت عجب ہے، یہ آدمیت اور جوہریت کا مجموعہ ہے یہ عبد انسان بھی ہے اور جوہر بھی :

بات صاف ہے لیکن ذرا پیچیدہ بھی ہے، سوال پیدا ہوتا ہے، خود اس جوہر کی ماہیت کیا ہے جب تک یہ نہ معلوم ہو اس وقت تک "ہم آدم و ہم جوہر" کا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا، علامہ نے یہ مشکل بھی آسان کر دی ہے :

جوہر او نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است

یہ تو معلوم ہو گیا کہ جوہر نہ عربی ہے نہ عجمی لیکن ایک گرہ کھلتی ہے دوسری پیدا ہو جاتی ہے ایک سوال کا جواب ملتا ہے، دوسرا خود بخود اس جواب کی کشاکشی میں پیدا ہو جاتا ہے، مان لیا کہ یہ جوہر نہ عرب سے وابستہ ہے نہ عجم سے لیکن "آدم و ہم ز آدم اقدم است" سے مراد کیا ہے؟
یہ سوال جب تک حل نہ ہو، ہم آگے کیونکر بڑھ سکتے ہیں؟ علامہ نے اس سوال کو بھی کتنے شاندار الفاظ اور شاندار تر انداز میں بڑی خوبی سے حل کیا ہے :

سنیے، علامہ کہتا ہے :

عبدہ صورت گر تقدیرہا
اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا

یہ عبد تقدیر کا صورت گر ہے اس کے اندر کی دنیا میں ویرانہ بھی ہے اور تعمیر کے منظر بھی اور صرف یہی نہیں :

عبدہٗ، ہم جاں فزا ہم جاں ستاں
عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگ گراں

یہ جاں فزا بھی ہے اور جاں ستاں بھی یعنی جاں بخش بھی ہے اور جاں سوز بھی، یہ شیشہ بھی ہے اور سنگ گراں بھی، نزاکت و لطافت میں شیشہ، سختی و صلابت میں آہن :

اب حلاج کی زبان سے ایک اور بات سنیے، نئی بھی اور کام کی بھی، اس میں فلسفہ بھی ہے اور حقیقت بھی، جوش بھی ہے اور متانت بھی، دعوت بھی ہے اور فکر بھی، فرماتے ہیں :

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار، او منتظر

یعنی عبد یعنی غلام محض، دوسری چیز ہے۔ لوگ نفس کے غلام ہیں، ملوک و سلاطین کے غلام ہیں، خواہشات کے غلام ہیں، رسم و رواج کے غلام ہیں، عادات کے غلام ہیں، جبلّت اور فطرت کے غلام ہیں، آقایانِ ولی نعمت کے غلام ہیں، ہر بڑا ہر چھوٹے کا آقا ہے، ہر کمزور ہر طاقتور کا غلام ہے، یہ غلامی اور خواجگی انسان کے ساتھ لگی ہے، ہر صبح سے شام تک اور رات سے صبح تک، بچپن میں، جوانی میں، بڑھاپے میں، ہر دور اور ہر عہد میں یہ پورے استیلا اور قہرمانیت کے ساتھ نظر آتی ہے، خواجگی ہر کہیں موجود ہے غلامی سے کہیں مفر نہیں، کلرک اپنے افسر کا، افسر محکمہ کے سیکریٹری کا، سیکریٹری وزیر متعلقہ کا، وزیر سربراہ مملکت کا، سربراہِ مملکت عوام و جمہور کا پابند یعنی غلام اور محکوم ہے :

لیکن جو عبد نہیں 'عبدہٗ' ہے یعنی صرف خدا کا غلام ہے اس پر بھی اور کسی حالت میں غلامی طاری نہیں ہو سکتی وہ کسی کا غلام نہیں ہو سکتا، ہماری اور اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم سراپا انتظار ہیں اور وہ منتظر، جس کا انتظار کیا جا رہا تھا جس کے ہم منتظر تھے،

اور یہ سب کیوں ہے؟ —— اس لیے کہ

عبدہٗ، دہر است و دہر از عبدہٗ است
ما ہمہ رنگیم و او بے رنگ و بو است

جو اللہ کا بندہ ہے، وہ خود زمانہ ہے اور اگر زمانہ اس سے الگ کوئی چیز ہے تو تمام تر اسی کا ساختہ پرداختہ، یا تو یہ مان لو کہ وہ زمانہ ہے ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ زمانہ اس کی مٹھی میں ہے اس کا تابع ہے، ہم میں اور اس میں فرق یہ ہے کہ ہم رنگا رنگی میں مبتلا ہیں اور وہ بے رنگ و بو ہے یعنی ہم غلام محض ہیں اور وہ غلامی کے تصور سے بھی آزاد ہے :

حلاج کی زبان سے عبدہٗ کی تعریف اور سنیے :

عبدہٗ با ابتدا بے انتہا است
عبدہٗ را صبح و شام ما کجا است

یعنی اس کی گہرائی اور وسعت کی کوئی انتہا نہیں، اس کی صبح و شام میں اور جاری صبح و شام میں زمین آسمان کا فرق ہے، غلام کی صبح و شام دوسری ہوتی ہے اور جو رسم غلامی سے بیگانہ اور عبدیت محض سے آزاد ہو، اس کی صبح و شام کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے وہ اپنی صبح کا بھی مالک ہوتا ہے اور شام کا بھی بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ صبح و شام کا وجود اس کے تصرف میں ہوتا ہے :

اب آگے چل کر حلاج کی زبان ایک ایسے راز کا انکشاف کرتی ہے جو ہر سوال کا جواب اور ہر مشکل کا حل ہے اور اس کے بعد پھر کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا، کسی طرح کی مشکل درپیش ہی نہیں آ سکتی یہ جواب، ہر اعتبار، ہر پہلو، ہر اسلوب سے واضح، آخری قطعی اور فیصلہ کن ہے اس کے بعد صرف سر تسلیم خم کرنے کا موقع ہے، باب سخن وا کرنے کا نہیں :

اور یہ آخری اور فیصلہ کن بات حلاج کی زبان پر یوں آتی ہے :

کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست

لیکن نہیں :
ابھی ایک سوال اور باقی ہے اور اس کا جواب بھی حلاج کو اپنی زبانِ حقیقت بیان سے دینا پڑے گا :

سوال یہ ہے کہ :
لا الٰہ اور عبدہٗ میں باہمی ربط و تعلق کیا ہے ؟

اس کا جواب حلاج یوں دیتے ہیں :

لا الٰہ تیغ و دم او عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو، ہو عبدہٗ

یعنی لا الٰہ تلوار ہے اور اس تلوار کی دھار عبدہٗ ہے بلکہ اگر زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں سننا چاہو تو دونوں ایک ہیں، تلوار اور تلوار کی دھار میں فرق کیا ہی نہیں جا سکتا، دونوں بہرحال لازم و

دم میں —— یہ بہت بڑی بات حلاج کی زبان پر آتی ہے لیکن اتنی ہی سچی بھی ہے اور حلاج کو دم کہنے سے پہلیا
میں چانسی کا پھندا اور تلوار کی نوک بھی نہ روک سکی تو اب جنت میں انہیں کس کا خطرہ ہو سکتا ہے ؟
اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی وہ خاموش نہیں ہوتے ، زبان جب روانی پر آتی ہے تو آتی ہی چلی جاتی ہے
کتی نہیں ، بات اور وہ بھی سچی بات جب زبان پر آجاتی ہے تو حروف وصوت کا جامہ پہنے بغیر نہیں رہتی چنانچہ
اس سلسلہ میں مزید فرماتے ہیں :

عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ ، رازِ درونِ کائنات

یہ کہنے کے بعد انہیں شبہ ہوتا ہے کہ شاید بات صاف نہیں ہوئی ، یا بات صاف تو ہے
گر واضح نہیں ہوئی یا واضح بھی ہے مگر ذرا سی تشریح اور ہو جائے اب وہ آیۂ قرآنی کی تلمیح سے کام
لیتے ہیں :

جنگِ احد میں سرورِ کائنات نے جو تیر چلایا تھا اس پر خدائے ذوالجلال نے فرمایا تھا :

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ —— !

یعنی یہ تیر تم نے نہیں چلایا تھا خدا نے چلایا تھا اسی لیے بے خطا تھا :
اس تلمیح کے بعد کہتے ہیں :

ما پیدا نگر دو زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ مارمیت

یعنی لا الٰہ اور عبدہٗ کا باہمی ربط و تعلق صحیح طور پر اس صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب تم آیہ کریمہ
ما رمیت کے رمز آشنا بن جاؤ پھر تم خود مان لوگے :

لا الٰہ تیغِ دودم او عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو او عبدہٗ

پھر تمہیں یہ ماننے میں بھی تامل نہ ہوگا :

عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد زندہ رود کو نصیحت کرتے ہیں :

بگذر از گفت و شنید اے زندہ رود
غرق شو اندر وجود اے زندہ رود

لیکن زندہ رود کی زبان رو کنا کوئی آسان کام تو نہ تھا، اس نے آخر آخر میں پھر ایک سوال کو ہی ڈالا :

کم شناسم عشق را این کار چیست
ذوق دیدار است پس دیدار چیست

اس سوال میں ذہانت بھی ہے اور شوخی بھی حلاج جواب دیتے ہیں اور ان کے جواب میں متانت بھی ہے اور حقیقت بھی حکمت بھی اور معرفت بھی :

معنی دیدار آں آخر زماں
حکم او بر خویشتن کردن رواں

بظاہر یہ جواب ماتق و دلّ ہے لیکن وہ بھی جب جواب دینے پر آتے ہیں تو کوئی پہلو تشنہ، اور نامکمل نہیں چھوڑتے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

در جہاں زی چوں رسول انس و جاں
تا چو او باشی قبول انس و جاں

اگر رسول آخر زماں کے نقش قدم پر چلو تو سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے ساری کائنات تمہاری مٹھی میں آ سکتی ہے، تم مقبول انس و جاں بن سکتے ہو اور یہ اگر کر لو تو جو کچھ چاہتے ہو، وہ بن جاؤ گے، پاؤ گے :

دیدار رسولؐ اور سر نبی کی معرفت کا طریقہ بتاتے ہیں کہ یہ سب کچھ کر کے یہ صلاحیت اور استواد پیدا کر کے اپنے اوپر نظر ڈالو :

باز خود را بیں، ہمیں دیدار اوست
سنت او سرّے از اسرار اوست

یہ شعر منکرین حدیث اور منکرین سنت کے لیے خواہ کتنا ہی تلخ اور تکلیف دہ ہو لیکن اقبال ترجمان حقیقت تھے، وہ اتنی بڑی حقیقت کو کیوں کر نظر انداز کر سکتے تھے انہوں نے وہی کہا جو کہنا چاہیے تھا جو ہر مسلمان کو کہنا چاہیے۔ رسولؐ کا راز صرف اس کا کردار ہے اور یہ کردار سنت رسول کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟ اور جب تک سنت پر صدق دل سے عمل نہ ہو، اس کا دیدار اور اس دیدار کی معرفت کیونکر ممکن ہے

---

(۲۴)

معراجِ مصطفےٰؐ

معراج رسولؐ تاریخ اسلام کا ایک بہت بڑا اور مہتم بالشان مسئلہ ہے، حدیث تفسیر اور تاریخ اور سوانح وسیرت کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بڑی طویل اور فلسفیانہ بحثیں ہوئی ہیں، اقبالؔ نے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور ایک بالکل نئے انداز سے اسے دیکھا اور بیان کیا ہے:

لیکن قبل اس کے کہ اقبالؔ کا نظریہ زیر بحث لایا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمہید میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک حصہ بھی پیش نظر رہے:

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

خدا نے اقبالؔ کو نفس جبرئیل دے دیا اب وہ بتلاتے ہیں:

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

اور اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

عجب مزا ہے، مجھے لذّتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں

اس تمہید کو پیش نظر رکھنے کے بعد اب پڑھیے:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراج کی حقیقت وہی ہے، جو اقبالؔ نے بیان کی ہے لیکن کیا اس حقیقت کو اقبالؔ سے پہلے کسی شاعر یا نعت گو نے بیان کیا تھا؟ —— نہیں!

(۲۵)

فروغِ وادیِ سینا!

ذاتِ رسالت مآب سے اقبال کا عشق انتہا کو پہنچا ہوا ہے، ان کا اندازِ کلام اور پیرایۂ بیان مختلف ہوتا ہے لیکن اس اختلاف میں ندرت اور طرفگی ہوتی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے:

اپنے بارے میں کہتے ہیں اور کس بے باکانہ طور پر کہتے ہیں:

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

پھر کہتے ہیں:

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

ان صفاتِ عالیہ اور جذباتِ بزرگ سے متصف اور آشنا ہونے کے بعد وہ کہتا ہے اور کس خود اعتمادی کے ساتھ کہتا ہے:

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا!

اب یہ ذکرِ جمیل جو زبان پر آگیا تو سب کچھ فراموش کر کے کہتے ہیں:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

"عشق و مستی" یہی اقبال کی پونجی تھی۔

(۲۶)

مولائے یثرب

○

اقبالؔ ایک نو مسلم خاندان کے فرد تھے انہوں نے ایک کھرے سچے اور پکے مسلمان باپ کی آغوش میں تربیت پائی، ان کی علمی تربیت وقت کے ایک بہت بڑے عالم اور صاحبِ دل بزرگ سید میر حسن کے دامنِ فیض میں ہوئی، اسلام کی عظمت اور جلالت ان کے دل پر بچپن سے نقش ہو گئی لیکن اسلام کیا ہے یہ بات انہوں نے اپنے علم و مشاہدہ کی روشنی میں بہت عرصہ کے بعد جانی اور پھر وہ صرف مسلمان ہی نہیں رہے اسلام کے ترجمان اور علمبردار بھی بن گئے، ٹیگور نے آفاقیت اور انسانی برادری کا کمند لگایا اقبالؔ بھی اپنے پیش رو کے اس نقشِ قدم پر چل سکتے تھے لیکن انہیں دکھی انسانیت کا مداوا، اسلام کی تعلیمات میں نظر آیا وہ ایک خوبصورت لفظ کے پیچھے نہیں پڑے، انہوں نے خوبصورت مفہوم پیدا کیا اور اس کی طرف خلق و کلام کی پوری قوت سے دنیا کو دعوت دینے لگے، کسی نے یہ دعوت گوشِ ہوش سے سُنی کسی نے سنی کی ان سنی کر دی، کسی نے سُنا تو اس کے ہونٹوں پر طنز کا تبسم نمودار ہو گیا کسی نے سُنا تو اس کے ماتھے پر تکدر اور انقباض کی شکنیں پڑ گئیں، لیکن اقبالؔ ان چیزوں سے بے نیاز تھے، انہوں نے نہ طنز کی پروا کی، نہ انقباض و تکدر کی، وہ اپنا پیام سناتے رہے، یہاں تک کہ وہ خود ہی زندۂ جاوید بن گئے اور ان کا پیام بھی ——— !

اقبالؔ کا علم زیادہ فرنگی تھا، انہوں نے حکمت و فلسفہ کا درس مغرب کی درس گاہوں میں زانوئے شاگردی تہ کر کے حاصل کیا تھا، شروع میں وہ دانشِ افرنگ سے مرعوب ہوئے، وطن کے بُت کے آگے بھی انہوں نے سر جھکایا لیکن جیسے جیسے وہ رمز آشنائے اسلام ہوتے گئے یہ کمزوریاں رفع ہوتی گئیں اور ان کے دامن کے یہ دھبے دھلتے گئے، اور کیل نہ

دھلتے، جب بار بار مولائے یثرب کا دامن پکڑتے اور چارہ سازی کی التجا کرتے رہتے تھے:

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

---

(۲۷)

لوح بھی تو، قلم بھی تو

○

ذکرِ رسولؐ کا ترانہ جب اقبالؔ کی زبان پر جاری ہوتا ہے تو ان کی بے خودی، سرخوشی، سرکشیدگی اور والہانہ جذب و کیف کا عالم قابلِ دید ہوتا ہے۔ یہ ذکرِ جمیل ان کے سمندِ سخن پر تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ ان کی زبان سے شعروں کی بارش سی ہونے لگتی ہے۔ یہ شعر چونکہ دل سے نکلتے ہیں، اس لیے ان کا کیف و تاثر کچھ دوسرے ہی رنگ کا ہوتا ہے۔ الفاظ میں جادو، اندازِ بیان میں سحرِ حلال، ترکیبوں اور بندشوں میں ذوق و مستی، خیالات میں بے خودی و ہشیاری —— یہ ہے اقبالؔ کے نعتیہ کلام کی خصوصیت :

خامہ :

پھر ان کی زبان نعت پر کھلتی ہے اور تکلف برطرف وہ خود اپنے بارے میں بتا دیتے ہیں :

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں، صاحبِ ساز کا لہو

اور واقعہ بھی یہی ہے۔ اقبالؔ کی نوائے جگر سوز نے پرورش واقعی دل و جگر کے خون سے پائی ہے کوئی شبہ نہیں، رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں دواں ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو ساز کی دھن میں وہ مستی اور سرمستی کہاں آ سکتی ہے جو اس کی نوا کو سینہ تاب بنا دیتی ہے :

نعتیہ اشعار اقبالؔ نے بہت کہے ہیں اور ہر شعر میں ان کا خاص رنگ نمایاں ہے۔ ان کی انفرادیت چھپائے نہیں چھپتی، لیکن ذیل کے اشعار میں وجد و حال کی جو کیفیت نمایاں ہے، وہ کسی دوسرے مقام پر بھی مشکل سے ملے گی :

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

شاعر کہتا ہے کہ لوح بھی ہے، قلم بھی ہے "کتاب" (قرآن) بھی، تو نہ ہوتا تو یہ کچھ نہ ہوتا تیری عظمت وجلال کا یہ عالم ہے کہ یہ گنبدِ آبگینہ رنگ یعنی، آسمان جس کا کوئی اور چھور نہیں، جس کی وسعت اور پہنائی کی کوئی انتہا نہیں، جس کی فراخی اور کشادگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، تیرے سمندر کا ایک بلبلہ ہے، حقیر، ہیچ، ناقابلِ التفات:

پھر ارشاد ہوتا ہے:

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا، تو نے طلوعِ آفتاب

یعنی اس دنیا میں، جو کچھ نظر آتا ہے جتنی رعنائیاں ہیں، جتنی دل آویزیاں ہیں، یہ سب تیرے ہی ظہور کا کرشمہ ہیں، تیری ہی ذاتِ گرامی وہ ہے جس کے پرتو سے ریت کا ذرہ آفتاب، عالم تاب چمک کرنے لگتا ہے، بلال حبش کا ایک معمولی انسان تھا لیکن تیرے در کا دربان بن کر کیا کچھ نہ ہو گیا، عمر فاروق اگر تیرے حلقہ بگوش نہ ہوتے تو کیا ہوتے، کچھ نہیں، عثمان غنی نے تیرے ہی دربار میں پہنچ کر بقائے دوام کا خلعت پہنا، ابوبکر صدیق تیری ہی اطاعت و رفاقت کے باعث خدا کی زبان سے "ثانی اثنین" کے لقب سے مفتخر ہوئے اور عظمت و جلال کے مالک بنے، علی مرتضیٰ کو تیری ہی نظرِ کیمیا اثر نے فاتحِ خیبر اور حیدرِ کرار بنا دیا، تیرے فیضِ صحبت سے وہ مجاہد پیدا ہوئے جنہوں نے اقلیمِ عالم فتح کر لیے، یہ وہی گڈریے تھے جو ادب، تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے لیکن تیرے پرتوِ فیض سے شہریار اور تاجدار بن گئے انہوں نے دنیا کے بہت بڑے حصہ پر اسلام کا پرچم لہرایا اور ساری دنیا کو اسلام کی رفعت اور بندگی کے آگے سرنگوں کر دیا:

پھر ارشاد ہوتا ہے:

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب

تیری ذاتِ گرامی، جامع کمالات ہے، اگر تیرے جلال کا مظہر دیکھنا ہو تو سلطان سنجر اور سلطان سلیم کا نام بطور نمونہ از خروارے کافی ہے جس کی دھاک ساری دنیا پر بیٹھی تھی، جس کی سطوت و جلالت کے سامنے وقت کے بڑے بڑے ملوک و سلاطین سر بہ سجدہ رہتے تھے، جن کے دبدبہ اور طنطنہ نے بڑی بڑی حکومتوں کو لرزہ براندام کر رکھا تھا:

اور اگر تیری شانِ جمال دیکھنا ہو تو جنید بغدادی اور بایزید بسطامی کا نام کافی ہے جن کے فقر مقدس کے آگے، بادشاہ و شہنشاہ بھی سرنگوں ہو کر حاضر ہوتے تھے، جن کی روحانیت نے نہ جانے کتنے گمراہوں کو باصفا کر دیا:

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

اس کے بعد فرماتے ہیں:

شوق ترا اگر نہ ہو، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

یعنی، تیرا عشق اگر میری نماز کا امام نہ ہو تو پھر میرا ہر عمل رائیگاں ہے، نہ نماز کام دے گی نہ قیام اور نہ سجود:

ارشاد ہوتا ہے:

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے!
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

یعنی آپ کے عشق نے، ہر مراد پوری کر دی، ہر ایک کا دامن آرزو گل مراد سے بھر دیا، عقل کہ جس کی خاصیت غیاب و جستجو ہے اور عشق کہ جو حضور و اضطراب کا پیکر ہے، دونوں نے تیری بارگاہ قدس میں پہنچ کر وہ پالیا، جو ان کی تمنا تھی:

ایک اور شعر:

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

آفتاب چمک رہا ہے لیکن تاریکی ہر سو چھائی ہوئی ہے :

اندھیرا ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

آفتاب کی روشنی کاخ و کو کے بام و در تک تو پہنچ سکتی ہے، دلوں تک نہیں پہنچ سکتی ہے دلوں کی تاریکی صرف آپ ہی کے نورِ ہدایت سے دور ہو سکتی ہے، یہی وجود تھا جس نے دنیا کو منور کر دیا تھا، یہی وجود ہے جو دنیا کو پھر منور کر سکتا ہے :

اے بہ سرا پردۂ یثرب بہ خواب
خیز کہ شد مغرب و مشرق خراب

حالات کی ابتری انتہا کو پہنچ چکی ہے، مشرق و مغرب ہر جگہ کفر و انکار، الحاد و طغیان کی ہوائیں چل رہی ہیں، علم کے ساتھ ساتھ جہل بڑھ رہا ہے، روشنی کے ساتھ ساتھ تاریکی میں اضافہ ہو رہا ہے، صحت کے ساتھ ساتھ بیماری نازک سے نازک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے، اس کٹھن مرحلہ پر صرف آپ ہی کی ذات گرامی ہے جو جہل و نادانی، انکار و الحاد اور عصیاں و طغیان کو ختم کر سکتی ہے، وقت آگیا ہے آپ کا جلوۂ بے حجاب، عام ہو اور نابینا دیکھنے لگیں، جو حقیقت سے غافل ہیں وہ اس کا جلوہ دیکھیں اور اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں :

---

(۴۸)

قلب و نظر کی زندگی !

○

گذشتہ صفحات میں نعت رسولؐ کا جو غیر فانی ، اور بے مثال نمونہ پیش کیا گیا ہے ، وہ جذبۂ خود ہر مسلمان کے قلب و نظر کی زندگی ہے :

اقبال کی زبان پر جب ذکر رسولؐ کا ترانہ آتا ہے تو گل افشانی گفتار کا جوہر قابل دید ہوتا ہے اس نظم کا عنوان انہوں نے ذوق و شوق رکھا ہے اور اس کا ہر شعر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ کلام واقعی دلی ذوق کا آئینہ دار ہے جو بیان ہے وہ از دل خیزد ، بر دل ریزد کا مصداق ہے ، جو کیفیت ہے وہ دل سے جو بات نکلتی ہے ، اثر رکھتی ہے کی مثال ، جو جذبہ ہے وہ جذب و کشش میں اپنی مثال آپ جو الفاظ ہیں وہ ایسے جس طرح انگشتری میں نگینہ :

اقبال کو دیار یثرب کا دیدار کبھی نصیب نہ ہو سکا اس لیے کہ حالات ساز گار نہ ہو سکے کہ یہ دیرینہ تمنا پوری ہوتی ، عالم خیال میں بارہا انہوں نے اس سرزمین گرامی قدر کی زیارت کی جس کے بارے میں ایسے والہانہ جوش کے ساتھ وہ ایک دوسرے موقع پر فرما چکے تھے :

خاک یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دل است

عالم خیال کی کیفیات ضروری نہیں کہ لفظ و عبارت کا جامہ پہن کر ، دوسروں کے لیے بھی جنت نگاہ اور فردوس نظر ثابت ہوں لیکن اس مرتبہ عالم خیال میں اقبال جب شہر رسولؐ میں پہنچتے ہیں تو ان کی زبان خاموش نہیں رہتی ، تاثرات قلب اپنے پورے سوز و گداز کے ساتھ زبان پاتے ہیں اور اس طرح کہ پڑھنے والا محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ تاثرات اس کے ذاتی ہیں ، شاعر نے اپنی ترجمانی کی ہو تو کی ہو لیکن اس نے

زیادہ پڑھنے والے کی ترجمانی کی ہے اور شعر کی خوبی یہی ہے کہ وہ ہر پڑھنے والے کے دل کی آواز بن جائے، یہ معلوم ہو کہ یہ داستان کسی غیر کی نہیں، اپنی ہے، پوری تفصیلات کے ساتھ نہیں جزئیات کے ساتھ بھی:

ہاں تو اقبال لاہور کے گوشۂ اعتکاف میں بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں تو دل میں دربارِ رسول کی زیارت کا ولولہ اٹھتا ہے، یہ ولولہ درد بنتا ہے، پھر ٹیس بن جاتا ہے اور یہ ٹیس رہ رہ کر اٹھتی ہے آخر وہ ضبط نہیں کر سکے چشمِ تصور، پہاڑوں جنگلوں، بیابانوں، ندیوں، نالوں اور نشیب و فراز بلند و پست کو طے کرتی ہوئی، تمام دشواریوں کو قطع کرتی اور تمام رکاوٹوں کو دور کرتی، مدینۃ النبی میں پہنچ جاتی ہے ساتھ اور وہ بھی کس کا، اقبال یعنی عاشقِ رسول کا ایسا نادر اور کم یاب موقعہ خوش قسمتی ہی سے ہاتھ آتا ہے:

پھر التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے

آیئے، اقبال کے ساتھ چلیں، قدم بہ قدم نہ سہی نقشِ قدم دیکھتے ہوئے سہی، وہ نظر نہیں آتے لیکن ان کی آواز پردۂ گوش سے ٹکرا رہی ہے، سرزمین بے آب و گیاہ کا لطف دیکھئے کیسے وجد آور اور کیف انگیز میں کھینچتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ریگ زارِ عرب کا ہر ہر ذرہ گلاب و یاسمین کا بکھرا پن کر نظر کے سامنے ہے:

قلب و نظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے، نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں

ذوق و شوق کی کیفیت دیکھئے:

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم[1] کو دے گیا، رنگ برنگ طیلساں[2]

ذوق و شوق کے ساتھ اب وجد و کیف دیکھئے:

---

[1] اضم: مدینۃ الرسول کی ایک پہاڑی [2] طیلساں: ردعی

گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ[۱] نرم ہے مثلِ پرنیاں

کیا ذوق و شوق اور جذب و کیف کی یہ انتہا نہیں ہے کہ ریت ریشم اور بادلوں کی رنگ آرائی کوہ اِضم کی وردی نظر آنے لگے؟

شاعر کی چشمِ تصور کچھ اور دیکھتی ہے:

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

یہ شعر معمولی شعر نہیں ہے، اقبال کی ذہانت اور جودتِ طبع کا شاہکار ہے:

اقبال اردو کے شاعر تھے، فارسی میں کافی دست رس رکھتے تھے، عالمِ اسلام تک اپنا پیام پہنچانے کے لیے انہوں نے فارسی میں شاعری شروع کر دی، عربی زبان سے تقریباً ناواقف تھے اور اگر تھوڑے بہت تھے بھی تو نہ اتنے کہ اس کے رنگ و کیفیت کو اپنے اندر اس طرح جذب کر سکیں کہ اردو میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیں، اردو کو ایک نئے رنگِ شاعری سے روشناس کرا دیں:

عربی شاعری میں عہدِ جاہلیت یعنی قبل از اسلام کی شاعری اپنی فصاحت و بلاغت اپنے الفاظ و لغات اپنے محاورات و تراکیب، اپنے اندازِ بیان اور طرز و اسلوب کے اعتبار سے، سند اور معیار تسلیم کی جا چکی ہے یہ شاعری عہدِ جاہلیت کی معاشرت، زندگی، خد و خال اور آب و رنگ کی منہ بولتی تصویر تھی جو عربوں کی زندگی تھی وہی اس شاعری میں جھلکتی تھی، عرب کے شعرائے جاہلی، اپنے قصائد کا آغاز اپنی محبوبہ کے ذکر سے کرتے تھے اور ہجر و فراق کی داستانیں بڑے اثر انگیز انداز میں بیان کرتے تھے، عرب زیادہ تر خانہ بدوش تھا اور ان کی زندگی یہ تھی کہ جہاں پانی ملا وہ پڑ گئے، جی اکتا یا اٹھ کھڑے ہوئے جہاں نخلستان دکھائی دیا قیام کر لیا، جب دل میں یکسانیت پیدا ہوئی خیمہ ڈیرا اٹھا لیا اور کسی دوسری طرف چل نکلے، خانہ بدوشوں کے انہیں جھمیلوں میں اہلِ قبیلہ کی لڑکیاں ہوتی تھیں، آزاد، بہادر، خوب رو، خوش اندام، باوفا عصمت مآب، عفت شعار، عاشق مزاج یہ لڑکیاں اپنے قبیلہ کی بکریاں چراتی تھیں، اسی اثنا میں کوئی شاعر طبع اور عاشق مزاج نوجوان نکل آتا تھا کسی کی

---

[۱] کاظمہ: مدینہ منورہ

کی کوئی ادا پسند آئی اور دل میں کھب گئی، آنکھیں لڑیں دل ملا، ہونٹ تبسم سے آشنا ہوئے، باتیں شروع ہوئیں عشق قبول کر لیا گیا اور پینگ بڑھنے لگے :

اب ہر روز چراگاہ، یا تالاب پر ملاقاتیں ہونے لگیں، دردِ دل کی حکایت، سوزِ فراق کی داستان عشاقِ عرب کا تذکرہ، غدرایانِ عرب کا ذکرِ جمیل، ہجر کی شکایت، جدائی کا شکوہ، ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جانے کی حسرت و آرزو :

یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے ——— یہاں تک کہ ایک روز عاشق شاد کام، دیدارِ حبیب کے لیے خوش خوش پہنچتا ہے، یہ باتیں ہوں گی، یہاں بیٹھیں گے ولولِ دیدار سے آنکھیں روشن ہوں گی، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوتا سناٹا چھایا ہوا ہے، نہ کوئی خیمہ ہے، نہ آبادی کی چہل پہل، نہ رونق معلوم ہوا کہ قبیلہ کوچ کر گیا کہیں اور نہ جانے کہاں :

شاعر یہ منظر دیکھتا ہے اور آہِ سرد کھینچ کر کہتا ہے، کچھ اسی طرح جیسے اقبال نے کہا ہے :

آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر!
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

عرب شاعر یہ منظر دیکھ کر اور دو آنسو بہا کر آگے بڑھ جاتا ہے لیکن اقبال کے قدم رک جاتے ہیں وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے مگر نہیں بڑھ سکتا :

آئی صدائے جبرئیل، تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

اور وہ "قلب و نظر" کی اس جنت میں رہ پڑتا ہے، پھر کہیں نہیں جاتا :

———

(٢٨)

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

○

عشقِ رسول ـــــ یہ ہے اقبال کا تصورِ حیات، اگر مسلمان بہت بڑا مفسر ہے، بہت بڑا فقیہ ہے، بہت بڑا عالم ہے، بہت بڑا سائنس داں ہے، بہت بڑا فلسفی ہے، بہت بڑا جامع معقول و منقول ہے لیکن عشقِ رسول سے بیگانہ ہے، تو وہ سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں، نہ اس کی گفتار اثر انگیز ہو سکتی ہے نہ اس کا کردار جذب و کشش کا حامل ہو سکتا ہے۔ شرعِ الٰہی کی تکمیل اور دینِ اسلامی کا تمام صرف عشقِ رسول ہی پر منحصر ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو پھر شرع و دین کا ایوان ہی بتکدۂ تصورات بن جاتا ہے:

زندگی میں جب تک مقصد کی تڑپ اور منزل کی لگن نہ ہو، وہ زندگی نہیں، موت ہے اور یہ تڑپ اور یہ لگن اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی، جب تک دل عشق کے جذبے سے سرشار نہ ہو، یہی جذبہ منزل تک پہنچاتا ہے یہی چیز راہی میں امنگ اور حوصلہ پیدا کرتی ہے، صرف اسی چیز سے مسلمان مسلمان بن سکتا ہے:

اگر عشقِ رسول کی کارفرمائی نہ ہوتی تو کیا صبرِ حسینؓ کی مثال سے دنیا آشنا ہو سکتی تھی، کیا بدر و حنین کے معرکوں میں کامیابی ہو سکتی تھی، کیا سومنات کے بت توڑے جا سکتے تھے، کیا دنیا میں اسلام کا پرچم بلند ہو سکتا تھا، کیا عرب کے گلہ بان اور شتر سوار، پہنائے عالم پر حکومت کر سکتے تھے، کیا دنیا میں اس وسعت کے ساتھ اسلام کا پیام پہنچایا جا سکتا تھا، کیا بغیر کسی جبر و جور کے دنیا کی بہت بڑی تعداد مسلمان کی جا سکتی تھی؟ کیا دنیا میں پہلی اور آخری مرتبہ وہ نظامِ حکومت قائم ہو سکتا تھا جس کا نظارہ خلافتِ راشدہ کی صورت میں دنیا کر چکی ہے؟ اقبال کا جواب ہے "نہیں"۔

اقبال اپنی قوم کی زبوں حالی دیکھتا ہے، اپنی قوم کو دین و مذہب سے بیگانہ دیکھتا ہے، کفر کی فضا

اور پسپائی دیکھتا ہے، اس کی کامیابیاں اور کشورکشائیاں دیکھتا ہے، وُہ دیکھتا ہے، اسلام کا پرچم سرنگوں ہو رہا ہے، وُہ دیکھتا ہے مسلمان انحطاط و ادبار کے نازک ترین دَور سے گذر رہے ہیں وُہ دیکھتا ہے، وُہ قوم جس نے عرب کی تنگنائے سے نکل کر ساری دُنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا جس کے نام سے ملوک و سلاطین کے ایوان کانپنے لگتے تھے جس کے ذکر سے دُنیا کے قہار جنگجو اور انسانیت کش رجال لرزہ براندام ہو جاتے تھے: آج تباہ ہو چکی ہے، برباد ہو چکی ہے، مٹ رہی ہے، اس صورت حالات کے اسباب و علل کا جب وُہ جائزہ لیتا ہے تو صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچتا ہے یہ کہ مسلمان عشقِ رسُول سے بیگانہ ہیں، جب تک یہ بیگانگی قائم رہے گی، وہ تباہ ہوتے رہیں گے، جب یہ بیگانگی دور ہو جائے گی پھر ان کا دورِ اقبال و عروج شروع ہو جائے گا:

وہ جھجکتا ہے کہ اپنے یہ تاثرات و واردات پیش کس کے سامنے کرے؟ کیا مسلمان کے سامنے؟ لیکن وہ سننے کیوں لگے، جذبہ یہ ابلتا ہے کہ سینہ توڑ کر باہر نکلنے کے لیے مچل رہا ہے، آخر وہ کسی اور کو نہیں خود رسالت مآب کو مخاطب بناتا ہے اور عرض کرتا ہے:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

اب پوچھتا ہے:

کیا نہیں اور غزنوی، کارگہِ حیات میں؟
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

اور اب سوال فریاد بن جاتا ہے:

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات

اور پھر یہ فریاد حسرت اور آرزو کا جامہ پہن لیتی ہے، اور کہتا ہے:

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

یعنی کفر کی کارفرمائی اور کفر سامانی اب بھی قائم ہے بلکہ روز بروز لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی ہے اور عرب کی سرزمین سے کوئی حسینؑ نہیں ابھرتا، وہاں کے اسٹیج پر حسین، شریف مکہ نظر آتا ہے جو فرنگی سامراج کا آلۂ کار اور ریاجوجی اقتدار کا خیمہ بردار ہے مگر وہ حسینؑ نہیں دکھائی دیتا جس نے اپنا خون دے کر کفر کی سیاہیوں کو ختم کر دیا تھا :

اور پھر بتاتا ہے کہ حسین کا جذبۂ عشقِ رسُول ہی پیدا کر سکتا ہے کوئی اور نہیں :

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

عشقِ رسولؐ ہی عقل کی رہنمائی کر سکتا ہے، دل کی رہبری کر سکتا ہے، نگاہ کی پاکی اور طہارت قائم رکھ سکتا ہے یہ نہ ہو تو پھر شرع و دین ایک بے معنی نقطہ بن کر رہ جاتا ہے بلکہ ایسا بتکدہ جہاں تصورات کی مورتیں رکھی ہیں حقائق کا کہیں نام نہیں :

آگے چل کر مزید تشریح کرتا ہے، اب بات بالکل صاف اور واضح ہو جاتی ہے :

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق !

اور اس کے بعد پھر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی، بات پوری ہو گئی، جو سمجھ سکتا ہے، سمجھ لے، جو سُن سکتا ہے، سُن لے :

---

(۲۹)

معنیٔ دیریاب

○

کبھی کبھی، ایک لفظ معنوی وسعت کے اعتبار سے، کتابوں اور دفتروں پر بھاری ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کائنات کا معنیٔ دیریاب کہہ کر، اقبال نے اس لفظ سے یہی کام لیا ہے یہ چند حروف کا مجموعہ ہے حقائق و معارف کا دفتر ہے، یہ لفظ نہیں، پوری ایک کتاب ہے پورا ایک بیان ہے، پوری ایک حقیقت ہے، ایک سچائی ہے، ایسی حقیقت جس کی تردید نہیں کی جا سکتی، ایسی سچائی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا:

جذبات کا دریا اب روانی پر ہے اور اقبال اب براہِ راست سرکارِ رسالت پناہؐ سے مخاطب ہیں:

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

اور بہت جلد یہ تخاطب بیان واقعہ بن جاتا ہے، وہ رسول اکرمؐ سے اپنی قوم کا حال زار و زبوں بیان کرتے ہیں، اور کیسی سچی بات کہتے ہیں:

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ مے کدہ کم طلب و تہی سبو

یعنی آج حالت یہ ہے کہ نہ خانقاہ و مکتب میں طلبِ دین کا صحیح جذبہ موجود ہے، نہ میکدۂ حقیقت کے رندانِ عالم بھی سعی طلب اور ذوقِ جستجو کے حامل ہیں، دستِ طلب کوتاہ، منزل تک پہنچنے کا ولولہ ناپید الغرض کوئی مردِ کار نہیں اور میرا دل انہی لوگوں کو ڈھونڈھتا ہے جن کی زندگی سعی و طلب کی زندگی تھی یہی حال

کو دیکھتا ہوں تو مایوس ہو جاتا ہوں، ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو فخر و نشاط کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ حال سے چھٹکارا چاہتا ہوں، ماضی سے ربط و تعلق قائم رکھنا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ حال کو بھول جاؤں، ماضی کو یاد رکھوں، حال داستانِ پارینہ بن جائے اور ماضی قصۂ امروز، میری زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ حال کی سیاہی ماضی کی روشنی سے بدل دوں، وہ لوگ جو ماضی کے پردوں میں جا چھپے ہیں، انہیں ڈھونڈ نکالوں اور جو حال کے اسٹیج پر نظر آ رہے ہیں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش کر دوں، نہ انہیں دیکھوں نہ انہیں یاد رکھوں :

چنانچہ بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے :

ہیں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اس کے بعد کیسے انوکھے اور شاعرانہ انداز میں کتنی سچی اور پتے کی بات کہتا ہے :

بادِ صبا کی موج سے نشوونمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو

یعنی بادِ صبا کے جھونکوں سے، خار و خس کے علاوہ اور کیا پیدا ہوتا ہے ؟ وہ آرزو اور تمنا تو نہیں پیدا کر سکتی ؟ یہ بات تو صرف میرے نفس سرو ہی ہے، اسی نفس سے شعلۂ آرزو اور شرارِ تمنا پیدا ہوتا ہے :

اقبالؔ اپنی حقیقت کے آپ رمز آشنا ہیں، جانتے ہیں، میری نوا کیا ہے ؟ میرے نفس میں کیا بات ہے ؟ میری آہ شرربار کیا ہے، وہ صرف یہی نہیں کہ سوزِ تمنا اور شرارِ آرزو پیدا کرتی ہے اس میں کچھ اور خصوصیتیں بھی ہیں اور ایک خصوصیت تو ایسی ہے جو اور کہیں شاید مل ہی نہ سکے، یعنی،

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

میری نوا صرف آواز نہیں ہے، صرف نغمہ نہیں ہے، صرف صوت نہیں ہے، اس نوا کی پرورش دل و جگر کے خون سے ہوتی ہے، میرے ساز میں جو نغمہ تڑپ رہا ہے، یہ صاحبِ ساز کا لہو ہے جو اس

کے ایک ایک تار اور ایک ایک ریشہ میں دوڑ رہا ہے یہ گرمیِ نوا اسی خونِ دل و جگر کا نتیجہ ہے :

پھر اقبال کہتے ہیں ، یہ جو کچھ مجھے حاصل ہے میں اس پر قانع نہیں ، میرا دستِ طلب اب بھی دراز ہے میری آرزو اور تمنا اب بھی ھل من مزید کی ترانہ سنج ہے ، جو کچھ میں نے پالیا ہے ، اس پر نازاں ہوں ، مفتخر ہوں لیکن جو کچھ پالینا چاہتا ہوں ، وہ کچھ اس سے بھی زیادہ اور اس سے بھی عجیب ہے :

فرصتِ کشمکش مدہ ، ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

---

(۳۰)

عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب

○

عشق اور عقل یعنی بے خودی و ہشیاری، یہی وہ چیزیں ہیں جن پر نظام کائنات قائم ہے، عشق جذبہ ہے اور عقل چالاکی، عشق سے دُنیا کے کام بنتے ہیں عقل سے بگڑتے ہیں، تعمیر میں عشق کارفرما ہوتا ہے تخریب رسائی عقل کا نتیجہ ہے، عشق نہ ہو، تو یہ دُنیا رہنے کے قابل نہ رہے، صرف عقل ہو تو دُنیا کبھی سنور نہ سکے، یہی وجہ ہے کہ اقبال عشق کے عاشق ہیں اور عقل کے دشمن :

لیکن وہ عقل کے دشمن کیوں بنے ——— ؟ اس لیے کہ وہ مدتوں عقل کی وادیوں اور گھاٹیوں میں گام فرسا رہے، منزل اور دُور ہوتی گئی، مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ یہ عقل، "علم نخیل" ہے لیکن "بے رطب" یعنی ایسا علم جس کا کوئی پھل نہیں، پھر جب وہ عشق کے میدان میں پہنچے تو انہوں نے محسوس کر لیا کہ

منزلِ عشق ہے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

اور جادہ صد سالہ کو چشم زدن میں طے کرنے کے لیے جس آہ کی ضرورت ہے، وہ صرف عشق ہی کی کارفرمائی سے حاصل ہو سکتی ہے :

چنانچہ اپنے واردات و تاثرات، مشاہدات و تجربات بیان کرتے ہوئے رسالت مآب کی بارگاہ میں عرض پرداز ہیں :

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب

لیکن جب یہ خبر ہوگئی کہ "علم نخیل بے رطب" ہے یہ معلوم ہوگیا کہ عقل جس چیز کا نام ہے اس کا کوئی پھل اس کا کوئی ثمر نہیں، وہ صرف تخریب ہے، تباہی ہے، بربادی ہے، ہلاکت ہے ذہن کا حجاب دور ہوگیا، دل کے پردے ہٹ گئے حقیقت نظر کے سامنے آگئی، باطل کی جلوہ ریزیاں بے ثبات ہوگئیں دل نے جان لیا، مان لیا پہچان لیا کہ عشق رسولؐ ہی حاصل کائنات ہے عقلیت کا چکر باطل (ابولہب) کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ حقیقت کو آنکھوں سے اوجھل کردیتا ہے :

تازہ مرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب

پھر کہتے ہیں اور کتنی دور رس بات کہتے ہیں، جو صرف کلام نہیں، جان سخن ہے :

گاہ بہ حیلہ می برد، گاہ بہ زور می کشد
عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب

یعنی یہ عشق عجیب چیز ہے نہ اس کی ابتدا سمجھ میں آتی ہے نہ اس کی انتہا وہم خرد میں پائی جاتی ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود ہی اپنی طرف کھینچتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ طلب صادق راستہ کی تمام مشکلوں اور زحمتوں کو دور کردیتی ہے، لیکن نہ یہ اختیاری ہے، نہ وہ، دونوں کے لیے ضروری ہے کہ

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

لہٰذا، نہ اس کی ابتدا فہم و خرد کی زد میں آتی ہے، نہ اس کی انتہا مقاماتِ عرفان میں داخل ہے :
اس کے بعد فراق، یعنی آرزوئے مسلسل کا فلسفہ اقبال کی زبان پر آتا ہے :

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

اقبال مرگ آرزو کے قائل نہیں، مرگ آرزو کے معنی ہیں مرگ دوام، وہ لذت طلب کے قائل ہیں :

اگر یہ نعمت حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے۔ لذت طلب کے معنی ہیں تجدید آرزو — آرزو کا تسلسل اور اس تسلسل کے معنی ہیں، نہ ختم ہونے والا جذبہ، اور یہی جذبہ زندگی ہے، پیہم رواں، ہر دم جواں، مزید تشریح :

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

اور اس کے بعد کس جوش و خروش، ذوق و شوق اور وجد و کیف کے عالم میں، فراق کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں :

گرمیِ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق!

اور کون کہہ سکتا ہے کہ فراق کی بارگاہ میں اقبال کا یہ خراجِ عقیدت صرف شاعری ہے :

---

(۳۱)

صحرانشین کا اعجاز

اسلام اور عیسائیت دو متضاد مذہب ہیں، محمدؐ اور مسیحؑ کی جن تعلیمات کو مسلمان اور عیسائی مانتے ہیں، ان میں کوئی اشتراک نہیں، دینِ محمدؐ کے پیرو الحکم للّٰہ اور الارض للّٰہ کے قائل ہیں، وہ دین اور سیاست میں کسی طرح کا امتیاز روا نہیں رکھتے، وہ ایوانِ حکومت اور خانقاہ و مسجد میں کوئی تفریق نہیں کرتے مسلمانوں کا خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین ایوانِ حکومت میں سیاست ملی و خارجی کے فیصلے کرتا ہے میدانِ جہاد میں، سالارِ لشکر کی حیثیت سے رزم و پیکار میں حصہ لیتا ہے مسجد میں، امام کی حیثیت سے نماز پڑھاتا اور معاملات و مسائل کے فیصلے کرتا ہے، وہ بہ یک وقت حکمراں بھی ہے، سالارِ فوج بھی اور امامِ مسجد بھی، وہ مسجد میں جنگ کے نقشے بناتا اور ایوانِ حکومت میں عبادت و ریاضت کرتا ہے اس کی، زندگی اور موت صرف خدا کے لیے ہے، جب تک وہ برسرِ اقتدار ہے، کتاب و سنت کے ماتحت زندگی بسر کرنے، کتاب و سنت کے مطابق امر و نہی کرنے اور قرآن و سنت کی روشنی میں اجتماعی اور انفرادی معاملات و مسائل کی عقدہ کشائی پر مجبور ہے، وہ دین کو سیاست سے اور سیاست کو دین سے جدا نہیں کر سکتا وہ یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہے کہ دین سیاست ہے اور سیاست دین، وہ خالق کی عبادت کرتے وقت مخلوق کو فراموش نہیں کر سکتا، وہ مخلوق کی خدمت کرتے وقت رضائے خالق کو پیشِ نظر رکھتا ہے وہ تلوار کو میان سے نکالتا ہے تو دین کے لیے اور تلوار کو میان میں رکھ لیتا ہے تو دین کے لیے، وہ دوستی کرتا ہے تو خدا کے لیے دشمنی پر آمادہ ہوتا ہے تو خدا کے لیے اس کے احکام و فرامین میں دین جھلکتا ہے اس کی جنگ و پیکار میں دین جلوہ نما نظر آتا ہے، اس کی نفی اور نہی دین سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، اس کا دین جس طرح مسجد میں ہے اسی طرح جنگ کے میدان میں، اسی طرح ایوانِ حکومت میں اس کا سربراہِ مملکت وہ نہیں ہو سکتا جو دین کا رمز آشنا نہ ہو اس کے امور دینی و مذہبی کا ذمہ دار صرف وہ ہو سکتا ہے جو سند

حکومت پر بھی فائز ہو جو امر دے سکتا ہو اور نہی کر سکتا ہو جس کے امر و نہی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو :

اس کے برعکس عیسائیوں کے ہاں دین الگ چیز ہے اور حکومت الگ چیز مذہب جُدا ہے اور سیاست جُدا، پاپائیت کے علاوہ صرف ایوانِ شہریاری کی زینت ہے، اس ایوان سے باہر دو قدم نہیں نکال سکتا، پوپ، پادری اور راہب صرف دین کے لیے وقف ہیں، وہ کلیسا سے قدم باہر نہیں نکال سکتے، ایوانِ خسروی میں قدم نہیں رکھ سکتے، معاملات و مسائلِ ملکی میں حصّہ نہیں لے سکتے، رزم و پیکار سے سروکار نہیں رکھ سکتے، قانون و آئین کی گتھیاں نہیں حل کر سکتے، سیاست کی عقدہ کشائیاں، قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل، داخلی و خارجی پالیسی کی تشکیل ان کی دسترس سے باہر ہے وہ صرف اس لیے ہیں کہ عبادت کریں، خدا کو یاد کریں، وہ خدا کو یاد کر سکتے ہیں، لیکن خدا کی مخلوق کے مسائل حل نہیں کر سکتے، وہ دنیا میں رہتے ہیں، لیکن دنیاداروں کی طرح نہیں رہ سکتے وہ شادی نہیں کر سکتے، اہلی اور عائلی زندگی بسر نہیں کر سکتے، شوہر نہیں بن سکتے، باپ نہیں بن سکتے، بھائی اور بہن کے کام نہیں آ سکتے، ان کی دنیا صرف کلیسا ہے، اس دنیا کے باہر جو کچھ ہے وہ ان کے لیے ناقابلِ قبول اور ناقابلِ برداشت ہے، ان کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ "قیصر کا حق قیصر کو اور کلیسا کا حق کلیسا کو دو" قیصر یعنی بادشاہ کلیسا میں کوئی حق نہیں رکھتا کلیسا یعنی پوپ، راہب اور پادری قیصر کے پاس نہیں پھٹک سکتے —— دونوں کی زندگی الگ، اصولِ زندگی جُدا، نقطۂ نظر مختلف یہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے دور ہیں جس طرح مشرق و مغرب، روڈیارڈ کپلنگ کا قول ہے "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے" حالانکہ اسے کہنا چاہیے تھا قیصر قیصر ہے اور کلیسا کلیسا، یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے :

اقبال نے مغرب کو دیکھا تھا، اہلِ مغرب کو دیکھا تھا، مغرب کے دانش کدوں کو دیکھا تھا، وہاں کی معاشرت، تمدن، تہذیب، نظامِ حیات اور نظامِ مملکت کو دیکھا تھا، صرف دیکھا ہی نہیں تھا، جانچا تھا، پرکھا تھا، بھگا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ تہذیب کھوکھلی ہے، یہ تمدن گِرا ہوا ہے، یہ معاشرت زہر ہے یہ نظامِ حکومت بیہودہ ہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ان لوگوں نے دنیا کو دین سے اور دین کو دنیا سے جُدا کر رکھا ہے، ان کے نظام میں وطن خدا ہے اور یہ خدا غیر ملکی لوگوں کے لیے اندھا، گونگا اور بہرا ہے، یہ دوسروں پر ترس نہیں کھاتا ان پر رحم نہیں کرتا، انہیں انصاف سے محروم رکھتا ہے، انہیں عدل کے دروازے تک نہیں پہنچنے دیتا، ان کی دلدوزی نہیں کرتا، ان کی فریاد نہیں سنتا، ان کے حقوق چھینتا ہے اور پامال کرتا ہے، ان کے مال و دولت پر چھاپہ مارتا ہے اور لوٹ لیتا ہے، انہیں کنگال اور فقیر کر کے اپنے جہنم کو جنت بنا لیتا ہے :

اور پھر اقبال کو ایک صحرا نشین کا وہ اعجاز یاد آتا ہے جس نے دین و سیاست کی اس دوئی کو مٹا کر وحدت پیدا کر دی تھی، دین کو دُنیا سے اور دُنیا کو دین سے اس طرح مربوط اور وابستہ کر دیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے ایک جان دو قالب ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں جو نظام مملکت بروئے کار آیا وہ دُنیا کے لیے انوکھا اور نرالا تھا لیکن اس کے درد کا درماں اور دکھ کا مداوا بھی اس کے علاوہ کوئی نہ تھا، اس نظام نے غربت مٹا دی، پست و بلند کا امتیاز ختم کر دیا، تقسیم دولت کا صحیح نظام رائج کیا، ظلم کو اس طرح مٹا دیا کہ وہ بیخ و بن سے اکھڑ گیا، عدل و انصاف کا دروازہ اتنا وسیع اور کشادہ کیا کہ نہ کوئی ظالم باقی رہا نہ کوئی مظلوم:

اقبال نے سوچا، دُنیا کے مصائب کا علاج، دین و سیاست کی تفریق میں نہیں ہے بلکہ اتحاد و ارتباط میں ہے اور یہ علاج پیغمبر صحرا نے آج سے چودہ سو برس پہلے تجویز کیا تھا اور جتنا مکمل تریاق جب تھا اتنا ہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا:

اب سنئے، اس تخیل کو کس خوبی اور رعنائی کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:

کلیسا کی بنیاد رُہبانیت تھی

سماتی کہاں اس فقیری میں میری

رہبانیت نام ہے ترک لذات کا، ترکِ خواہش کا، ترکِ دُنیا کا، اس نظام رہبانیت میں دُنیا کے تاجدار امیر و سلطان کس طرح سما سکتے تھے؟

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا

چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری

رہبانیت کے ساتھ سیاست جمع نہیں ہو سکتی تھی، آگ اور پانی کس طرح مل سکتے تھے؟ پیر کلیسا (پاپائے روم) نے لاکھ لاکھ زور لگایا لیکن برف کے تودے کو دہکتے ہوئے انگارے میں دیکھتے دیکھتے انگارے کو برف کے تودے میں وہ تبدیل نہ کر سکے اور ان کی اس ناکامی نے حالات کو قابو سے باہر کر دیا دُنیا عریاں ہو گئی، دین گوشہ نشین ہو گیا:

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

لیکن :

یہ اعجاز تھا ایک صحرانشیںؐ کا
بشیری ہے، آئینہ دار نذیری

یعنی پیمبرِ صحراؐ نے، جو نظام دُنیا کے سامنے پیش کیا، وہ دونوں خصوصیتوں کا حامل تھا، یہ نظام بشیری (دینی) بھی تھا، اور نذیری (دنیاوی) بھی، اس میں دین بھی تھا اور سیاست بھی اور ان دونوں کی آمیزش نے، دُنیا کے ہر روگ کا مداوا کر دیا تھا :

---

(۳۲)

ہری شاخ ملّت ترے نم سے ہے

ساقی نامہ —— اردو شاعری کی بڑی دل آویز اور دلکش صنف سخن ہے مثنوی کی طرح اس کی بحر بھی چھوٹی ہوتی ہے خیالات بلند، الفاظ سبک، تراکیب سادہ، بندش چست، اصناف شاعری کی یہ نہایت مشکل صنف ہے، بڑے بڑے فن کار شاعروں کے لیے اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں اقبال نے جب کبھی اس صنف پر توجہ کی ہے، تو مٹنے والا نقش قائم کر گئے ہیں:

بال جبریل میں ان کا طویل ساقی نامہ شائع ہوا ہے، وہ ان سخت سے سخت شرائط پر پورا اترتا ہے جو اس صنف سخن پر عائد کیے جاسکتے ہیں، آغاز ہی دیکھیے کتنا پر کیف ہے:

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن!
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

اب اس طویل ساقی نامہ کے ایک منظر نامہ کے ایک مختصر سے حصّے پر بھی نظر ڈال لیجیے۔

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

اس ساقی نامہ کے سات بند ہیں، تیسرے بند کا ایک حصہ ذکرِ رسولؐ پر مشتمل ہے: پہلے وہ خدا سے التجا کرتے ہیں:

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا

نزاکتِ خیال دیکھی آپ نے؟ عشقِ رسولؐ کے پر لگا کر اڑنا چاہتے ہیں تاکہ خاک کے ذرے جگنو کی طرح روشن ہو جائیں، اور اندھیرے میں بھٹکنے والے لوگوں کی رہبری اور رہنمائی کر سکیں، اب براہِ راست رسالت پناہؐ سے مخاطب ہیں:

ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

شرفِ تخاطب حاصل کرنے کے بعد عرض و التجا کا سلسلہ شروع کرتے ہیں:

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰ، سوزِ صدیقؓ دے

اپنے لیے جب یہ دعا کرتے ہیں تو معاً ذہن قوم کے نوجوانوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، وہی نوجوان جو آج کچھ نہیں ہیں، لیکن کل قوم بنیں گے، کہتے ہیں:

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

اقبالؔ کو اپنے حُبِّ رسُول پر ناز ہے، فخر ہے، چاہتے ہیں کہ یہ نعمت جو انہیں قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے، قوم کے نوجوانوں کو بھی مل جائے، وہ یہ نعمت اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے، ترکہ اور ورثہ کے طور پر اپنے نوجوانوں کو بخش دینا چاہتے ہیں، یہ نعمت ـــ حُبِّ نبیؐ ـــ اگر نوجوان طبقے کو مل جائے تو پھر مستقبل روشن ہے، حال کتنا ہی یاس انگیز ہو، لیکن مستقبل کی درخشانی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے:

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری

غرض یہ، اور اس کے علاوہ، جو کچھ میرے پاس ہے، وہ میرا نہیں، میری قوم کا ہے:

یہی کچھ ہے، ساقی، متاعِ فقیر

اور یہ پونجی میں اپنے نوجوانوں کو دیتا ہوں:

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

مدحِ رسولؐ

شش جہت روشن ز تابِ روئے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو

در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

(۴۳)

لذتِ پرواز

○

بات میں بات پیدا کرنا اقبال کی ادا ہے، وہ بات کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں اور بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں، معراج پر انہوں نے متعدد مواقع پر اظہار خیال کیا ہے اور ہر مرتبہ کوئی نئی بات کہی ہے جس میں عظمت رسالت پناہ بھی ہویدا ہے اور مسلمانوں کے لیے ولولۂ شوق کا پیام بھی موجود ہے۔ وہ مسلمانوں کو منزل مقصود کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور راہِ راست کی رہروی پر آمادہ کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :

وے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز !
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

پھر اصل مقصد پر آتے ہیں یعنی مسلمان کو بتاتے ہیں، معراجِ رسولؐ سے کیا سبق ملتا ہے :

ناوک ہے مسلماں، ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سرّ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج

پھر احساس ہوتا ہے، یہ مرد مسلماں، اسلام کو بھی فراموش کر چکا ہے اور اسلام کے پیام کو بھی اس کے مقصد اور روح کو بھی، دیکھیے کیسا بھرپور طنز کرتے ہیں :

تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

نذرِ عقیدت بحضورِ رسولؐ

○

ایں زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند

—: ○ :—

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

○

۴۳

اے رُوحِ محمد

○

جب تک مسلمان کتاب و سنت پر عامل تھے، دُنیا ان کے قدموں کے نیچے تھی، جب تک وہ آنحضرتؐ کے نقشِ قدم کی پیروی اصلِ حیات سمجھتے تھے، وہ سیلِ رواں کی طرح آگے بڑھتے رہے اور دُنیا کی کوئی طاقت انہیں پیش قدمی سے نہ روک سکی، انہوں نے ایران کی عظیم و جلیل سلطنت کے ٹکڑے اڑا دیئے انہوں نے روم کی شوکت و سطوت کا خاتمہ کر دیا، انہوں نے جس طرف رُخ کیا، کامیابی و کامرانی ہاتھ باندھ کر ساتھ چلتی رہی:

لیکن جب یہ راستہ انہوں نے ترک کر دیا۔ تو ادبار و زوال کی زد میں آ گئے، ان کی عظمت و سطوت افسانۂ پارینہ بن گئی، اور وہ کچھ نہ رہ گئے، یہ جگر خراش منظر دیکھ کر، علامہ براہِ راست، روحِ محمدؐ کو مخاطب کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں:

شیرازہ ہُوا ملّتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وُہ لذّتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حُدی خوان کدھر جائے

اور آخر میں کتنے جوش اور ولولہ کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں :

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

شریعت

○

در شریعت معنیٔ دیگر مجو
غیر ضو در باطنِ گوہر مجو

—:○:—

این گہر را خود خدا گوہر گر است
ظاہرش گوہر بطونش گوہر است

○

(۳۵)

محمدِ عربی اور عالمِ عربی

بھٹکے ہوئے راہی کو کھوئی ہوئی منزل کا سراغ نہیں ملتا، لیکن اقبال یاس کی تاریکی، ناکامی کے اندھیرے اور شکست کی سیاہی میں بادِ مخالف سے اپنا دیا بچاتے، اس کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سے نشانِ منزل کی طرف اشارہ کرتے رہتے ہیں:

خلافتِ اسلامیہ ترکیہ سے، عربوں نے غداری کی، ترک افسروں اور حاکموں کو قتل کیا، بغاوت کا پرچم لہرایا اور آزاد عرب ممالک کا خواب دیکھنے لگے، انگریز خلافتِ عثمانیہ کے دشمن اور بدخواہ تھے ہی انہوں نے اور شہ دی اور عربوں کو اپنے ساتھ ملا لیا، عرب سادہ لوح تھے ہی، اس دامِ ہم رنگ زمیں میں گرفتار ہو گئے لیکن انگریزوں نے اپنے وعدہ کا ایفا اس طرح کیا کہ جب پہلی جنگِ عظیم کامیابی پر ختم ہو گئی اتحادی جیت گئے اور دشمن —— جرمنی، ترکیہ وغیرہ —— شکست کھا گئے پھر عربوں کے تعاون کی ضرورت نہ رہی، تو عالمِ عرب کے حصے بخرے کر لیے، عراق برطانوی پرچم لہرانے لگا، شام اور لبنان پر فرانس نے، جو انگریزوں کا اتحادی تھا قبضہ کر لیا، شرق اردن اور فلسطین بھی فرنگی تحویل میں آ گئے، اور لارڈ بالفور نے یہودیوں سے وعدہ کر لیا کہ فلسطین جو خالص عرب رقبۂ زمین تھا اور جہاں یہودی ایک فیصدی بھی نہیں تھے وطنِ یہود بنا دیا جائے گا اور یہ بالآخر یہ وعدہ انہوں نے پورا بھی کیا، آج اسرائیل نامی ایک یہودی حکومت قائم ہو چکی ہے:

اقبال نے محسوس کیا، عربوں کی یہ روش مفادِ اسلام سے غداری تھی اور سراسر اسلام ناشناسی پر مبنی تھی، چنانچہ انہوں نے عرب فرمان رواؤں سے دریافت کیا:

یہ ایک نکتہ سکھایا گیا کس امت کو ۔۔۔ وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی

اور پھر بتایا:

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا ۔۔۔ محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی

(۳۶)

منزلِ مقصود

○

گذشتہ صفحات میں اقبال کا جو مشن ہم نے پیش کیا ہے، وہ مغربی اعتاب سے عالمِ عرب اور اس کے واسطے سے سارے عالمِ اسلام کے لیے، ایک نہ بھولنے والا سبق ہے یعنی :-

وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی

مطلب یہ کہ اسلام، اتحاد و اخوت، ربطِ باہمی اور رفق و موانست کا علمبردار ہے، یہاں حدود و ثغور کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، جس نے اسلام قبول کر لیا، وہ اسلامی برادری کا رکن بن گیا اور اسے وہی حقوق حاصل ہو گئے جو ایک مسلمان کو حاصل ہو سکتے ہیں، اب نہ کوئی امتیاز رہا، نہ افتراق، نہ کسی طرح کا تعصب، نہ حد بندی لہٰذا، وصالِ ملی ہی درحقیقت تعلیمِ مصطفوی ہے، دوسری قومیں نسل و نسب، قوم و وطن، ملک و ریاست کے چکر میں گرفتار ہیں، ان کی برادری مذہب پر نہیں، قومیت اور وطنیت پر قائم ہے۔ اسلام کی برادری جتنی وسیع ہے، غیر مسلموں کی برادری اتنی ہی سکڑی ہوئی اور محدود ہے۔ اسلام کی برادری میں ہر آن اور ہر لحظہ اضافہ ہو سکتا ہے، غیر مسلموں کی برادری کا انحصار تعداد و اموات و پیدائش پر منحصر ہے، ایک حبشی اگر مسلمان ہو جائے تو وہ حرمِ کعبہ میں ایک عربی کے دوش بدوش نماز پڑھ سکتا ہے، خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے لیکن ایک ہندی اگر عیسائی ہو جاتے تو وہ انگلستان، امریکہ، جرمنی، فرانس یا کسی غیر ملک کا شہری ہی نہیں بن سکتا، نہ یہ کہ اس کے معاملات و مسائل میں ایک عیسائی کی حیثیت سے حصہ لے سکے، یہی نہیں، ہندوستان میں رہ کر بھی وہ صرف اس کلیسا میں جا سکتا ہے جو کالے لوگوں کے لیے مخصوص ہے: اس کلیسا کے حدود میں قدم نہیں رکھ سکتا جہاں سفید اقوام کے افراد خدا کو یاد کرنے کے لیے مجتمع ہوتے ہیں: لہٰذا افتراق یہ ہے، انسانیت کو ایک برادری بنا دینا، اسلام یعنی مصطفویت ہے اور انسانیت کو مختلف

ٹکروں قطعوں اور برادری میں تقسیم کر دینا باطل یعنی بولہبیت ہے :

اقبال کے اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد اب ان کی ایک دوسری نہایت اہم غزل پر نظر ڈالیے۔ وُورا فتادہ میں نے اس لیے کہا کہ مذکورہ نظم اور اس غزل میں صفحات اور اوراق کے اعتبار سے کافی فصل ہے :

اس نظم میں اقبال نے اس امر پر حیرت اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مسلمان فرنگی سامراج کی حقیقت کو سمجھنے اور جاننے کے باوجود اس کی طرف لپک رہے ہیں، گویا وہ خوبیوں اور اچھائیوں سے بھرپور ہے حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ یہ مغربی تہذیب نہایت کمزور بنیادوں پر قائم ہے۔ جو تہذیب انتراق انسانی پر مبنی ہو، جو خدا کے بندوں میں دوئی اور تفرقہ پیدا کرتی ہو، جو خود غرضی اور شکم پرست ہو، جو دوسروں کے حقوق پر چھاپہ مارتی ہو، دوسری قوموں اور ملتوں کو غلام بناتی ہو، جو معاہدے توڑتی ہو، جو جھوٹ بولتی ہو فریب کاری جس کا اصول ہو، دروغ و مکر جس کی سرشت ہو، اس کی بنیاد مضبوط و مستحکم کیسے ہو سکتی ہے۔ یا وہ کامیاب کیسے ہو سکتی ہے" وہ انسانیت کے دکھ کا مداوا کس طرح بن سکتی ہے؟

یہ اتنا صرف اور سادہ اصول ہے کہ جب مسلمان اسے بھی نہیں سمجھتے تو اقبال غرقِ حیرت ہو جاتے ہیں، انھیں افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان سلامتی کا راستہ چھوڑ کر تباہی اور بربادی کے راستے پر کیوں گامزن ہو رہے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہبان صاحبِ مازاغ

"صاحبِ مازاغ" سے مراد رسالت مآبؐ کی ذاتِ گرامی ہے، یعنی تو کہ تیری آنکھیں جمالِ مصطفوی کی نعمت سے بہرہ مند ہیں، اس نور کو چھوڑ کر مغرب کی ظلمت کو روشنی سمجھ رہا ہے اور روشنی بھی ایسی جس سے تیری آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی ہیں :

اس کے بعد کتنے پتہ کی بات کتنے بدیع اور دلکش اسلوب میں کہتے ہیں :

وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

مسلمان سے

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است
آب و تابش از یمِ پیغمبر است
آب نیسانی بہ آغوشش درآ
در میانِ قلزمش گوہر برآ
در جہاں روشن تر از خورشید شو
صاحبِ تابانیِ جاوید شو

(۳۷)

وارداتِ مصطفیٰ

○

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ گرامی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(۱) پہلا دور ، فتح مکہ سے قبل کا

(۲) دوسرا دور ، فتح مکہ کے بعد کا

پہلا دور عبارت تھا "فقر" سے سرورِ کائنات کے پاس نہ دنیاوی ساز و سامان تھا، نہ امارت و وجاہت نہ دولت و ثروت، نہ مرد و مرغ سا لشکر، نہ تیر و تفنگ، نہ شمشیر و سناں، بایں ہمہ یہ دور اپنی رفعت اور بلندی کے اعتبار سے ایسا تھا جس کی مثال چشمِ عالم نے کبھی نہ دیکھی تھی، نہ اس کے بعد دیکھے گی :

دوسرا دور وہ تھا جب مکہ فتح ہو گیا اور حجاز پر سرورِ کائنات کی حکومت قائم ہو گئی اب تک جو لوگ مخالف اور دشمن تھے اب ماتحت اور سرنگوں ہو گئے اب تک جن کے شب و روز مخالفت اور عناد میں صرف ہوتے تھے، اب وہ محکوم اور تابع تھے، اب تک جن کی ساری کوششوں اور سرگرمیوں کا مرکز یہ جذبہ تھا کہ جس طرح بھی ہو (خاکم بدہن) داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خاتمہ کر دیں، اسلام کا پیام کسی کان تک نہ پہنچنے دیں، جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں، وہ انہیں ہلاک کر ڈالیں جنہیں اسلام اور داعیِ اسلام سے ہمدردی ہے، انہیں تہ و بالا کر دیں لیکن وہی تھے جن کی گردنیں اب جھکی ہوتی تھیں، بدلے کا سنپ رہا تھا زبان لرز رہی تھی، بھیانک انجام سامنے تھا، جانتے تھے بجا طور پر اب سزا ملے گی، اور ایسی عبرت انگیز سزا ملے گی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا :

لیکن "فقر و شاہی" کے ہر دو رہیں آنحضرتؐ نے کیا کیا ؟

جب فقر کی کار فرمائی تھی تو آپؐ نے اپنے دشمنوں، مخالفوں اور ستانے والوں کے لیے بد دعا تک نہ

کی، ان کی ہر ایذا رسانی کو خندہ جبینی کے ساتھ برداشت فرمایا، کبھی ان کے حد سے آزاد نہ ہوئے، ان کا برا نہ چاہا، ان کے خلاف کوئی کلمہ زبان مبارک سے نہ نکالا:

پھر جب یہ سارے، شاہی ہاتھ میں آیا تو سب کی گردنیں ماری جا سکتی تھیں، سب کو جلاوطن کیا جا سکتا تھا، سب کی املاک و جائداد پر قبضہ کیا جا سکتا تھا، لیکن آپ نے یہ کچھ نہ کیا، سب کو جمع کیا، ان کے سہمے ہوئے چہرے ملاحظہ فرمائے اور وفورِ رحمۃ للعالمینؐ کی زبان سے ان خاطیوں اور مجرموں نے یہ خوش خبری سُن لی:

لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا انتم الطلقاء

یعنی:

اب تم پر کوئی الزام نہیں ہے، جاؤ، تم سب آزاد ہو:

یہ سنتے ہی ان لوگوں کو زندگی مل گئی جو موت سے ہمکنار ہونے کی تیاری کر رہے تھے،

آنحضرتؐ کے اس طرزِ عمل کا، آج کی روشن خیال، متمدن اور "سیکولر" حکومتوں سے موازنہ کیجیے، یہ حکومتیں اقلیت کو جاسوس سمجھتی ہیں، اس کی وفاداری پر شک کرتی ہیں، اس کے اخلاص کو مشکوک قرار دیتی ہیں، اس کی وطن دوستی کا مذاق اڑاتی ہیں، اس کی معمولی سی غلطیوں کو بھی فراموش نہیں کرتیں:

اقبال کی نظر میں، مسلمان کے لیے زندگی کے ہر دور میں ——— خواہ وہ فقر کا ہو یا شاہی کا ——— اسوۂ رسولؐ، رہبری اور رہنمائی کے لیے موجود ہے، وہ فقر اور شاہی دونوں کو "واردات مصطفےٰؐ" قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس نمونۂ کامل سے اس اسوۂ حسنہ سے روشنی حاصل کریں اور زندگی کا راستہ طے کریں:

افغانستان کے نادر شاہ میں اقبال کو اسلامیت کی صحیح جھلک نظر آتی ہے، ان کی اسلامیات سے انہیں بڑی بڑی امیدیں تھیں، وہ انہیں بار بار اسی جادۂ صواب کی طرف دعوت دیتے ہیں، چنانچہ شاہ مرحوم کے کمالات و فضائل اور خصائص و کمالات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں اور دنیا کے ہر مسلمان کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

فقر و شاہی واردات مصطفےٰؐ است
ایں تجلیائے ذات مصطفےٰؐ است

ایں دو قوت از وجود مومن است
ایں قیام و آں سجود مومن است

اور پھر بتاتے ہیں :

فقر سوز و درد و داغ آرزو است
فقر را در خوں تپیدن آبروست

۱؎ مثنوی، پس چہ باید کرد، ص

(۳۹)

رمزِ دینِ مصطفےٰ

○

اقوامِ سرحد کو اقبال مخاطب کرتے ہیں اور انہیں دینِ مصطفےٰ کا رمز بتاتے ہیں یہ رمز درحقیقت رمزِ حیات ہے، درسِ خودی ہے، پیامِ زندگی ہے:

فرماتے ہیں:

رمزِ دینِ مصطفےٰ دانی کہ چیست ؟
فاش دیدن خویش را شاہنشہی ست

پھر بتاتے ہیں "دین" کیا ہے ؟

چیست دیں ؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

آں مسلمانے کہ بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را

ایسے خودشناس اور خودنگر مسلمان کا عالم کیا ہوتا ہے ؟

در مکاں و لامکاں غوغائے او
نہ سپہر آوارہ در پہنائے او

یہ قلندر جب خودشناس و خودنگر بن جاتا ہے تو کس مقام رفیع پر فائز ہوتا ہے ؟

مردِ حق بیں وارثِ پیغمبراں
او نگنجد در جہانِ دیگراں

ذرہ از گرد راہش آفتاب
شاہد آمد بر عروج او کتاب

اور کیا اس مقام رفیع کے حاصل کرنے کے بعد بھی کوئی درجہ ایسا رہ جاتا ہے جس کی طلب میں قدم آگے بڑھیں اور جس کی تلاش میں آنکھیں منزل کی جستجو کریں :

---

(۴۹)

ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰ است

○

بادشاہ نادر شاہ کی استدعا پر اقبال افغانستان کا سفر کرتے ہیں، وہاں کے در و دیوار تک سے انہیں وابستگی ہے، اس لیے کہ یہ سرزمین اسلامی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش صفحہ ہے یہاں کے چپہ چپہ پر ایسے ایسے آثار و نقوش ہیں جنہیں ایک بیدار اور حساس دل عقیدت کی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہے اس سرزمین پر بڑے بڑے فاتح اور کشور کشا ابھرے یہاں علما کی محفلیں جمیں اور حکمارنے اپنا دربار سجایا یہاں علم کے چشمے ابلے اور حقیقت و معرفت کی خانقاہیں قائم ہوئیں اس خاک پاک نے بڑی بڑی شخصیتوں کو پیدا کیا، اور ان شخصیتوں نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا، سرزمین افغانستان اس اعتبار سے قابلِ رشک ہے کہ یہاں جس پایہ کے تاجدار اور شہریار پیدا ہوتے، اسی مرتبہ اور درجہ کے حکما بھی پیدا ہوئے تاجداروں اور شہریاروں نے دنیا کا نظام بدل دیا، عالموں، حکیموں اور صوفیوں نے روحانیات کی دنیا میں ایسا تغیر پیدا کیا کہ اس کے اثرات اب تک قائم ہیں، اور رہتی دنیا تک قائم رہیں گے :

سفرِ افغانستان کے دوران میں، اقبال غزنی بھی گئے اور وہاں حکیم سنائی کے مزار پر انوار کی زیارت بھی کی کہتے ہیں اور کتنے جوش و خروش کے عالم میں کہتے ہیں :

از نوا دشش ہائے سلطانِ شہید

صبح و شامم، صبح و شام روزِ عید

پھر غزنی کا ذکر کرتے ہیں :

دولت محمود را زیبا عروس

از حنا بندانِ او دانائے طوس

اس کے بعد حکیم سنائی کا ذکر کرتے ہیں:

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی

از نوائے او دل مرداں قوی

یہاں بھلا اقبال کی زبان خاموش کیوں کر رہ سکتی تھی! انہوں نے مزار سنائی پر بیٹھ کر مراقبہ کیا اور حکیم سنائی یعنی:

آں حکیم غیب آں صاحب مقام

سے گفتگو شروع کر دی، پوچھا

عمر ما وا رفتۂ آب و گل است

اہل حق را مشکل اندر مشکل است

مومن از انداز ترسیاں دید آنچہ دید

فتنہ ہا اندر حرم آمد پدید،

اے حکیم غیب امام عارفاں

پختہ از فیض تو خام عارفاں

آں چہ اندر پردۂ غیب است گوئے

بو کہ آب رفتہ باز آید بجوئے

حکیم معرفت یعنی سنائی نے اقبال کی یہ صدائے درد سنی اور جواب دیا:

سلطنت اندر جہانِ آب و گل

حمیت او قطرہ از خونِ دل

دوستاں اندر سپہر لاجورد

زندہ از عشق اند و فارغ از خواب و خورد

اس کے بعد روحِ سنائی بتاتی ہے:

می ندانی عشق و مستی از کجاست؟

ایں شعاع آفتاب مصطفیٰ است
زندہ تا او زاو در جان تست
ایں نگہ دارند ہم ایمان تست

دین کے متعلق کیسا لطیف نکتہ اور کتنی نازک بات ارشاد فرماتے ہیں :

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر

پھر اصحاب علم و فضل کی حقیقت پر ایک نظر ڈالتے ہیں :

بوعلی دانندہ آب و گل است
بے خبر از خستگیہائے دل است

اور پھر آخری نکتہ بتاتے ہیں کہ یہی معراج حیات اور یہی اصول زندگی ہے :

مصطفیٰ بحر است و موج او بلند
خیز و ایں دریا بجوئے خویش بند
مدتے بر ساحلش پیچیدہ
لطمہ ہائے موج او نادیدہ
یک زماں خود را بدریا در فگن
تا رواں رفتہ باز آید بہ تن
اے مسلماں جز بہ راہ حق مرو
ناامید از رحمت عامے مشو

---

(۴۰)

خرقۂ مبارک[۱]

○

اب اقبال قندھار پہنچتے ہیں اور یہاں آنحضرتؐ کے خرقۂ مبارک کی دید سے شاد کام ہوتے ہیں
قندھار کے ذکر میں دیکھیے کیسے کیسے آبدار موتی الفاظ کی صورت میں زینتِ قرطاس ہوتے ہیں :

قندھار آں کشورِ مینو سواد
اہلِ دل را خاکِ او خاکِ مراد

خاکِ مراد کی جدتِ ترکیب کتنی انوکھی اور قابلِ داد ہے :
اب قندھار کو دیکھیے :

رنگ ہا، بو ہا، ہوا ہا، آب ہا
آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا

دیکھیے شاعر کی زبان کیسی کیسی گل افشانیاں کرتی ہے :

لالہ ہا در خلوتِ کہسار ہا
نار ہا یخ بستہ اندر نار ہا

لیکن یہ ساری چیزیں ہیچ اور بے حقیقت ہیں، قندھار کا یہ تمام حسن و جمال، یہ تمام رعنائی
یہ تمام رعنائی و دل فریبی اس لیے عزیز ہے کہ

کوئے آں شہر است آں را کوئے دوست
ساربان بربند محمل سوئے دوست[۱]

---

[۱] مثنوی پس چہ باید کرد، ص ۲۸

قلبِ شاعر

ہمیں یک سرِ چوب مِن سرمایہ نے
نہ چوبِ منبر سے ، نے چوبِ دار نے

(۴۱)

در جبینِ اُو خطِ تقدیرِ گل

مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کی ایک غزل وجد و حال کے عالم میں اقبال کی زبان پر آتی ہے:

از دیرِ مغاں آیم بے گردشِ صہبا مست
در منزلِ لا بودم از بادۂ الا مست
دل را بہ چمن بردم، از بادِ چمن افسرد
میرد بہ خیاباں ہا، ایں لالۂ صحرا مست
از حرفِ دل آویزش اسرارِ حرم پیدا
دی کافرکے دیدم در وادیِ بطحا مست

اور پھر بے خود ہو کر سوال کرتے ہیں اور بے ساختہ پوچھتے ہیں:

سیناست کہ فاران است یا رب چہ مقام است ایں
ہر ذرۂ خاکِ من چشمے است تماشا مست

دفعتاً ہوش کی آنکھیں کھلتی ہیں اور زبان پر حقیقت کا افسانہ جاری ہو جاتا ہے: وہ اُو آئینۂ اُو تعبیرِ گل

در جبینِ اُو خطِ تقدیرِ گل
عقل را اُو صاحبِ اسرار کرد
عشق را اُو تیغِ جوہر دار کرد

اور

کاروانِ شوق را اُو منزل است
ما ہمہ یک مشتِ خاکیم اُو دل است

(۴۲)

قرآن و حدیث

○

اسلام عبارت ہے قرآن و حدیث سے، یعنی ارشادِ خداوندی اور سنتِ رسولؐ سے، اس چیز کو قرآن کی اصطلاح میں کتاب و حکمت کہتے ہیں، کتاب یعنی قرآن حکمت یعنی سنتِ رسولؐ، اقبال مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح کی لازمی طور پر قرار دیتے ہیں کہ وہ قرآن و سنت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں جب تک وہ اس نور کی روشنی میں رہبروی کرتے رہیں گے، گمراہ نہ ہوں گے اور اس سے ہٹ کر جس راستہ پر چلیں گے، وہ بہرحال ہلاکت اور بربادی کا راستہ ہے۔

نادر شاہ اقبال کے ممدوح تھے، ان کے حادثۂ قتل کے بعد ظاہر شاہ تختِ حکومت پر متمکن ہوئے اقبال کو ان سے بھی وہی توقعات تھیں جو ظاہر شاہ سے تھیں، چنانچہ ان کی اورنگ نشینی پر خوش ہو کر سراپا نشاط و مسرت بن کر کہتے ہیں:

اے قبائے پادشاہی بر تو راست
سایۂ تو خاک مارا کیمیاست
خسروی را از وجودِ تو عیار
سطوتِ تو ملک و ملت را حصار

یہ قصیدہ مدحیہ پڑھ کر حرفِ مطلب زبان پر لاتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

حرفِ شوق آوردہ ام، از من پذیر
از فقیرے رمزِ سلطانی بگیر

اور یہ فقیر بے نوا ایک شاہ کج کلاہ کو رمزِ سلطانی جو بتاتا ہے وہ نہ میکیاولی کا درسِ مکر و فریب ہے

نہ فرنگی شیشہ گروں کی خوار وذلیل سیاست ہے اس کے نزدیک جس سیاست کی بنیاد مکر وفریب پر ہو، وہ اس لائق نہیں کہ اسے انتقاد کیا جائے جو حکومت دین و مذہب سے بیگانہ ہو، وہ اس قابل ہے کہ اس کا تختہ الٹ دیا جائے، جو فرماں روا اپنی ذاتِ شاہانہ کو قانون اور آئین سمجھتا ہو، وہ اس قابل ہے کہ اس کی قبائے شہر یاری کی دھجیاں اڑا دی جائیں، اس کا تاج خسروی چھین لیا جائے، اس کا لباس سلطانی پارہ پارہ کر دیا جائے، وہ اس قابل نہیں کہ خلق خدا پر حکومت کر سکے وہ اس کا مستحق نہیں کہ خدا کی مخلوق پر نفس و ہوس کے احکام صادر کر سکے، مگر از کم ایک مسلماں فرماں روا سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جو شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اور تختِ حکومت پر متمکن ہوتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اسلام کے قانون کو پیش نظر رکھے اور خدا کے بنائے ہوئے نظام کو رائج کرے، اس کا کام صرف حکم الٰہی کا نفاذ ہے، نہ کہ خود اپنی ذات کو سرچشمہ قانون و آئین سمجھ کر قانون کا بنانا اور نافذ کرنا :

چنانچہ اپنے ممدوح کی تعریف بیان کرنے کے بعد اس پر رمز سلطانی یوں فاش کرتے ہیں :

برگ و ساز ما کتاب[1] و حکمت[2] است

این دو قوت اعتبار ملت است

آں فتوحاتِ جہاں ذوق و شوق

ایں فتوحاتِ جہاں تحت و فوق

ہر دو انعام خدائے ذوالجلال

مومناں را آں جلال است ایں جمال

پھر اپنے ممدوح کو یہ سمجھاتے ہیں کہ آج دنیا میں جو ترقیاں نظر آ رہی ہیں، یہ سب درحقیقت ان ہی مسلمانوں کی لائی ہوئی اور پیدا کی ہوئی ہیں، جنہوں نے کتاب و سنت کا پرچم لے کر یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اور اسے روشن ضمیری اور روشن خیالی سے آشنا کیا تھا، اسے علم و حکمت کے گر بتلائے تھے

---

[1] کتاب یعنی قرآن مجید [2] حکمت یعنی سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم :

حکمت اشیا، فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است
ایں گہر از دست ما افتادہ است

وہ کس طرح؟

چوں عرب اندر اروپا[1] پر کشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند

---

[1] اروپا، یورپ۔

(۴۳)

حکمتِ کلیمی

○

ذکرِ رسولؐ جب اقبال کی زبان پر جاری ہوتا ہے تو ان کا کلام حقائق و معارف کا دفتر بن جاتا ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس میں وزن ہوتا ہے گہرائی ہوتی ہے، گیرائی ہوتی ہے، ان کی زبان میں اثر پیدا ہو جاتا ہے ان کا کلام دل ربا بن جاتا ہے، ان کی بات دل میں اتر جاتی ہے ان کا خیال پڑھنے والوں کا خیال بن جاتا ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں، اپنی زبان سے کہتے ہیں، اپنے دل سے کہتے ہیں لیکن پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ میری زبان ہے یہ میرے دل کی ترجمان ہے:

دنیا میں بادشاہوں اور شہنشاہوں نے جو کچھ کیا وہ کس سے پوشیدہ ہے، ان کی تلواروں نے انسانوں کا خون بہایا، ان کی فوجوں نے انسانیت کو پامال کیا، ان کی رعونت نے انسانیت کو کچلا ان کی انا، خود پسندی اور تمرد نے انسان کو کہیں کا نہ رکھا، انہوں نے باطل کو حق بنا دیا حق کو باطل کر دیا، انہوں نے انصاف کو ذبح کیا حقوق انسانی پامال کیے، انہوں نے آبادیوں کو ویرانہ کر دیا، لہلہاتے کھیتوں کو اجاڑ دیا، باغ و چمن میں آگ لگا دی گھر میں کو تاراج کیا، دولت چھین لی، آبرو لوٹی، ناموس پر ڈاکہ ڈالا:

لیکن حکومت کی باگ جب کبھی خدا کے نیک بندوں کے ہاتھ میں آئی، ان بندوں کے ہاتھ میں جنہوں نے بارگاہ رسالت مآب سے خوشہ چینی کی جنہوں نے نطقِ رسالت پناہؐ کو اپنا رہبر اور رہنما بنایا، تو حالت بدل گئی، ایسا معلوم ہوا کہ جیسے خزاں کا دور گذر گیا اور بہار کی فرماں روائی قائم ہو گئی، تاریکی دور ہو گئی، روشنی چار سو پھیل گئی، باطل ناکام ہوا اور حق کی سلطانی کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بجنے لگا:

یہ نظام حکومت اقبال کی اصطلاح میں "حکمت کلیمی" کہلاتا ہے، اس موضوع پر انہوں نے بہت کچھ کہا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے، وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، اس سلسلہ میں فرمودات اقبال کا ایک ہلکا سا نمونہ آپ

بھی ملاحظہ کر لیجئے :

تا نبوت حکم حق جاری کند
پست پا بر حکم سلطاں می کند
در نگاہش قصر سلطان کہنہ دیر!
غیرت او برنتابد حکم غیر
پختہ سازد صحبتش ہر خام را
تازہ غوغائے دہد ایام را
درس او اللہ بس باقی ہوس
تا نیفتد مرد حق در بند کس

از نم او آتش اندر شاخِ تاک
در کف خاک از دم او جان پاک

معنی جبریلؑ و قرآں است او
فطرت اللہ را نگہبان است او
حکمتش برتر ز عقل ذو فنون
از ضمیرش امتے آید برون

پھر مزید تشریح کرتے ہیں :

حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج
بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

بحر و بر از زورِ طوفانش خراب
در نگاہے او پیامِ انقلاب

اور یہ انقلاب کیا ہے ؟

درسِ لاخوف علیہم مے دہد
تا دلے در سینۂ آدم نہد
عزم و تسلیم و رضا آموزدش،
در جہاں مثلِ چراغ افروزدش
من نمی دانم چہ افسوں می کند
روح را در تن دگرگوں می کند
صحبتِ او ہر خزف را دُر کند
حکمتِ او ہر تہی را پُر کند

اور اس انقلاب کی انتہا یہ ہے کہ :

بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز
ہر کہن معبود را کن ریز ریز،
بگذر از کاؤس و کے اے زندہ مرد
طوفِ خود کن گردِ ایوانے مگرد

---

(۴۴)

متاعِ مصطفیٰ

○

تعلیماتِ اقبال کا اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ چند چیزوں پر وُہ بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور ان کے ہاں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں "فقر" کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہے، اقبال کی نظر میں "فقر" وہ اکسیر ہے جو خاک کو کیمیا، ذرے کو آفتاب اور قطرہ کو دریا بنا دیتی ہے، بغیر اس کے نہ نفس کی تربیت ہو سکتی ہے نہ رُوح کی، جب تک فقر رگ رگ میں نہ سما جائے معرفت کی وہ نگاہ پیدا نہیں ہو سکتی، جسے نگاہ "مردِ مومن" سے اقبال نے تعبیر کیا ہے:

لیکن یہ فقر، اقبال کی نظر میں بہت گراں مایہ کیوں ہے؟

اس کی اہمیت اور حیثیت کیا ہے؟

اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے حدود و اربعہ کیا ہیں؟

اقبال نے ان سب سوالات کا جواب وضاحت لیکن اختصار کے ساتھ دیا ہے،

فقر کی تعریف متعدد مواقع پر، مختلف الفاظ میں اقبال نے کی ہے، لیکن ان کے کلام سے اس لفظ کی جامع و مانع تعریف اگر تلاش کی جائے تو وُہ یہ ہے:

خود ہی سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں:

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل

یک نگاہ راہ بیں، یک زندہ دل

یہ تو ہوئی تعریف، لیکن اس کی گراں مایگی کا سبب کیا ہے؟ اس کی اتنی اہمیت اور حیثیت کیوں ہے، اس کا جواب بھی بے پُوچھے وہ دیتے ہیں:

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

لیکن نان جو کھانے کے فقر میں یہ ولولہ کہاں سے پیدا ہوا کہ وہ خیبر گیر بن گیا ؟

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینیم - این متاعِ مصطفیٰ است

یعنی فقر ذوق و شوق اور تسلیم و رضا ہے، ہماری حیثیت صرف امین کی ہے اور جس پونجی کی امانت ہمیں سپرد ہوئی ہے، وہ متاعِ مصطفےٰ ہے اس لیے اس میں وہ بے پناہ قوت ہے جو کہیں اور کسی چیز میں نہیں مل سکتی، یہ ایسا سیل رواں ہے جس کے سامنے کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی، یہ جب بے خیل و سپاہ میدان میں آتا ہے تو کوئی اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا :

فقر بر کرّوبیاں شب خون زند
بر نوامیسِ جہاں شب خوں زند
بر مقامِ دیگر اندازد ترا
از زجاجِ الماس می سازد ترا

فقر کی مزید تعریف :

برگ و ساز او ز قرآنِ عظیم
مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن !
یک دم او گرمیِ صد انجمن

بے پراں را ذوقِ پروازے دہد
پشّہ را تمکینِ شہبازے دہد

با سلاطین در فتد مرد فقیر
از شکوه بوریا لرزد سریر

کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی طاقت ہو سکتی ہے کہ کم سخن ہو لیکن اپنے اندر گرمیِ صد انجمن پنہاں رکھتا ہو، جو بے بال و پر ہوں، انہیں ذوقِ پرواز دے، مچھر میں شہباز کا دبدبہ اور جلال پیدا کر دے جس کے شکوہ بوریا سے تاج و سریر لرزتے ہوں؛ اقبال جس فقر کی تعلیم دیتے ہیں وہ یہی ہے اور یہ فقر اقبال کے ذہن و دماغ کی اپج نہیں ہے اس کے بارے میں وہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ یہ متاعِ مصطفیٰ ہے اور مسلمان کی حیثیت اس کے امین اور نگہبان کی ہے، جب تک اس کی امانت میں دیانت کار فرما رہے گی، دنیا کی کوئی طاقت اس کی حریف نہیں بن سکتی اور جس دن یہ بات نہ رہی، وہ ضعیف اور بے مایہ ہو کر رہ جائے گا :

"فقر مصطفوی سے متصف ہونے کے بعد انسان کیا بن جاتا ہے ؟

قلب او را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطاں نعرۂ او لاملوک"

فقر مصطفوی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے :

حکمت دیں ـــــــ دل نوازی ہائے فقر
قوت دیں ـــــــ بے نیازی ہائے فقر

---

(۵۸)

مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں

○

دُوسرے ادیان و مذاہب کے برعکس اسلام دینِ جہات نہیں ہے یعنی وُہ پابند مقام نہیں ہے نہ وہ کسی خاص قوم سے متعلق ہے نہ کسی خاص سرزمین سے اس کی وابستگی ہے وہ ایک آفاقی مذہب ہے وُہ ساری دُنیا کا مذہب ہے دنیا کا ہر فرد لا اور اِلا کا رمز آشنا ہونے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمام روئے زمین میری مسجد ہے۔"

ارشادِ نبوی میں یہی حقیقت جلوہ گر نظر آرہی ہے کہ اسلام قیدِ مقام سے آزاد ہے، یہ بھولا ہوا سبق اقبال مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں:

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں

مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں

جس نبی نے اپنی امت کو یہ سبق دے کر ساری دُنیا کو اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا آج اس کی حالت یہ ہے کہ وُہ خوار و رسوا ہے، محکوم اور غلام ہے، نہ اپنی خودی کی حفاظت کر سکتی ہے نہ اپنے دین کی، نہ مسجد کی۔ پھر اس حالِ زار پر توجہ دلاتے ہوئے وہ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہیں اور کتنے دل دوز انداز میں کہتے ہیں:

الاماں! از گردشِ ایں آسماں

مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

اور پھر غیرت دلاتے ہیں:

وائے آں شاہیں کہ شاہینی نہ کرد — مرغکے از چنگ او نالد بہ درد

در کنشے ماند و زار و سرنگوں — پر نہ زد اندر فضائے نیل گوں

(۴۹)

فقرِ عُریاں

فقر کا ذکر جب اقبال کی زبان پر آتا ہے تو ان کا ذوق و شوق اور وجد و حال دید کے قابل ہوتا ہے فقر کی کارفرمائیوں کی داستان، وہ ایسے ولولہ انگیز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ فقر فقر نہیں رہتا، شاہی اور سلطانی بن جاتا ہے :

فقرِ عُریاں کی تعریف کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں :

فقر چوں عُریاں شود زیرِ سپہر
از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر

فقرِ عُریاں گرمیِ بدر و حنین
فقرِ عُریاں بانگِ تکبیرِ حسینؑ

فقر کی اس تعریف و توصیف کے بعد وہ مسلمانوں کے حالِ زار پر آنسو بہاتے ہیں :

وائے ما اے وائے این دیرِ کہن
تیغِ لا در کف نہ تو داری نہ من

دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جواں
این جہانِ کہنہ در باز اے جواں

"تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن؟
اے مسلماں مردن است ایں زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را
جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

حاصلِ کلام

بر حیارِ مصطفیٰؐ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند"

---

(۴۷)

مالِ صالح

جس قوم کی معیشت کا انحصار، لوٹ کھسوٹ اور استحصال بالجبر پر ہو، جو سود لیتی ہو، جو اپنے نفع کے لیے دُوسروں کا نقصان گوارا کرتی ہو، جو خود دولت مند بننے کے لیے دُوسروں کو مفلس اور قلاش بنا دیتی ہو، جو عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے کے لیے دوسروں کے گھر اجاڑ دیتی ہو، جو اپنی جیب بھرنے کے لیے دوسروں کی تجوریاں خالی کر دیتی ہو، جو حصولِ زر کو مقصدِ حیات سمجھتی ہو، جس کے نزدیک، دولت زندگی کی اساس و بنیاد ہو:

وُہ قوم آج ڈوبے گی، اگر کل نہ ڈوبی

ایسی قوم کبھی پنپ نہیں سکتی، کبھی زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتی، یہ دوسری بات ہے کہ عارضی اور وقتی طور پر وہ کامیاب نظر آتے اور اس کی فرماں روائی اور سلطانی کا ڈنکا بجنے لگے، دنیا میں ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور قیامت تک یہی ہوتا رہے گا، قانونِ قدرت یہی ہے اور جو قانونِ قدرت سے ٹکراتا ہے، وہ اپنا سر آپ پھوڑ لیتا ہے لیکن اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا:

اسلام نے سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیا ہے اور اپنے نظام کی معیشت کو جس چیز پر استوار کیا ہے وُہ دو چیزیں ہیں:

(۱) مالِ صالح (۲) اکلِ حلال

- مالِ صالح سے مراد یہ ہے کہ دولت کسی ایسے ذریعے سے جمع نہ کی گئی ہو جو ناجائز ہو اور اس کا مصرف بھی کوئی ایسا نہ ہو جو شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ نہ ہو:
- اکلِ حلال سے مراد یہ ہے کہ مسلمان فاقے سے مر جائے لیکن ایسی دولت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے جو غیر اسلامی اور غیر شرعی ذرائع سے حاصل ہوتی ہو:

غور کیجئے تو یہ اتنا اچھا نظامِ معیشت ہے کہ اگر دیانت و صداقت کے ساتھ اس اصول پر عمل ہو تو دُنیا کے سارے روگ آج اور ابھی دُور ہو سکتے ہیں، یہ پستی اور بلندی جو انسانی طبقوں میں نظر آ رہی ہے یکسر کافور ہو سکتی ہے، یہ غیر منصفانہ تقسیم دولت کی جو کشمکش ساری دُنیا میں دکھائی دیتی ہے اس کا وجود مٹ سکتا ہے سرمایہ اور مزدور، جاگیردار اور کاشت کار میں اندر ہی اندر جو تلخی اور ناگواری پیدا ہوتی نظر آ رہی ہے یہ خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہو سکتی ہے اور دُنیا ایک ایسے نظام سے آشنا ہو سکتی ہے جس کی بنیاد عدل اور انسانیت پر ہو:

اقبال کو ان موضوعات سے خاص دلچسپی ہے انہیں جب کوئی موقع ایسے موضوعات پر لب کشائی کا مل جاتا ہے تو پھر دل کی بات زبان پر آ ہی جاتی ہے، مولانا روم کا ایک شعر ان کی نظر سے گذرتا ہے:

مل را گر بہر دیں باشی حمول
نعم مالٌ صالحٌ گوید رسولؐ

اس شعر میں ارشادِ رسولؐ دیکھ کر اقبال کی فکر بلند نہ جانے کہاں کی خبر لاتی ہے وہ ایسی ایسی لطیف باتیں اتنے نازک پیرایۂ بیان میں کہتے ہیں کہ بس،

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

رومی کے اس شعر نے اقبال کے خیالات میں ہلچل پیدا کر دی، مدوجزر پیدا کر دیا، پھر ان کا دل قابو میں نہ رہا، انہوں نے جو کچھ سوچا اسے الفاظ کا جامہ پہنانے پر مجبور ہو گئے، چنانچہ فرماتے ہیں:

گر نہ داری، اندر حکمت این نظر
تو غلام و خواجہ توسیم و زر
از تہی دستاں کشاد امتاں
از چنیں منعم فساد امتاں

اور کیا یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت نہیں؟ کیا منعموں نے دُنیا کو فتنہ و فساد کے علاوہ بھی کچھ دیا ہے کیا تہی دستوں نے دنیا میں انقلاب عظیم کی بنیادیں مضبوط نہیں کیں؟

پھر نکتہ اکل حلال پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اے، یورپ زیں مقام آگاہ نیست

چشم او ینظر بنور اللہ نیست[1]

او نداند از حلال و از حرام
حکمتش خام است و کاوش ناتمام

فرنگ اور کا مگار یورپ کی خامکاری کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

آدمی اندر جہانِ خیر و شر
کم شناسد نفع خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوب کار چیست
جادۂ ہموار و ناہموار چیست

انسان کی زبوں حالی اور تہی مستی کی داستان سنانے کے بعد انتباہ سے کام لیتے ہیں :

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر
با نگاہے دیگرے او را نگر !

اور اس انتباہ کے بعد وہ حاصل کلام کی طرف اپنے مخاطب کو متوجہ کرتے ہیں :

حکمش از عدل است و تسلیم رضا است
بیخ او ، اندر ضمیر مصطفےٰ است

پھر بتاتے ہیں :

مصطفےٰ وا واز رضائے او خبر
نیست در احکام دیں چیزے دگر

تختِ جم پوشیدہ زیر بوریا است
فقر و شاہی از مقامات رضا است

---

[1] تلمیح ہے حدیث نبویؐ کی طرف جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے :

حکمِ سلطاں گیرد از حکمش مثال
روز میداں غیبت روز قیل و قال

اور جس حقیقت کی جڑیں ضمیرِ رسولؐ میں پیوست ہیں اس کی تعلیم و تلقین کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ اگر اپنی زندگی تم اس قالب میں ڈھال لو، اگر اپنے آپ کو سچا اور کھرا مسلمان بنا لو، اگر اپنے ضمیر میں اس حقیقت کو پیوست کر لو، اگر اپنے نفس کو اس سچائی کا تابع فرمان بنالو اگر اپنے فکر و خیال میں اس تعلیم کو بسا لو تو پھر دنیا میں تمہارا کوئی حریف نہیں ہو سکتا، پھر تمہاری کامرانی ایک ایسی حقیقت ہے جسے نہ جھٹلایا جا سکے گا نہ جس کی تردید کی جا سکے گی نہ جس پر شک و شبہ وارد کیا جا سکے گا نہ جس میں قیل و قال کی گنجائش ہوگی :

لہٰذا اے مسلمان :

از شریعت احسن التقویم شو
وارثِ ایمان ابراہیمؑ شو

---

(۴۹)

تمکر بے حد

○

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا ایک ایک واقعہ حکیم امت اقبال کی نظر میں ہے ہر واقعہ سے وہ ایک سبق لیتے ہیں اور اس سبق کی تلقین شروع کر دیتے ہیں، وہ جانتے ہیں، وہ واقعی اسلام کا پیام تھا جو ہلاکت قیصر و کسریٰ ثابت ہوا جس نے شہنشاہیت اور قیصریت کا خاتمہ کر دیا جس نے ایک جاہل اور ناتراشیدہ و ناخواندہ اور تہذیب و حضارت سے بعید قوم کو مالک تاج و افسر بنا دیا جس کے باعث یہ قوم دُنیا کے بڑے حصے پر حاکم اور فرماں روا کی حیثیت سے نمودار ہوئی اور اپنے دورِ حکومت میں اس نے دنیا کی جھولی گوہر مراد سے بھر دی، وہ جاہل تھا، اس نے علم دیا وہ ناتراشیدہ تھی، اس نے تعقل عطا کی، وہ تہذیب و حضارت کے مفہوم سے ناآشنا تھی اسے اس نے مہذب اور متمدن بنا دیا، وہ ایجاد تحقیق اور سائنس کے کمالات سے ناآشنا تھی، اس نے اسے موجد بنا دیا، خالق کر دیا، سائنس داں بنا دیا، ساری دنیا تاریک تھی اس نے اسے نور اور روشن کر دیا :

لیکن اب اس قوم، اس ملتِ عربیہ کا کیا حال ہے؟

وہ آپس کے اختلافات میں گرفتار ہے، وہ ستمار ننگ کی شکار ہے، وہ دوستوں کی دشمن اور دشمنوں کی دوست ہے وہ تعمیر سے ناآشنا اور تخریب کی دلدادہ ہے وہ باہمی انس و محبت سے ناواقف اور افتراق اور دوئی کی زنجیروں میں اسیر ہے :

یہ حال دیکھ کر اقبال کا دل کڑھتا ہے، وہ حال کے آنسو روتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی خون کے آنسو رلانا چاہتے ہیں، وہ انہیں غیرت دلاتے ہیں، بھولے ہوئے سبق یاد دلاتے ہیں، تاریخ ماضی کے ورق الٹتے ہیں تاکہ اپنی حقیقت و ماہیت سے، یہ قوم واقف ہو، پھر سے اپنے بجھے ہوئے دلوں میں امید اور

آرزو کی چنگاریاں پیدا کرے :

تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

فروغِ جاوداں بھی اقبالؔ کے نزدیک ایک مسلمان کی منزل ہے، اور جب تک وہ اس منزل سے نہیں گذر لیتا، وہ ناکام ہے :

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کے مجموعہ میں انہوں نے ملّتِ عربیہ کو مخاطب کیا ہے عنوان ہے "حرفے چند با اُمتِ عربیہ" اور اس خاصی طویل نظم میں انہوں نے جھنجھوڑنے اور عبرت دلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، نمونہ چند شعر آپ بھی پڑھ لیجئے :

اے درود شتِ تو باقی تا ابد
نعرہ لاقیصر و کسریٰ[1] کہ زد؟

در جہاں نزد و دور و دیر و زدر
اولیں خوانندۂ قرآں کہ بود!

رمزِ الا اللہ کرا آموختند؟
ایں چراغ اوّل کجا افروختند

علم و حکمت ریزۂ از خوانِ کیست؟
آیۂ فاصبحتم[2] اندر شانِ کیست؟

• [1] لاقیصر و لاکسریٰ : تلمیح ہے مشہور حدیث کی طرف هلك قيصر فلا قيصر بعده یعنی قیصریت ختم ہوگئی اب کوئی قیصر نہیں ابھرے گی :

• [2] فاصبحتم : تلمیح ہے آیتِ قرآنی کی طرف فاصبحتم بنعمته اخوانا یعنی خدا کے فضل و کرم سے باہمی افتراق کے بعد تم بھائی بھائی بن گئے :

یہ پیچیدہ سوالات کرنے کے بعد اقبال خود ہی جواب دیتے ہیں :

از دم سیراب آں امی لقب
لالہ است از ریگ صحرائے عرب

اور اب امی لقب کی نعمتیں اور برکتیں شمار کراتے ہیں :

حریت پروردۂ آغوش اوست
یعنی امروز امم از دوش اوست
او دلے در پیکر آدم نہاد
او نقاب از طلعت آدم کشاد
ہر خداوند کہن را او شکست
ہر کہن شاخ از نم او غنچہ بست

اور نبی امی کی ان برکتوں اور نعمتوں کا نتیجہ کیا نکلا ؟

تیغ ایوبی[1] ، نگاہ بایزید[2]
گنج ہائے ہر دو عالم را کلید
عقل و دل را مستی از یک جام مے
اختلاط ذکر و فکر روم[3] و رے[4]

- [1] سلطان صلاح الدین ایوبی جس نے جرمنی، آسٹریا، روس، انگلینڈ، روم وغیرہ کے فرماں رواؤں کی متحدہ یلغار کو فلسطین میں شکست فاش دی۔ [2] حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ، ملت اسلامیہ کے مشاہیر اولیاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے
- [3] روم مولانائے روم کا وطن   روم سے مراد اٹلی نہیں ، ترکیہ ہے :
- [4] رے ، امام فخر الدین رازی کا وطن :

علم و حکمت شرع و دیں نظمِ امور
اندرونِ سینہ ہا دل ناصبور
حسنِ عالم سوز الحمرا[1] و تاج[2]
آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج

اور یہ ساری کامرانیاں، یہ تیغِ ایوبی، یہ نگاہ بایزید، یہ گنج روم، یہ علم و حکمت کی غرو آرائیاں یہ شرع و دیں کا پائندہ اور محکم نظام، یہ نظمِ امور کا دلکش اور دل آویز حصار اور یہ الحمرا کا حسن عالم سوز، یہ تاج محل کا جمال و جلال کہ آسمان کے فرشتے بھی جس لازوال صنعت کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں —— یہ سب کرشمہ کس کا ہے !

اقبال جواب دیتے ہیں :

ایں ہمہ یک لحظہ از اوقاتِ اوست
یک تجلی از تجلیاتِ اوست

پھر بتاتے ہیں :

ظاہرش ایں جلوہ ہائے دل فروز
باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

یہ برکات و فضائل بیان کرنے کے بعد، خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر خفیف سے لفظی تغیر کے بعد اقبال کی زبان پر ترانۂ حمد بن کر آجاتا ہے :

---

[1] اسپین کے عرب فرماں رواؤں کا غیر فانی ادبی شاہکار
[2] روضۂ تاج آگرہ، جسے شاہجہاں نے تعمیر کرایا تھا۔

حمد بے حد مر رسولِ پاک را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را

اور نعت کے بعد پھر اپنی تمنا اور دعا کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :

حق ترا برّاں تر از شمشیر کرد
ساربان را راکبِ تقدیر کرد
بانگِ تکبیر و صلوات و حرب و ضرب
اندراں غوغا کشاد و شرق و غرب

---

(۵۰)

روح پاک مصطفیٰ آمد بہ درد

مسلمانوں کا حال زار دیکھ کر، اقبال کڑھتے ہیں، روتے ہیں، رلاتے ہیں، انہیں حیرت ہوتی ہے کہ سید عرب وعجم کی امت اس حال کو پہنچ جاتے اور اس حالت تک پہنچنے کی ذمہ داری نہ گردش آسماں پر ہے نہ قسمت پر، نہ حالات وحادثات پر، اس کی ذمہ داری جس پر عائد ہوتی ہے، وہ صرف امت مسلمہ ہے، اُسے کوئی دشمن شکست نہیں دے سکا لیکن خود اپنوں نے اس کی گردن بھی کاٹی، جیب ودامن بھی تار تار کیا اور مال و دولت بھی لوٹ لیا، ان اپنوں نے خدا سے اور خدا کے رسول سے غافل کر کے تہذیبِ فرنگ کے سامنے سر بسجود کر دیا، عصر حاضر کی یہ ہوش ربا اور زلزلہ فگن کارفرمائیاں ہرگز اتنی تند و تلخ نہ ہوتیں، اگر خود مسلمانوں نے انہیں دعوت نہ دی ہوتی، ان کا خیر مقدم نہ کیا ہوتا اور اپنی بے تدبیروں اور غفلت شعاریوں سے انہیں پھولنے پھلنے کا موقع نہ دیا ہوتا، لہٰذا یہ جو کچھ ہے کسی اور کا لایا ہوا نہیں، خود اپنا لایا ہوا ہے

کہ با من آنچہ کرد، آں آشنا کرد

اقبال اس چیز کو کتنے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں:

اتنے بودی امم گردیدۂ
بزم خود را خود ز ہم پوشیدۂ
ہر کہ از بند خودی وارستہ مرد
ہر کہ با بیگانگاں پیوستہ مرد

یہ تنبیہ کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

آنچہ تو با خویش کردی کس نہ کرد
روح پاک مصطفےٰ آمد بہ درد

کیا اس سے بڑا بھی طعنہ کوئی ہو سکتا ہے؟

---

(۵۱)

مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب

○

اقبال بیمار ہیں، بستر علالت پر دراز ہیں، علاج ہو رہا ہے لیکن مرض بڑھ رہا ہے تیماردار پریشان ہیں معالج امید دلاتے ہیں، مریض زندگی سے بے پروا اور موت سے بے نیاز ہے۔

اسی اثنا میں بھوپال کا سفر پیش آتا ہے۔ ایک روز خواب میں سر سید احمد خاں سے ملاقات ہوتی ہے وہ مشورہ دیتے ہیں کہ اپنی علالت کی فریاد رسالت مآبؐ کے حضور میں کیوں نہیں پیش کرتے، معاً اقبال کو یاد آجاتا ہے کہ مشہور قصیدہ بردہ کا مصنف "بوصیری" فالج کے مرض میں مبتلا تھا، اس نے بھی سرکار رسالتؐ میں اپنا استغاثہ پیش کیا تھا اور کامیاب ہوا تھا، مرض رفع ہو گیا اور وہ چنگا ہو گیا، اقبال سوچتے ہیں کیا میرے ساتھ بھی یہ نہیں ہو سکتا؟

آخر، وہ حضور رسالت مآبؐ میں جا پہنچتے ہیں اور اپنا حال عرض کرتے ہیں، شاید یہ اسی کی برکت تھی کہ جس جان لیوا مرض میں وہ مبتلا تھے، اس سے دو سال اور کچھ دن کے لیے انہیں نجات مل گئی:

آنحضرتؐ کو مخاطب کرتے ہیں، ذرا طرز تخاطب دیکھئے گا:

در جہان ذکر و فکر انس و جاں
تو صلوٰۃ صبح تو بانگ اذاں

اس کے بعد وہ اپنا ماجرا حضور رسالت مآبؐ میں پیش کرتے ہیں:

نے خدایا ساختیم از گاو خر
نے حضور کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیش معبودان پیر
نے طواف کوشک سلطان و میر

لیکن یہ جذبہ پیدا کس طرح ہوا؟

این ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

اے مقام و منزلِ ہر راہ رو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہ رو

پھر کتنے درد سے، لیکن کتنی سچی اور کھری بات کہتے ہیں:

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفےٰ نایاب و ارزاں بولہب

لیکن یہ صورتِ حال کیوں ہے؟

مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست
در دلش لاغالب الا اللہ نیست

گرد تو گردد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی!
کشتی و دریا و طوفانم توئی

آہوئے زار و زبون و ناتوان
کس بفتراکم نہ بست اندر جہان

اے پناہِ من حریمِ کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو

عرض حال کا سلسلہ جاری ہے :

آہ ازاں دردے کہ در جان و تن است
گوشۂ چشم تو داروئے من است
کار ایں بیمار نتواں برد پیش
من چو طفلاں نالم از داروئے خویش

عرض حال کرتے کرتے، اقبال کو بوصیری اور اس کا قصیدہ بردہ یاد آجاتا ہے۔ کہتے ہیں :

چوں بوصیری از تو می خواہم کشود
تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است
در خطا بخشی چو مہر مادر است

پھر کہتے ہیں :

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز
اے وجود تو جہاں را نوبہار
پرتو خود را دریغ از من مدار

مختلف پہلوؤں سے، مختلف طریقوں سے، نئے انداز و اسلوب سے وہ حضور رسالت مآبؐ میں اپنی دلگیری، تڑپ اور بیماریٔ روح کا ماجرا پیش کرتے ہیں، بار بار نگاہ التفات کی دریوزہ گری کرتے ہیں اور بار بار التجا کرتے ہیں : • من بامیدے رسیدم سوئے تو •
نئے نئے طرز و اسلوب سے ذات رسالت مآبؐ کو مخاطب کرتے ہیں، اپنے ذکر و فکر، علم و عمل، عقیدہ اور خیال کا جائزہ لیتے ہیں اور خود اپنے احتساب سے فارغ ہونے کے بعد عرض کرتے ہیں :

فکر من در ہنسہ وَیں چالاک دست
تخم کردارے، ز خاکِ من نہ رست

شاعروں کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ سچ کم کہتے ہیں، جھوٹ زیادہ بولتے ہیں اور خود اپنی ذات کے بارے میں جو سفید جھوٹ بولتے ہیں، اس کا نام بھی کتنا شاندار رکھا ہے..... تعلّی.......

ممکن ہے، شاعرانہ تعلّی اقبال میں بھی ہو، وہ بھی کبھی کبھی اپنے اشعار میں تعلّی یا خود پسندی سے کام لیتے ہوں، لیکن آج کی بات دُوسری ہے آج تو وہ حضور رسالت مآب میں موجود ہیں، یہاں جھوٹ نہیں بول سکتے، یہاں تعلّی سے کام نہیں لے سکتے، یہاں سخن سازی نہیں کر سکتے، یہاں سچ اور بالکل سچ کہتے پر مجبور ہیں اس لیے بغیر کسی جھجک اور تامل کے کہہ اُٹھتے ہیں:

تخم کردارے ز خاکِ من نہ رست

اس کے بعد عرض کرتے ہیں:

تیشہ اَم تیز تر گرداں کہ من !
محنتے دارم فزوں از کوہ کن

کتنے یقین اور اعتماد کے ساتھ اپنے بارے میں کہتے ہیں:

مومنم از خویشتن کافر نیَم
بر فسانم آں کہ بد گو ہر نیم
گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است
چیزکے دارم کہ نام او دل است

اے کہ وادی کرد را سوزِ عرب
بندۂ خود را حضورِ خود طلب

بندہ چوں لالہ داغے در جگر
دوستانش از غمِ او بے خبر

بندۂ اندر جہاں نالاں چوں نے
تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے
در بیاباں مثل چوب نیم سوز!
کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز

عرض و التجا کا افسانہ ختم اس شعر پر کرتے ہیں:

جاں ز مہجوری بنالد در بدن
نالۂ من، وائے من اے وائے من

---

(۵۲)

"ہم چُوں الوطن اُمِ گیتی نہ زاد!"

○

عشق ــــــــ اقبال کے نزدیک بس عشق ہی اصلِ حیات ہے یہی زندگی کا اصول ہے اس پر اگر کاروبارِ حیات قائم نہ ہو تو کچھ نہیں، عشق نہیں تو کچھ بھی نہیں اور عشق ہے تو سب کچھ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عشق کیا کس سے جائے؟ محبوب بنایا کسے جائے؟ کیا کسی پیکرِ خاکی کے آب و رنگ سے؟ اس کے رخسار و گو سے؟ اس کی صورت اور زیبائش سے؟ اس کی آواز دل رُبا سے؟ اس کے نغمۂ فردوس گوش سے، اس کے رقص دل نواز سے؟

اقبال کہتے ہیں، نہیں، فانی سے فانی کا عشق کیا؟ ناپائیدار سے ناپائیدار کی محبت کوئی معنی نہیں رکھتی یہ عشق نہیں، دھوکا ہے، فریبِ نفس ہے، فریبِ آرزو ہے آؤ، میں تمھیں بتاتا ہوں، تمھارے عشق کا محور اور مرکز کون ہو؟ سنو!

ہست معشوقے نہاں اندر دلت،
چشم اگر داری بیا بنمائمت

وُہ محبوب جس سے تجھے محبت کرنی چاہیئے، کہیں اور نہیں، تیرے گوشۂ قلب میں متمکن ہے، تو اگر اسے دیکھ نہیں سکتا تو میں دکھاتا ہوں:

عاشقاں او ز خوباں خوب تر
خوش تر و زیبا تر و محبوب تر

وُہ محبوب ایسا ہے کہ جس کا عشق محبت کرنے والوں کو خوبانِ جہاں سے خوب تر اور کہیں زیادہ خوش تر زیبا تر اور محبوب تر بنا دیتا ہے جس کے عشق میں یہ وصف ہو کر عاشق کو خوش تر، زیبا تر اور محبوب تر بنا دے، اس

محبوب کا پایہ کیا ہوگا؟

دل ز عشق او توانا مے شود
خاک ہم دوش ثریا مے شود

جس کا عشق دل میں ضعف پیدا نہیں کرتا تاب و تواں پیدا کرتا ہے جس کے عشق میں مبتلا ہو کر دل دل نہیں رہتا ایک بہت بڑی قوت بن جاتا ہے جس کے اثر سے ذرہ آفتاب بن جاتا ہے خاک ہم دوش ثریا ہو جاتی ہے عاشق رہتا زمین کی پستی پر ہے لیکن آسمان کی بلندیوں پر رہنے والے اس پر رشک کرنے لگتے ہیں :
تو جاننا چاہتا ہوں ، وہ کون محبوب ہے جس کے عشق میں یہ برکتیں اور نعمتیں پوشیدہ ہیں ؟ تو سن مرے

در دل مسلم مقام مصطفےٰ است
آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است

تیرے دل کی وہ ملکیت ، وہ تیرا محبوب محمد مصطفےٰ ہے ، اس سے محبت کر اور فانی سے جاودانی بن جا ذرّے سے آفتاب بن جا ، اب خاک ہے ، پھر ہم دوش ثریا بن جا :

طور ، موجے از غبار خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

جس کے گھر کا غبار ، کوہ طور سے بلندی مرتبت میں کہیں زیادہ ہے ، جس کے کاشانہ گھر بار کا یہ نتیجہ ہے کہ کعبہ بیت الحرم بن گیا ، موسیٰ نے ایک مرتبہ طور پر تجلی ناتمام دیکھی تھی ، مگر تاب نہ لا سکے دخو موسیٰ صعقا ، لیکن یہ کعبہ یہ بیت الحرم تو جلوۂ الٰہی کا مہبط و مرکز ہے ، کون سا وقت ہے جب یہاں تجلیاں نہیں برستیں ، نور نہیں ابلتا ، جلوۂ حقیقی نہیں دکھائی دیتا ؟

کمتر از آنے ز اوقاتش ابد
کاسب افزائش از ذاتش ابد

یہ وہ محبوب ہے جس کی سلطانی جس طرح بحر و بر پر ہے ــــــــ کوہ و دمن پر ہے ، بلند و پست پر ہے اسی طرح زمان و مکان پر بھی ہے ؛ یہ ابد جسے تم ہمیشگی سمجھتے ہو جس کی نہ ابتدا معلوم ہے نہ انتہا جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام ہو نہ شروع ہوا ہے ، نہ ختم ہوگا جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا یہ ابد اوقات مصطفےٰ کے ایک لمحہ سے بھی کم تر ہے ، بلکہ ابد کو جو مرتبہ حاصل ہوا ہے وہ بھی اسی ذات گرامی کے باعث :

بوریا ممنونِ خواب راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

جس کی سادگی اور خاکساری کی یہ کیفیت تھی کہ ٹاٹ کا بستر بنا کر اس پر سوتا تھا لیکن جس کی نگاہ کیمیا اثر کا یہ عالم تھا کہ اس کی اُمّت نے قیصر و کسریٰ کا تاجِ خسروی اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا :

جو قیصر و کسریٰ سے زیادہ شاندار زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن فقر کو امارت پر ترجیح دیتا تھا جس کی اُمّت نے بڑی بڑی مہذب و متمدن اور جنگی ساز و سامان سے لیس قوموں کو شکست فاش دی اور ان کے نظامِ حیات کا خاتمہ کر کے، نظامِ اسلام قائم کر دیا :

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

جو اُمّی مطلق تھا، نہ لکھ سکتا تھا، نہ پڑھ سکتا تھا جس کے علم میں نہ اقوامِ ماضی کی تاریخ تھی، نہ پچھلی قوموں کے کارنامے۔ لیکن جس نے غارِ حرا کی خلوت گزینی میں اپنے رب سے رابطہ پیدا کیا، منصبِ نبوت پر فائز ہوا، وہاں سے نکل کر دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ اس دعوت کی مخالفت ہوئی اس پیام کو رد کیا گیا، اس تبلیغ کو ناکام بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا لیکن وہ ان سب پر غالب آیا اور بہت ہی مختصر مدت میں نہ صرف ایک نئی، شاندار اور باوقار قوم کی تخلیق کی، بلکہ دنیا کو ایک ایسا نظامِ مملکت بھی عطا فرمایا جو آج چودہ برس گذر جانے کے بعد بھی، دنیا کی شہنشاہیت، آمریت، جمہوریت، جماعیت سے اور ان کے قائم کئے ہوئے نظاموں سے کہیں زیادہ بہتر اور برتر ہے، ان کے اور اس کے نظام میں وہی فرق ہے جو مخلوق اور خالق کے فہم و ادراک میں ہو سکتا ہے :

ماند شب ہا چشمِ او محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم

وُہ ــــــ جس کی اُمّت تختِ شہریاری پر چین کی نیند سوتی تھی، جو خود رات رات بھر جاگتا اور مصروفِ عبادت رہتا تھا، جس کی شب بیداری اس لیے تھی کہ خدا اس کی اُمّت پر مہربان ہو اور اسے مرتبۂ بلند پر فائز کرے اور اس کی اُمّت "خیرِ اُمّت" بن کر اس طرح جلوہ گر ہوئی کہ اس نے جو نظامِ حکومت قائم کیا، وہ اتنا محکم اور مستحکم تھا کہ بغیر کسی غل و غش کے کاروبارِ حکمرانی انجام دیتی رہی :

وقتِ ہیجا تیغ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز

میدانِ جنگ میں جس کی شمشیرِ خارا شگاف فولاد و آہن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھی لیکن جس کا یہ عالم تھا کہ نماز میں رقتِ قلب کے باعث اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوئے رواں ہو جاتا تھا۔ ہاں! اس کی تلوار آہن گداز تھی، اس لیے کہ وہ باطل سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا تھا، ناحق کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا کفر سے مداہنت نہیں برت سکتا تھا لیکن ہوا تنا رقیق القلب بھی تھا کہ کسی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا، کسی کا دل نہیں دکھا سکتا تھا، کسی کا سوال رد نہیں کر سکتا تھا

در دُعائے نصرت آمین تیغ او
قاطع نسل سلاطیں ۔۔۔ تیغ او

وہ حق پر تھا، حق کے لیے لڑتا تھا، لہٰذا دشمن کے مقابلہ میں اپنے ربّ اور مولا سے جب وہ فتح و نصرت کی دُعا مانگتا تھا، تو اس کی تلوار آمین کا کام دیتی تھی: (اس کی تلوار نے نسلِ ملوک و سلاطین کا خاتمہ کر دیا)

اس نے جب اپنی دعوت کا سلسلہ شروع کیا تو یہ وہ زمانہ تھا جب دُنیا ملوکیت اور بادشاہت کے دام میں اسیر تھی، بادشاہ خدائی کرتے تھے، انہیں اپنی رعایا پر وہی حقوق حاصل تھے جو شیر کو بکریوں پر حاصل ہیں جس کی چاہیں آبرو لوٹ لیں جسے چاہیں قتل کر دیں، جس کا چاہیں گھر لوٹ لیں جس سے خوش ہوں اُسے دولت کونین بخش دیں، جس سے خفا ہوں، اُسے گدائے بے نوا بنا دیں روپیہ رعایا سے وصول کریں اور اس روپیہ سے رعایا کو کھلائیں پلائیں کریں ملا اسے اپنے عیش و عشرت پر خرچ کریں، نہ محاسبہ کا اندیشہ۔ نہ بازپرس کی پروا اور لوگ اس تیصریت اور بادشاہت کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ اُسے حکم امرِ الٰہی سمجھنے لگے تھے ان کا خیال تھا، بادشاہ دُنیا میں خدا کا نائب ہوتا ہے وہ سایۂ الٰہی ہوتا ہے اس سے بغاوت کرنا، سرکشی کرنا، اس کے خلاف خروج کرنا، داخلِ معصیت ہے:

اس فضا میں اسلام کے داعی نے دُنیا کو جو نظام بخشا، وہ بادشاہت سے یکسر صرفی تھا، اس میں کسی بادشاہ کسی سلطان کی گنجائش نہ تھی، سارے اختیارات جمہوریت اور عوام کو حاصل تھے، سربراہ مملکت کا عزل و نصب سب کچھ انہی کے اختیار میں تھا ۔۔۔۔۔ اور یہی نہیں:

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

اس نے دُنیا پر بڑے بڑے احسانات کیے، آئینِ پارینہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے نئے آئین کر

نافذکیا، اس نئے آئین میں دُنیا کے تمام دکھوں کا علاج موجود تھا، دُنیا کا پُرانا نظام غلامی کو جائز قرار دیتا تھا، بادشاہت اور قیصریت کا باج گذار تھا، عورت کو جائداد منقولہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا تھا، زناکاری کوئی بُرا کام نہ تھا، لوٹ مار اور قتل و غارت ایک دلچسپ مشغلہ تھا، ترکہ اور وراثہ کی تقسیم تمام تر ناانصافی پر مبنی تھی، عدل و انصاف کی جگہ سفارش اور رسوخ نے لے لی تھی، ذات پات، نسل و رنگ، خاندان اور قبیلہ کے نام سے سر بفلک اور ناقابل تسخیر دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں، اونچ نیچ کا امتیاز موجود تھا، قوم اور وطن کے تعصب نے دُنیا کے امن و امان کو تباہ و برباد کر دیا تھا:

لیکن اسلام کے نظام نے یہ تمام دیواریں گرا دیں، اس نے غلامی ختم کر دی، بادشاہت کا نام و نشان مٹا دیا، اونچ نیچ کا امتیاز دور کر دیا اور سربلندی کا معیار صرف "تقویٰ" قرار دیا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ رنگ و نسل، خاندان اور قبیلہ، قوم اور وطن کی حد بندیاں اس نے توڑ دیں، اور انسان کو ایک اسٹیج پر کھڑا کر دیا یہ تھا وہ نظام تو جو امی لقب نے دُنیا کو عطا فرمایا تھا:

از کلید دیں درِ دُنیا کشاد
ہمچو او بطنِ امِ گیتی نہ زاد

اب تک دُنیا کا دستور یہ تھا دُنیا الگ تھی دین الگ، دین اور دُنیا میں کوئی رابطہ نہ تھا "قیصر" اپنا حق لیتا اور کلیسا اپنا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں ابتری پیدا ہو گئی، دین سے بیگانگی نے دُنیا والوں کو خود سر سفاک اور تمام ضعف اور فاسق و فاجر بنا دیا، دُنیا سے بیگانگی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دین والے ایک چوب خشک بن کر رہ گئے:

داعیٔ اسلام علیہ السلام نے دین کی کنجی سے دُنیا کا دروازہ کھولا اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ امور سلطنت کے ذاتی اور قومی، خاندانی اور حکومتی معاملات و مسائل میں خوف الٰہی پیدا ہو گیا، خدا کی بالادستی قائم ہو گئی، عدل و انصاف کا سکہ چلنے لگا، خیانت اور مکر و فریب کا دروازہ بند ہو گیا:

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست

اس نے بلند و پست کا امتیاز مٹا دیا، انسان کو انسان کی سطح پر رکھا اور بہ حیثیت انسان کے ہر قسم کی تفریق ختم کر کے وحدت پیدا کر دی:

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز

قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
تیری سرکار میں پہنچے تو سب ہی ایک ہوئے
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

یہ مساوات ـــــ انسانیت پر آپ کا سب سے بڑا احسان ہے، آپ کے وجود باجود سے پہلے دنیا اس کے تصور تک سے ناآشنا تھی :

اور اس :

"در نگاہِ او یکے بالا و پست"

کا نتیجہ یہ ہوا کہ دُنیا سے رسم غلامی مٹ گئی اور اسلام کے غلاموں نے وہ مقام بلند حاصل کیا جس پر ملوک و سلاطین بھی رشک کر سکتے ہیں جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی یہ غلام تھے جو صرف ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا ہی نہیں کھاتے تھے بلکہ ان کے ہاتھ میں فوج کی سپہ سالاری تھی، قوموں کی امامت تھی، ملکوں کا انتظام تھا ان کے قبضہ میں تختِ شہریاری تھا، تاج و خسروی تھا، ان کے اختیار میں وہ سب کچھ تھا جو کسی عالی نسب والا حسب فرماں روا کے ہاتھ میں ہو سکتا ہے، کیا یہ داعی اسلام کا کھلا معجزہ نہیں ہے؟

اُردو اور فارسی کی تمام نعتیں اُٹھا کر دیکھ لیجئے کیا ان میں سے کسی میں بھی آنحضرتؐ کا یہ سراپا موجود ہے؟ کیا اقبالؒ اپنی نعت گوئی کے فن کا موجد اور خاتم نہیں ہے؟

---

(۵۴)

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است

○

رحمۃ للعالمینؐ کے دامن رحمت میں پناہ گزیں ہونے کے لیے اور اس رحمت عام سے ملتِ مسلمہ کو بہرہ ور کرنے کے لیے، اقبال آپ کی عنان توجہ اپنی طرف اور اپنی قوم کی طرف مبذول کراتے ہیں:

در مصافے پیش آں گردوں سریر
دخترِ سردارِ طے آمد اسیر

ایک جنگ کے بعد سرکار رسالت پناہؐ کے حضور قبیلہ طے کے سردار کی لڑکی اسیر جنگ کی حیثیت سے پیش ہوئی:

پائے در زنجیر ہم بے پردہ بود
گردن از شرم و حیا خم کردہ بود

حالت یہ تھی کہ اس کے پاؤں بستہ زنجیر تھے، پردہ نہ دار نہ تھا اور شرم و حیا سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی:

دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید
چادرِ خود پیش روئے او کشید

آپؐ نے اسے بے پردہ لیکن شرم و حیا سے گردن جھکائے ہوئے دیکھا تو رحم آگیا اور اپنی چادر مبارک آپؐ نے اسے پیش کر دی، یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اقبال کہتے ہیں اور کس انداز میں کہتے ہیں:

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیش اقوامِ جہاں بے چادریم

اور ہماری حالت یہ ہے کہ طلے کی اس عورت سے زیادہ عریاں اور بے چادر ہو رہے ہیں اقوام عالم کے سامنے ہم عریاں ہیں بے چادر ہیں، رسوا ہیں، ذلیل و خوار ہیں :

بروزِ محشر اعتبارِ ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

لیکن نہیں :

میدانِ حشر میں بھی ہمارا مایۂ اعتبار آپ کی ذاتِ گرامی ہے اور اس عریانی میں بھی ہمارا پردہ دار آپ کا وجودِ گرامی ہے :

لطف و قہرِ او سراپا رحمتے
آں بیاراں، ایں باعدا رحمتے

آپ کا لطف بھی رحمت ہے اور قہر بھی سراپا رحمت ہے وہ دوستوں پر، یہ ——— دشمنوں پر

آں کہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
مکہ را پیغامِ لاتثریب داد

آپ کی رحمت و رافت کا یہ عالم تھا کہ فتح مکہ کے بعد جب آپ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے اور وہ لوگ جنہوں نے مسلسل تیرہ سال تک آپ کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا جنہوں نے طے کر لیا تھا کہ اسلام کو مٹا دیں گے مسلمانوں کو زندہ نہیں رہنے دیں گے اور داعیٔ اسلام کو ہدفِ اذیت بنائیں گے، آج شکست خوردہ حالت میں پیکرِ یاس و حرماں بنے کھڑے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ سزا ملے گی اور ہو بھی کہ ہلکی سزا آئینِ جنگ کی رو سے انہیں مل سکتی تھی وہ صرف سزائے قتل تھی، یہ جنگی اصول پہلے بھی رائج تھا اور آج بھی رائج ہے :

لیکن آپ نے ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا :

لا تثریب علیکم الیوم، فاذھبوا انتم الطلقاء

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے، جاؤ، تم سب آزاد ہو،

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم

آپؐ کی تعلیمات کا اثر یہ ہے کہ ہم مسلمان قید وطن سے بیگانہ ہیں، ہماری قومیت کی بنیاد وطن پر نہیں مذہب پر ہے، ہم کہیں کے ہوں، اگر مسلمان ہیں تو ایک ہیں، جیسے نگاہ کہ یہ دونوں آنکھوں کو نور پہنچاتی ہے لیکن ہے ایک :

از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنم یک صبح خندانیم ما

یوں تو ہم حجازی بھی ہیں چینی بھی ہیں اور ایرانی بھی، لیکن ہیں ایک صبح خنداں کے قطرات شبنم "قطرہ" کی حیثیت سے گو ہم انفرادیت رکھتے ہیں، لیکن اجتماعی طور پر ہم ایک ہی ہیں :

مست چشم ساقی بطحاستیم
در جہاں مثل مے و میناستیم

ہم سب ساقیٔ بطحا کی نگاہ دل نواز کے اسیر ہیں، دُنیا میں ہماری مثال، مے جو شراب اور بوتل کی

امتیازات نسب را پاک سوخت
آتش او این خس و خاشاک سوخت

دُنیا ذات پات، حسب نسب، خاندان اور قبیلہ کے امتیازات میں جکڑی ہوئی تھی، آپؐ نے اسے اس مصیبت سے نجات دی، وہ تمام امتیازات جن کی بنیاد احساس ذات اور نسب ہو آپؐ نے ختم کر دیئے اور آپؐ کے اشارات و تعلیمات کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جس طرح سیلاب خس و خاشاک کو بہالے جاتا ہے اسی طرح یہ، امتیازات باطل ہو گئے :

چوں گل صد برگ ما را بو یکے است
اوست جان این نظام و او یکے است

"گل صد برگ" میں سینکڑوں، ہزاروں پتیاں ہوتی ہیں لیکن کیا ان کی بو بھی مختلف ہوتی ہے، اسی طرح گو ہماری زبان جُدا ہو، وطن الگ ہو، قومیت میں دوئی ہو، وطن میں اختلاف ہو لیکن ہم سب ہی ایک ملی قوم، ملت اور جمعیت کی روح رواں آپؐ کی ذات گرامی ہے اور وہ ایک ہے، لہٰذا ہم بھی ایک ہیں :

سر مکنون دل او ما بدیم ــــــ .
نعرہ بیباکانہ زد افشا شدیم ــــــ .

ہم مسلمان قلب محمدؐ کا "سرِ مکنون" ہیں جب آپؐ نے نعرۂ بیباکانہ ــــ لا الٰہ الا اللہ ــــ لگایا تو ملتِ اسلامیہ نمودار ہوگئی :

"نعت" کی یہ ترانہ سنجی کرنے کے بعد اقبال اپنے عشقِ رسولؐ کا اظہار کرتے ہیں :

شورِ عشقش در نے خاموشِ من
می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
من چہ گویم از تولائش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست

اور یہ کہتے کہتے پھر امتِ مسلمہ یاد آجاتی ہے :

ہستیِ مسلم تجلی گاہ او
طور ہا بالد ز گردِ راہِ او!

پھر اپنا ذکر شروع کر دیتے ہیں :

پیکرم را آفرید آئینہ اش
صبحِ من از آفتابِ سینہ اش
در تپیدن دم بدم آرامِ من
گرم تر از صبحِ محشر شامِ من
ابرِ آذار است و من بستانِ او
تاکِ من نمناک از بارانِ او
چشم در کشتِ محبت کاشتم
از تماشا حاصلے برداشتم

اس عشقِ رسولؐ کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ اقبال قلبِ مسلمان کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے :

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

چند الفاظ ہیں، لیکن دل سے نکلے ہوئے جذبات سے معمور
اور پھر اس بیان کو جامی کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں، شعر جامی کا ہے لیکن کائنات کے دل کی

آواز ہے:

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

---

(۵۹)

تا کمندِ تو شود یزداں شکار

آنحضرتؐ کا سراپا، آپؐ کے کارنامے، آپؐ کی ذات و صفات کے بیان کے بعد، اقبال اب دوسرا نغمہ چھیڑتے ہیں اور یہ نغمہ نتیجہ ہے ان کی نعت سرائی کا۔ اقبال کی نگاہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں سب سے بڑے اور برگزیدہ انسان ہیں، انبیائے الٰہی میں اپنی دعوت اور پیام کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب پر فائق ہے انہوں نے مختصر ترین مدت میں جو قوم تیار کر دی، وہ دنیا میں پہلی اور آخری مثال ہے انہوں نے اپنی سیرت کردار، اخلاق اور سلوک و مروت کا جو نمونہ، بہ حیثیت انسان کے بہ حیثیت نبی کے، اور بحیثیت دوست کے، بحیثیت شوہر کے، بحیثیت آقا کے بحیثیت حکمراں کے، دُنیا کے سامنے پیش فرمایا وہ آج بھی سرمۂ صاحب نظراں ہے اور قیامت تک رہے گا اسلام کے بد ترین نکتہ چیں اور بد ترین دشمن بھی اُسے تسلیم کرتے ہیں کہ اس کرہ ارض پر، اس چرخ نیلی فام کے نیچے صرف ایک ہی انسان کامل پیدا ہوا ہے اور وہ محمدؐ ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

یہی وجہ ہے کہ اقبال خود بھی عشق رسولؐ سے سرشار ہیں اور دُنیا کے ہر شخص کو، عام اس سے کہ وہ مسلمان ہو یا نہ ہو لیکن فہم و خرد کا حامل ہو، یہی دعوت دیتے ہیں اور عشق بغیر تقلید کے ممکن نہیں ہے تو تا وقتیکہ عشق ہی کیا جس میں خود داری جو تکبر ہو، سرکشی ہو، انانیت ہو، عشق تو نام ہی ہے کامل سپردگی کا یا دوست کے لیے سب کچھ چھوڑ دو اور اگر یہ نہیں کر سکتے، تو بقول سرمد کے دوست سے قطع نظر کر لو:

یا قطع نظر ز دوست می باید کرد

اقبال کا یہی پیام ہے چنانچہ نعت کی ترانہ سنجی کے بعد وہ فرماتے ہیں:

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق

هست هم تقلید از اسمائے عشق

پھر تقلید کی کیفیت بتاتے ہیں کہ وہ کیسی ہونی چاہیئے؟

کامل بسطام در تقلید فرد
اجتناب از خوردن خربوزه کرد

پھر بتاتے ہیں کہ عاشق کیا ہوتا ہے؟ اس کا رنگ کیا ہوتا ہے؟

عاشقی؟ — محکم شو از تقلید یار
تا کمند تو شود یزداں شکار

بتاتے ہیں تقلید دوست کا نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان یزداں شکار بن جاتا ہے، پھر فرماتے ہیں:

اندکے اندر حرائے دل نشیں
ترک خود کن، سوئے حق ہجرت گزیں

محکم از حق شو، سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سر شکن!

یہ بتانے کے بعد وہ مسلم خستہ جاں میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا جذبہ، ایک نیا سودا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اُسے عشق کی برکت اور نعمت کا راز داں بناتے ہیں اور عشق کی کامرانی اور سربلندی سے بہرہ ور کرنے کے بعد تلقین کرتے ہیں:

لشکرے پیدا کن از سلطان عشق
جلوہ گر شو بر سر فاران عشق

---

۱ حضرت بایزید بسطامیؒ
۲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اور اگر اے مسلمان تو نے یہ سب کچھ کر لیا، اپنے آپ کو رسُول کا عاشق صادق ثابت کر دیا تو پھر خدا اپنے اس وعدہ کو پورا کرے گا جو خلافتِ ارض کے سلسلہ میں تجھ سے کر چکا ہے :

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرحِ انی جاعلٌ سازد ترا

(۵۵)

معجزہ شق القمر

○

ہر بات، ہر واقعہ، ہر چیز سے اقبال ایک نیا سبق لیتے ہیں، ایک نیا نتیجہ نکلتے ہیں، ایک نئی راہ قائم کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ شق القمر، اپنی ضروری تفصیلات کے ساتھ حدیث و سیر کی کتابوں میں مرقوم ہے، عام طور پر بس یہ ایک معجزہ سمجھا جاتا ہے لیکن اقبال صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ یہ ایک معجزہ تھا، نہ ایک عام نعت گو کی طرح اس پہ قناعت کرتے ہیں کہ اس معجزہ کو سامنے رکھ کر ایک پر زور اور پر شکوہ قصیدہ لکھ دیں، وہ سوچتے ہیں، ہاں، یہ معجزہ واقع ہوا لیکن کیوں اور کیسے؟ اور پھر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ نتیجہ تھا استحکام خودی کا اور اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ان کی چشم تصور دیکھتی ہے کہ سرکار دو عالم کے غلاموں میں سے بھی جس نے اپنی خودی کو مستحکم کر لیا وہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اس روشنی میں اقبال اپنی قوم کو درس خودی دیتے ہیں

اسے مشورہ دیتے ہیں کہ جس زندگی کو اپنا شعار بنا لیا ہے اسے ترک کر دے خواجۂ دو جہاں اور آپ کے خلفائے خاص کی تقلید کرے اور خودی کی تکمیل و استحکام کو اپنی زندگی کا شعار بنا لے چنانچہ فرماتے ہیں:

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرماں دہ عالم شود

خودی محبت عشق ہی سے مستحکم ہوتی ہے اور جب یہ مستحکم ہو جاتی ہے تو اس کی قوت فرماں روائے عالم بن جاتی ہے اور صرف یہی نہیں:

پیر گردوں کز کواکب نقش بست
غنچہ ہا از شاخسار او شکست

(۵۶)

از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو!

○

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "خودی" پیدا کس طرح ہوتی ہے؟ اس کی تربیت کس طرح کی جاتی ہے؟ اُسے بلند اور محکم کرنے کی تدبیر کیا ہے؟ اقبال اس کا جواب دیتے ہیں کہ تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں

۱۔ مرحلہ اوّل، طاعت

۲۔ مرحلہ دوم، ضبطِ نفس

۳۔ مرحلہ سوم نیابتِ الٰہی

طاعت اور ضبطِ نفس کے مرحلوں سے گذر جانے کے بعد تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی کا بڑی آسانی سے طے ہو جاتا ہے:

سب سے زیادہ زور اقبال جس چیز پر تربیتِ خودی کے سلسلہ میں دیتے ہیں، وہ ہے طاعت اس سلسلہ میں اونٹ کی مثال پیش کرتے ہیں:

خدمت و محنت شعار اشتر است
صبر و استقلال کار اشتر است
نقش پایش قسمتِ ہر بیشہ،
کم خور و کم خواب و محنت پیشہ
سر خود از کیفیتِ رفتارِ خویش
در سفر صابر تر از اسوار خویش

اونٹ کے ان خصائص کو بیان کرنے کے بعد، وہ مردِ مومن سے کہتے ہیں کہ تو بھی اسی طرح سراپا

عمل بن جا، عمل کر اور زبان نہ چلا، کام کرتا رہ اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دے، اصول و آئین محمدؐ کی پیروی کر اور سختیٔ آئین کا گلہ نہ کر، تو اپنی خودی کی تربیت اسی طرح کر سکتا ہے:

تو ہم از بارِ فرائض سر متاب
برخوری از عندہٗ حسن المآب

یہ تلقین کرنے کے بعد فرماتے ہیں، اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہر کہ تسخیرِ مہ و پروین کند
خویش را زنجیریِ آئین کند

اور پھر بڑے شاعرانہ، اور دل فریب و دل ربا انداز میں سمجھاتے ہیں:

باد را زندانِ گل خوشبو کند
قیدِ بو را نافۂ آہو کند

دُنیا کی کوئی چیز بھی آئینِ الٰہی سے سرتابی نہیں کر سکتی، نہ یہ چاند، نہ یہ سورج، نہ یہ ستارے نہ یہ زمین، نہ آسمان، نہ شجر و حجر،

می زند اختر سوئے منزل قدم
پیشِ آئینے سرِ تسلیم خم

اور ان ستاروں ہی پر کیا منحصر ہے؟

سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است
پایمال از ترکِ آں گردیدہ است

لالہ پیہم سوختن قانونِ او
بر جہد اندر رگِ او خونِ او

دُنیا کی جس چیز پر نظر ڈالو، خواہ وہ جاندار ہو، یا بے جان، خواہ وہ بے زبان ہو، یا صاحبِ نطق وکلام، صرف اسی اصول پر زندہ ہے، آئین کی پابندی ہی وہ اصول ہے جو زندگی کو قائم رکھتا ہے اور زندگی میں شکوہ و شوکت پیدا کرتا ہے:

فرماتے ہیں، قطرہ سے بڑھ کر بے ثبات اور بے حقیقت چیز کیا ہو گی، چشم زدن میں عالمِ وجود میں آئی اور چشم زدن میں خشک ہو گئی، لیکن یاد رکھو:

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل
ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل

صحرا، آئینِ وصل سے بیگانہ ہو جائے تو یہ ذرے ہواؤں میں اڑتے پھریں گے، قطرے آئینِ وصل کو فراموش کر دیں تو چشم زدن میں اپنے وجود سے محروم ہو جائیں گے۔

اور پھر مردِ مسلمان کو ان ساری مثالوں سے روشناس کرانے کے بعد، ہدایت کرتے ہیں:

شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو

---

(۵۷)

لی مع اللہ وقت

○

"وقت" ــــــــــ یہ بڑا اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے، قدیم وجدید فلاسفہ نے اس کی بزرگی اور پیچیدگی میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے، خود اقبال نے بھی، زندگی بھر اپنی فکر سب سے زیادہ جس مسئلہ کو اہمیت دی، وہ یہی تھا، علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اور وقت کے دوسرے مشائخ اور علماء سے اس مبحث پر برابر خط وکتابت کرتے رہے، خود کوئی پرانی کتاب لی ڈالے تو بہت پڑھا اور جو شکوک پیدا ہوئے انہیں حل کرنے کی کوشش کی، اقبال نے نثر میں بہت کم لکھا ہے لیکن انگریزی میں انہوں نے جو خطبات مدراس" لکھے ہیں وہ فنی اعتبار سے بڑے بلند پایہ مانے گئے ہیں، یورپ کے ارباب فکر نے بھی کھول کر ان کی داد دی ہے، ان خطبات میں بھی اقبال نے "وقت" کے مختلف پہلوؤں پر بڑی دقت نظر کے ساتھ گفتگو کی ہے، بہرحال وقت کی کمیت وکیفیت وجود اور ہستی، نوعیت اور حیثیت پر، جب سے علم وجود میں آیا ہے، آج تک بحث وگفتگو کا سلسلہ جاری ہے اور اس سارے دفتر کا خلاصہ یہ ہے کہ افلاطون کے وقت سے لے کر آئن اسٹائن کے عہد تک، حکماء وقت کے بارے میں کسی ایک خیال یا نظریہ پر متفق نہیں ہو سکے، جس طرح یہ پہلے سر مکتوم تھا، اسی طرح اب بھی ہے اور شاید قیامت تک اسی طرح رہے گا:

بہرحال حکماء اور فلاسفہ کی اپنی وآں اور چنیں وچناں کچھ بھی رہی ہو، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وقت، اور زندگی میں بڑا گہرا ربط ہے دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر امتیاز نہیں ہو سکتا، بقول اقبال۔

آب او سرمایہ دار زندگی است

مذہبی نقطہ نظر سے دیکھیے تو یہی وقت ایک اہم اور غور طلب چیز ہے خود قرآن کریم میں اختلاف لیل و نہار کو دُوسرے الفاظ میں وقت کو ـــــ آیاتِ الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں فکر و تامل کی دعوت دی گئی ہے :

احادیثِ نبوی میں بھی وقت کا ذکر ملتا ہے، ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے :

لی مع اللّٰہ وقت، لا یسعنی فیہ، نبی مرسل ولا ملک مقرب :

یعنی :

"ایک وقت" ایسا آتا ہے جب میں خدا کے ساتھ تنہا ہوتا ہوں، اس وقت نہ کوئی نبی مرسل وہاں آسکتا ہے، نہ فرشتۂ مقرب

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ خدا فرماتا ہے :

لا تسبوا الدھر وانا الدھر !

زمانے کو بُرا مت کہو، میں خود زمانہ ہوں :

۱۹۳۲ء میں اقبال نے، جامعہ ملیہ میں ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے فرانس کے مشہور فلسفی برگساں کا ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا، جب میں نے اسے یہ حدیث سنائی تو وہ اچھل پڑا اور اس نے کہا :

"کیا واقعی ؟"

بہر حال علمی اعتبار سے وقت ایک ایسا مبحث ہے جس پر گفتگو کرنے کی استعداد نہ راقم الحروف میں ہے نہ پڑھنے والوں کی غالب ترین اکثریت کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، لہٰذا اس کی علمی اور فلسفیانہ حیثیت سے قطع نظر کر کے دیکھنا یہ ہے کہ فرمانِ نبی کی روشنی میں، اقبال نے کس طرح مسلمانوں کو وقت پر غالب آنے اور حکومت کرنے کی تعلیم دی ہے، فرماتے ہیں :

تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمزِ وقت از لی مع اللّٰہ یاد گیر
این و آں پیداست از رفتارِ وقت
زندگی سرّیست از اسرارِ وقت

اور اس کے بعد بتاتے ہیں :

اصل وقت از گردش خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست
عیش و غم عاشور و ہم عید است وقت
سرّ تاب ماہ و خورشید است وقت

نیز یہ کہ :

وقت ما کو اوّل و آخر ندید !
از خیابان ضمیر ما دمید
زندہ از عرفان اصلش زندہ تر
ہستی او از سحر تابندہ تر

حاصل کلام یہ کہ :

زندگی از دہر و دہر از زندگی است
"لاتسبّوا الدھر" فرمان نبیؐ است

---

(۵۸)

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشر

○

اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے وہ فرد اور جماعت میں ناقابلِ انفصال رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے اسلام کے ارکان میں نماز ہے، روزہ ہے، حج ہے، زکوٰۃ ہے اور یہ چاروں چیزیں اجتماعیت کی مظہر ہیں، نماز باجماعت اصل نماز ہے، نماز باجماعت میں جو ثواب ہے، وہ انفرادی نماز میں نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ جو لوگ اذان سنتے ہیں اور مسجد میں نہیں آتے، جی چاہتا ہے کہ ان کا مکان جلا دوں، ایک آدمی نے معذرت کی کہ میرا گھر دور ہے، بوڑھا ہوں، نظر بھی کم آتا ہے، اجازت ہو تو نماز گھر پر پڑھ لیا کروں، ارشاد ہوا کیا تم اذان کی آواز سنتے ہو؟ اس نے عرض کیا جی ہاں سنتا ہوں" فرمایا" پھر تمہیں مسجد میں آنا چاہئے نماز باجماعت کے جو فوائد اور مصالح ہیں ان پر ہزاروں صفحے لکھے جا سکتے ہیں:

روزہ بھی اسلام کا ایک رکن ہے، لیکن یہ بھی تمام تر اجتماعی مظاہر اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے، روزہ رکھنے کے بعد آدمی اگر غریب ہے تو محسوس کرتا ہے، بھوک کا درد میں ہی نہیں محسوس کرتا، بلکہ وہ بھی آج اس دکھ میں مبتلا ہیں، جن کے پاس سب کچھ ہے، امیر محسوس کرتا ہے جیسی تکلیف میں آج محسوس کر رہا ہوں، ایسی ہی خدا کے غریب بندے سال کے بارہ مہینے محسوس کرتے ہیں، اس میں رقتِ قلب پیدا ہوتی ہے اور عوامی صلاح و فلاح کے کاموں پر وہ بارہ انشراحِ قلب کے ساتھ عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

حج بھی اسلام کا ایک رکن ہے اور یہ تو تمام تر اجتماعی فریضہ ہے، کوئی شخص بھی حج سے اپنے گھر میں فارغ نہیں ہو سکتا، اسے خواہ وہ چین کا رہنے والا ہو، یا قطب جنوبی کا، بہرحال مکہ آنا پڑے گا اور اس فریضہ کو انجام دینا پڑے گا، سارے عالمِ اسلام سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے ہیں زبان الگ، قوم جدا، وطن کا اختلاف، تہذیب معاشرت، تمدن ہر چیز جداگانہ، لیکن ایک وقت مقررہ پر خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہوتے ہیں، ایک دوسرے

کے دُکھ درد سے واقف ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے دُکھ درد کا مداوا کرتے ہیں یہ ہر سال منعقد ہونے والی اتنی بڑی بین الاقوامی کانفرنس ہے کہ جس کی افادیت کو دوسری قومیں، قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں :

زکوٰۃ بھی اسلام کا رکن ہے اور یہ بھی تمام تر مصالح ملی و قومی کے لیے وقف ہے ہر شخص جو صاحبِ استطاعت ہو، قوم کی اجتماعی صلاح و فلاح کے لیے حکومتِ اسلامیہ کو ایک ٹیکس دیتا ہے اور اس محصُول سے اجتماعی طور پر ملّت مستفید ہوتی ہے :

غرض اسلام کی جتنی مذہبی اور نیم مذہبی تقریبات ہیں، ان سب میں اجتماعیت کا رنگ غالب ہے لیکن مقامِ افسوس ہے کہ مسلمان اجتماعیت کا درس بالکل فراموش کر چکے ہیں اور خود پسندی کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں، انھوں نے مکمل طور پر اپنے ذہن سے اس سبق کو محو کر دیا ہے :

اقبال مسلمانوں کو یہ بھولا ہُوا سبق یاد کراتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ فرد اور ملّت کا ربط اسلامی نقطۂ نظر سے کتنا ضروری اور اہم ہے :

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہرِ او را کمال از ملّت است

اس کے بعد مسلمانوں کو رسُولِ کرمؐ کا ارشاد یاد دلاتے ہیں :

در جماعت کن کہ گفتہ خیر البشرؐ
ہست شیطاں از جماعت دُور تر

ارشادِ رسولؐ کی طرف متوجہ کرنے کے بعد وُہ اس ارشاد کے فوائد و مصالح بتلاتے ہیں :

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند
سلک و گوہر کہکشان و اختر اند

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم

ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم
وحدت او مستقیم از کثرت است
کثرت اندر وحدت او وحدت است

اور

لفظ چوں از بیت خود بیروں نشست
گوہر مضمون بجیب خود شکست

---

(۵۹)

از خدا محبوب تر گردد نبیؑ

○

توحید کا رکن رکین رسالت ہے :

جب دُنیا کفر و شرک کی تاریکی میں گھری ہوئی تھی، خالق اور مخلوق کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، لوگوں نے اپنے خدا کو فراموش کر دیا تھا اور خود اپنے بنائے ہوئے بتوں اور خدا کے بنائے ہوئے مظاہر کی پرستش میں غرق و منہمک ہو گئے تھے، فاران کی چوٹیوں اور مکہ کی گھاٹیوں سے ایک صدا بلند ہوئی :

لا الٰہ الا اللہ

یہ صدا سُن کر کافر اور مشرک چونک پڑے، یہ ایک بہت بڑی ضرب تھی ان کے آبائی اور موروثی عقائد پر، اور اسے برداشت کرنے کے لیے وہ کسی طرح تیار نہیں تھے، جس نے یہ صدا لگائی تھی، اس کی جان کے گاہک ہو گئے اور اس پیام کو مٹا دینے کے لیے "اُمت واحدہ" بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے :

لیکن رفتہ رفتہ یہ صدا بلند سے بلند تر ہوتی گئی، شروع شروع میں جن لوگوں نے اس کے سُننے سے انکار کیا تھا، رفتہ رفتہ اُسے سننے لگے، ماننے لگے اور پھر سمع و طاعت کے پیکر بن گئے :

اس صدا کا دینے والا، ایک نئی ملت، ایک نئی قوم، ایک نئی جماعت کی تشکیل میں کامیاب ہو گیا اور وہ قوم "خیر اُمت" بن کر دُنیا پر چھا گئی، اس نے بہت مختصر سی مدت میں وہ کارنامے انجام دیئے جو دوسری قومیں اور ملتیں اپنی صدیوں کی زندگی میں بھی انجام نہیں دے سکی تھیں "خیر اُمم" بن کر وہ اُمت عرب کے ریگزار سے نکلی اور دیکھتے دیکھتے الصف سے زائد کرۂ ارض کی مالک بن گئی :

اقبال کے پیام اور دعوت کا مقصد و منشا یہ ہے کہ مسلمان، توحید کے اس رکن رکین رسالت کو فراموش نہ کر دیں اس سے اپنا رابطہ استوار رکھیں، اس کے نقش قدم کی رہبری میں منزل مقصود کی طرف گام

زن ہوں، وہ طرح طرح سے بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم "پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ معنے نئے الفاظ و اسلوب سے، مسلمانوں کو اس حقیقتِ کبریٰ کی طرف متوجہ کرتے ہیں، چنانچہ اس بحث پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت در تنِ ما جاں دمید

اقبال کتنی بڑی سچائی کا بیان کرتے ہیں، جب یہ کہتے ہیں:

حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم
از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما، آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ "یھدی من یشاء" وہ جسے چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے اور اسی خدا نے رسالت کا حلقہ مسلمانوں کے گلے میں ڈالا ہے:

آں کہ شانِ اوست یھدی من یرید
از رسالت حلقہ گردِ ما کشید
حلقۂ ملت محیطِ افزا ستے
مرکزِ او وادیِ بطحا ستے

اور اس مرکزِ رسالت سے وابستہ ہونے کی صورت میں ہمیں اور دنیا کو ملا کیا؟

ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم
اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
از میانِ بحر او خیزیم ما

مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما

اور اس رسالت کی حلقہ بگوشی کے بعد، ملّتِ اسلامیہ نے اپنی ذمہ داریوں کو کیونکر نباہا؟

آتشش در حرز دیوارِ حرم
نعرہ زن مانندِ شیراں در اجم[1]

ارشاد فرماتے ہیں، اس نسبتِ مصطفوی کا جلوہ اگر دیکھنا چاہو تو:—

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

سب سے بڑی بات مذکورہ اشعار کے آخری مصرعہ میں کہہ گئے ہیں:

از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

لیکن دل دل ہے، خدا کو ہم نے دیکھا نہیں مانا ہے، اس کی ہیبت، جبروت، کبریائی، ان سب پیغمبروں کے سامنے، سر سجدہ ریز ہے لیکن محمدؐ کی زندگی کا ایک ایک دن، اس دن کی ایک ایک ساعت اس ساعت کا ایک ایک لمحہ ہماری نظر کے سامنے ہے اور خدا سے بڑھ کر اس حقیقت کا گواہ کون ہو سکتا ہے کہ محمدؐ کی زندگی کا جو نمونہ —— ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے —— اس دنیا کے سامنے ہے وہ اوّل و آخر ہے نہ اس سے پہلے کبھی ایسا نمونہ دیکھنے میں آیا نہ اس کے بعد، پھر اگر دل بے ساختہ پکار اٹھے:

از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

تو اس کی خطا کیا ہے؟ —— اور یہ محبت پیدا بھی کس نے کی ہے؟ خدا ہی نے تو؟ —— کیوں

---

[1] اجم - جنگل

اُس نے ایسا پیکرِ مثال بنا کر بھیجا کہ جس پر نہ نگاہ ٹھہرتی ہے، نہ دل اس کا جلوہ دیکھ کر، رسم و آئین کا پابند رہتا ہے، جنون اور از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، سر خود بخود جھکتا جاتا ہے اور عشق دیوانگی اور جنون کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، بھلا دیوانہ کی زبان کس نے پکڑی ہے؟ مجنوں پہ قدغن کس نے لگائی ہے! ——صلی اللہ علیہ وسلم——!

آگے چل کر فرماتے ہیں:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما

اور بتاتے ہیں:

وین فطرت از نبیؐ آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم

پھر مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں:

تا نہ ایں وحدت ز دست ما رود
ہستی ما با ابد ہمدم شود

اس نبیؐ اور اس نبیؐ کی رسالت کے خصائص و امتیازات کیا تھے؟ یہ بھی سُن لیجیے:

پس خُدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولؐ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی فضیلت اور بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارا رسُول خاتم النبیینؐ اور ہم خود خاتم الاقوام و خاتم الملل اب نہ کوئی رسُول آئے گا، نہ کوئی اُمّت پیدا ہوگی، خدا کا مقصد، اس رسُول اور اس اُمّت کے بعد پورا ہو گیا:

خدمت ساقی گری با ما گذاشت

داد ما را آخرین جامے کہ داشت

لا نبی بعدی ، ز احسان خداست
پردهٔ ناموس دین مصطفیٰ است
قوم را سرمایهٔ قوت ازو
حفظِ سرّ وحدتِ ملّت ازو
حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست

دل ز غیر اللہ مسلمان برکند
نعرهٔ لا قوم بعدی مے زند

---

(۶۰)

زادنِ او مرگِ دُنیائے کہُن

○

دُنیا میں بہت سے نبی اور رسُول آئے آدمؑ سے لیکر عیسیٰؑ تک ۔ انبیاء کا ایک سلسلہ ہے جو چلا آتا ہے، سوال پیدا ہو سکتا ہے آخر پھر آنحضرتؐ کی ضرورت کیا تھی ؟ آپؐ کو کیوں مبعوث کیا گیا ؟ آپؐ کی رسالت کا مقصد کیا ہے ؟

اقبال اس کا جواب دیتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ رسالت محمدی کا مقصد یہ ہے کہ انسانیت جس نعمت سے محروم ہو چکی ہے، وہ پھر اسے واپس دی جائے :

انسانیت حریت کی نعمت سے محروم ہو چکی تھی فغفور و خاقان کا راج تھا، چند لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار تھی اور عوام غلاموں کی زندگی بسر کر رہے تھے رسالت محمدی کا مقصد و منشا یہ تھا کہ حریت اور آزادی کی نعمت عام کر دی جائے اور ہر انسان کو خواہ وہ کسی نسل و رنگ اور خاندان و قبیلہ اور ملک و قوم اور دین و ملت سے تعلق رکھتا ہو یہ حق دیا جائے کہ وہ آزادی کی زندگی بسر کر سکے :

دُنیا اونچ نیچ کے مرض میں مبتلا تھی ، یہ عالی نسب ہے وہ والا نسب ہے لیکن جو عالی حسب اور والا نسب نہیں، وہ ذلیل ہے ، کم تر ہے حقیر ہے ، اس قابل ہے کہ اسے عزت اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع نہ دیا جائے رسالت محمدی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہ امتیاز ختم کر دیا جائے اور دُنیا کو بتا دیا جائے کہ بڑائی ، بزرگی اور برتری کا معیار ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ :

اِنّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم :

خدا کے نزدیک بزرگ اور برتر وُہ ہے جو متقی ہے :

دُنیا ملک و قوم اور ملت و وطن کے چکر میں گرفتار تھی :

"میرا ملک خواہ وہ صحیح ہو یا غلط"

یہ نعرہ تھا نعرہ جاہلیت ۔ رسالت محمدی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس غلط نظریہ کو ختم کیا جائے اور اخوت کی جہانگیری کے وسائل پیدا کیے جائیں اور دنیا کو تباہ ہونے سے بچا لیا جائے :

كلكم من آدم و آدم من تراب

تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی کے پتلے تھے :

اقبال نے مثنوی رموزِ بے خودی میں اس مبحث پر تفصیل سے اپنے خیالات عالیہ کا اظہار کیا ہے وہ بعثت محمدی سے قبل کا نقشہ کھینچتے ہیں :

بود انسان در جہان انسان پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت
باج بر کشت خراب او نوشت
در کلیسا اسقف رضوان فروش
بہر این صید زبون دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

اور اس تسلط کا نتیجہ کیا ہوا؟ پیر کنشت کی سطوت، برہمن کی آمریت، اسقف رضوان فروش کی

انانیت نے اس صید زبوں آدمی کی حالت کیا کر دی؟ اور گل کیسے کیسے کھلائے؟

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

لیکن رسالت محمدی جب جلوہ گر ہوئی تو حالات یکسر بدل گئے:

تا امینے حق بہ حقداراں سپرد
بندگاں را مسند خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد
کوہکن را پایۂ پرویز داد
اعتبار کار بنداں را فزود
خواجگی از کار فرمایاں ربود

اس قوت نے جو محمد کی صورت میں نمودار ہوئی اس طلسم کو کس طرح توڑا؛ انسان پر انسان کی خدائی
کس طرح ختم کی؛

قوت او ہر کہن پیکر شکست
نوع انساں را حصار تازہ بست

تازہ جاں اندر تن آدم دمید
بندہ را باز از خداونداں خرید

اس کے یہ کارنامے جاہ پرستوں اور نشۂ اقتدار کے متوالوں کے لیے پیام مرگ ثابت ہوتے
ان کی دنیا میں ہلچل مچ گئی، برہمن، اسقف، پیر کنشت، خاقان و سلطان، میر و وزیر، قیصر و کسریٰ
سب لرز اٹھے:

زادن او مرگ دنیائے کہن
مرگ آتش خانہ و دیر و شمن

اُس نے آتے ہی دُنیا کا نظام بدل دیا، دُنیا کی کایا پلٹ دی :

نقشِ تو بر صفحۂ ہستی کشید
امّتے گیتی کشائے آفرید

اور یہ "امّت گیتی کشا" جسے اس نے پیدا کیا کس کردار اور کن صفات کی حامل تھی ؟

امّتے از ماسوا بیگانہ
بر چراغِ مصطفےٰ پروانہ
امّتے از گرمیِ حق سینہ تاب
ذرّہ اش شمع حریم آفتاب
کائنات از کیفِ اُو رنگیں شدہ
کعبہ ہا بُت خانہ ہائے چیں شدہ
مرسلان و انبیاء آبائے او
اکرم او نزدِ حق اتقائے او
کلّ مومن اخوۃ اندر دلش !
حرّیت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ
ہمچو سرو آزاد فرزندانِ او
پختہ از قالوا بلیٰ پیمانِ او
سجدۂ حق گل ز سیمائش زدہ
ماہ و انجم بوسہ بر پایش زدہ

---

(۶۱)

من نہ دانم مرز بوم او کجاست

توحید الٰہی اور رسالتِ محمدی عام ہے، کسی خاص ملک قوم سے وابستہ نہیں، دُنیا کے ہر باشندے کو موحد ہونا چاہیئے، دُنیا کے ہر رہنے والے کو رسالتِ محمدیؐ کا حلقہ بگوش ہونا چاہیئے جب حقیقت یہ ہے، تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس پیامِ توحید اور رسالت کے نتیجہ میں جو امت نمودار ہوئی ہے، وہ قیدِ مقام اور قیدِ وطن کی پابند ہو؟ اُسے بھی آفاقی ہونا چاہیئے:

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اسے بھی وطن اور مرز بوم کی پابندی سے یکسر آزاد ہونا چاہیئے:

مسلمانوں کو، وطن پرستی کے خلاف عروج اور عہدِ شباب میں، بلا خوفِ لومۃ لائم اقبال نے یہی پیام دیا ہے، ان کا نظریہ یہی ہے کہ چونکہ ملتِ محمدیہ کی بنیاد و اساس توحید و رسالت پر ہے لہٰذا کسی طرح اور کسی درجہ میں بھی، قیدِ مکانی کی پابند نہیں ہو سکتی:

چنانچہ فرماتے ہیں:

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز بوم او بجز اسلام نیست

یعنی، مسلمان کا وطن" اسلام ہے۔ زمین کا کوئی ٹکڑا نہیں :

پھر ایک واقعہ بتاتے ہیں کہ آنحضرت کی خدمت میں اسلام سے پہلے کے دشمن اور اسلام کے بعد کے جاں نثار کعب نے قصیدہ "بانت سعاد" گزرانا۔ اس قصیدہ میں آپ کو ہندی تلوار سے خطاب کیا۔ آنحضرت نے قصیدہ پسند کیا لیکن فوراً ٹوکا "سیف الٰہی" کہو ہندی تلوار مت کہو۔ اقبال اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ، مسلمان حق کا پرستار ہے۔ اس کا وطن بھی حق ہی ہے وہ کسی ملک اور قوم کی طرف اپنی نسبت نہیں کر سکتا :

پیش پیغمبر چو کعب پاک زاد
ہدیہ آورد از بانت سعاد
در ثنایش گوہر شب تاب سفت
سیف مسلول از سیوف الہند گفت
آن مقامش برتر از چرخ بلند
نامدش نسبت بہ اقلیم پسند
گفت سیف من سیوف اللہ گو!
حق پرستی جز بہ راہ حق مگو

آنحضرت کی اس تعلیم کو گوش گذار کرنے کے بعد کتنی بڑی حقیقت بیان کرتے ہیں :

من ندانم مرز بوم او کجاست
این قدر دانم کہ با ما آشناست

اور خود اس نے :

این عناصر را جہان ما شمرد
خویشتن را میہمان ما شمرد

زاں کہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم
خویش را در خاکداں گم کردہ ایم

پھر یہ سب کچھ بتا چکنے کے بعد مرد مسلمان کو مخاطب کرتے ہیں :

مسلم ہستی، دل بہ اقلیمے مبند
گم مشو اندر جہان چون و چند

اور

مے نگنجد مسلم اندر مرز و بوم!
در دل او یاوہ گردد شام و روم

اور آخر میں ایک بہت بڑے اور اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

عقدۂ قومیت مسلم کشود!
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

اس کی مصلحت کیا تھی؟

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد

(۶۴)

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات

○

مسلمانوں کی سربلندی اور کامرانی کا راز یہ تھا کہ وہ آئین مصطفےٰ پر عمل پیرا تھے کیونکہ

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات

لیکن جب انہوں نے یہ راستہ ترک دیا اور دینِ مصطفےٰ کے آئین و اصول کو نظر انداز کر کے صرف ایک قوم کی حیثیت سے باقی رہ گئے تو ان کے انحطاط و ادبار، ہلاکت و بربادی اور ذلت و رسوائی کا دور شروع ہو گیا اگر وہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہتے تو دُنیا کی سربراہی اور سرداری انہی کے پاس رہتی۔ لیکن انہوں نے صراطِ مستقیم سے روگردانی کر کے دُوسرے راستہ پر چلنا شروع کر دیا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ از یں سو رانده و ازاں سو درمانده کے مصداق بن گئے :

اس حقیقت کو بڑے دلچسپ اور ساتھ ساتھ لرزہ خیز انداز میں اقبال نے بیان کیا ہے :

تا شعارِ مصطفےٰ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

اس کے بعد بتاتے ہیں کہ شعارِ مصطفےٰ اور رمزِ بقا کے ہاتھ سے نکل جانے کا نتیجہ کیا ہُوا ؟

آں نہالِ سربلند و استوار
مسلمِ صحرائی اشتر سوار

پائے تا در وادیِ بطحا گرفت
تربیت از گرمیِ صحرا گرفت

آں چناں کاہید از بادِ عجم

ہم چو نے گردید از بادِ عجم

اس کے بعد بتاتے ہیں کہ وہ مسلمان جو سیف من سیوف اللہ تھا، اپنی اس خصوصیت کو کھو دینے کے بعد کیا رہ گیا؟

آں کہ کشتے شیر را چوں گوسفند
گشت از پامالِ مورے دردمند
آں کہ از تکبیرِ او سنگ آب گشت
از صفیرِ بلبلے بیتاب گشت
آں کہ عزمش کوہ را کاہے شمرد
با توکل دست و پائے خود سپرد
آں کہ ضربش گردنِ اعدا شکست
قلبِ خویشش از ضربِ لمے سینہ خست

آپ نے دیکھا الفاظ میں کتنا جوش اور مفہوم میں کتنا درد ہے؟
یہ ساری داستان عروج و زوال سنا چکنے کے بعد کس حسرت و اندوہ کے ساتھ مسلمان کی موجودہ حالت بتاتے ہیں:

آں کہ گامش نقشِ صد ہنگامہ بست
پائے اندر گوشۂ عزلت شکست

اور جس کا یہ عالم تھا کہ:

آں کہ فرمانش جہاں را ناگزیر
بر درش اسکندر و دارا فقیر

اب اس کا یہ حال ہے کہ:

کوششش اور با قناعت ساز کرد

تا بہ کشکول گدائی نازکرد !

اقبال نے بار بار کثرت اور تسلسل کے ساتھ اس حقیقت کو دہرایا ہے مسلمانوں نے اگر سنجیدگی کے ساتھ، اس پر ان کی زندگی میں غور کیا ہوتا تو کوئی شبہ نہیں، پاکستان ان کی موت سے پہلے عالم وجود میں آجاتا اور وہ ایک ایسی مثالی حکومت کا آئینہ دار ہوتا کہ نہ صرف اسلامی و عربی ممالک اس کی تقلید پر مجبور ہوتے، بلکہ دنیا کی دوسری قومیں اور ملتیں بھی اس کے نقش قدم پر چلنا اپنے لیے باعث فخر و سعادت اور موجب فوز و فلاح تصور کرتیں :

(٦٣)

گل شو از بادِ بہارِ مُصطفےٰ

○

ایک معمولی سا واقعہ بھی کبھی کبھی زندگی کے دھارے کا رُخ بدل دیتا ہے :

رموزِ بے خودی میں اقبال نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے کہ بچپن میں گھر پر ایک فقیر آیا اور صدا دینے لگا، میں نے اُسے کچھ دینے کے بجائے سر پر لاٹھی رسید کی، والد کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ لرز گئے، اس حرکت پر انہوں نے خوب زجر و توبیخ کی اور کہا :

اندکے اندیشہ و یاد آر اے پسر
اجتماعِ اُمتِ خیر البشر

اُس کے بعد فرمایا :

باز ایں ریش سفید من نگر
لرزۂ بیم و اُمید من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بوڑھا باپ جوان بیٹے کو نصیحت کرتا ہے ——— وہ نصیحت جو ہر مسلمان باپ کو کرنی چاہیئے :

غنچہ از شاخسارِ مُصطفےٰ
گل شو از بادِ بہارِ مُصطفےٰ
از بہارش رنگ و بُو باید گرفت

بہرہ از خلق او باید گرفت

پھر کہا، رحمۃ للعالمین کے امتی کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ :

فطرتِ مسلم سراپا رحمت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است

اور :

از مقام او اگر دور ایستی
از میانِ معشرِ ما نیستی

(۹۹)

اُمّیِ عرب

○

دُنیا نے اگر آئینِ محمدی کو فراموش کر دیا تو مقامِ حیرت نہیں لیکن اگر مسلمانوں نے بھی، امّیِ عرب کے پیام کو، فراموش کر دیا تو یہ بات حیرت انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی :-

اقبال کو سب سے زیادہ دُکھ اسی بات کا ہے کہ مسلمان آئینِ محمدی سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ وہ مسلمان کی خودی کو ان الفاظ میں اُبھارتے ہیں :

اے مسلمان :

آب و تابِ چہرۂ ایام تو
در جہاں شاہد علی الاقوام تو

پھر مشورہ دیتے ہیں :

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ
از علوم امّی پیغام دہ

پھر اسی امّی کی تعریف کرتے ہیں :

امّیِ پاک از ہوٰی گفتار او[1]
شرحِ رمز ما غویٰ گفتار او

---

[1] آیۂ قرآنی : وَمَا یَنطِقُ عَنِ الھَوٰی یعنی آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ نفس کی پیدا کی ہوئی بات نہیں، وحیِ الٰہی ہے :

علومِ اُمّی کا پیغام پہنچانے کا نتیجہ کیا ہوگا؟

تا بدست آورد نبضِ کائنات
وانمود اسرارِ تقویمِ حیات

از قبائے لالہ ہائے ایں چمن!
پاک شست آلودگیہائے کہن

پیام کی روح یہ ہے کہ:

در جہاں وابستۂ دینش حیات
نیست ممکن جز بہ آئینش حیات

اس کے بعد عہدِ حاضر کی گمراہیاں بتاتے ہیں:

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے
ہر زماں در جستجوئے پیکرے

نیا بُت کون سا ہے؟

باید از خوں ریختن اندر طرب
نام او رنگ است و ہم ملک و نسب

اور اس بُت کا کارنامہ کیا ہے؟

آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند

پیش پائے این بُت نا ارجمند

اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ بُت جسے تہذیب جدید نے تراشا ہے ممکن ہے غیر مسلم قوموں اور ملتوں کے لیے ان کی مقصد برآری میں کام آتا ہو لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے تو صرف یہ پیامِ ہلاکت ہے۔ اس بُت کی پرستش، دوسری قوموں اور ملتوں میں ہو سکتا ہے کہ زندگی کا جذبہ پیدا کرتی اور ابھارتی ہو، لیکن مسلمانوں کے لیے تو یہ صرف ایک افتراق انگیز نظریہ ہے۔ مسلمان اگر اس بُت کو پوجنے لگے تو ان کی جمعیت بھی ختم ہو جائے گی اور قومیت بھی وہ اسی وقت تک زندہ رہ سکتے ہیں جب تک تہذیب نوی کے اس بُت سے دور ہیں، ذرا اس کے قریب گئے اور تباہ ہوئے۔ ان کی ملیت اور قومیت کی اساس نہ وطن ہے، نہ ملک، نہ نسب، صرف مذہب ہے اور مذہب کو اگر قیدِ مقامی سے وابستہ کر دیا جائے تو اس کی افادیت بھی ختم ہو جائے گی اور اہمیت بھی: لہٰذا اقبال اپنے مردِ مسلمان کو مشورہ دیتے ہیں کہ:

برسر این باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ھو بزن

اور پھر مسلمان سے بڑی حسرت سے اپیل کرتے ہیں:

جلوہ در تاریکی ایام کن!
آں چہ بر تو کامل[1] آمد عام کن

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد اقبال قلب مسلمان پر آخری وار کرتے ہیں:

لرزم از شرم تو در روز شمار　　پرسدت آں آبروئے روزگار

حرفِ حق از حضرت ما بردۂ　　پس چرا با دیگراں نسپردہ

---

[1] کامل سے مراد آیت قرآنی ہے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی یعنی آج ہم نے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی:

(۹۵)

بہ حضورِ رحمۃ للعالمینؐ

○

شاعر نے بہت کچھ کہہ لیا اپنے آپ سے بھی، اپنی قوم سے بھی، اپنے خدا سے بھی اب وہ رحمت اللعالمینؐ کے دربار میں پہنچتا ہے اور ایک سائل کی طرح شہنشاہ امم کے حضور میں پہنچ کر دل کی مراد مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہتا ہے:

اے ظہور تو شباب زندگی!
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تاب روئے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
از تو بالا، پایۂ ایں کائنات
فقر تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمع حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

سرور کائنات کو اس طرح مخاطب کرنے کے بعد شاعر دل کی بات زبان پر لاتا ہے کچھ گردش ایام کا رونا روتا ہے، کچھ اپنی قوم کی خود فراموشی کا شکوہ کرتا ہے، کچھ اقوام غیر کی چیرہ دستیوں اور ہلاکت آفرینیوں کا ذکر کرتا ہے اور بڑے درد کے ساتھ کہتا ہے:

مسلم از سرِّ نبیؐ بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

از منات و لات و عزّیٰ و ہبل
ہر یکے دارد بتے اندر بغل

شیخ ما از برہمن کافر تر است
زاں کہ او را سومنات اندر سر است

قوم کی شکایت کرنے کے بعد، شاعر التجا کرتا ہے:
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را
ایں کہ نشناسد متاعِ خویش را

پھر سرکارِ رسالت مآبؐ کو شاعر یقین دلاتا ہے کہ میرا پیام، میری دعوت، میری ندا، میری صدا، میرا نعرہ، جو کچھ ہے، وہ کتاب و سنّت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہیں مسلمانوں کو اس کی طرف بلاتا ہوں، یہی دعوت دیتا ہوں، اسی راستے پر چلنے کی تلقین کرتا ہوں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

تو —؟

اے فروغت صبحِ اعصار و دہور
چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن!

این خیاباں را زخارم پاک کن
خشک گرداں بادہ در انگور من
زہر ریز اندر مے کافور من!

اور صرف یہی نہیں بلکہ میں اپنے لیے سب سے بڑی سزا خود تجویز کرتا ہوں:

روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اور واقعی، کیا اس سے بڑی سزا بھی ایک مسلمان کے لیے ہو سکتی ہے کہ وہ رسالت مآبؐ کے پائے مبارک کو چومنے سے محروم رہ جائے؟

اپنی دعوت اور اپنے پیام کا ذکر کر چکنے کے بعد اقبال رسول اکرمؐ سے عرض کرتے ہیں کہ:

عرض کن پیش خدائے عز و جل
عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولت جان حزیں بخشندۂ
بہرۂ از علم دیں بخشندۂ
در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم، بگوہر گرداں مرا

پھر اپنی زندگی کا اتار چڑھاؤ بتانے کے بعد ایک اور ـــ آخری ـــ تمنا ڈرتے ڈرتے حضور رسالت مآبؐ میں پیش کرتے ہیں، وہ تمنا صرف اقبال کی نہیں، ہر مسلمان کی ہے آواز اقبال کی ہے مضمون ہر قلب مسلمان کا ہے:

پہلے زندگی کے اتار چڑھاؤ کی روداد خود شاعر کی زبانی سنئے :

مدتے با لالہ رویاں ساختم
عشق با مرغولہ مویاں باختم

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغ عافیت ساماں زدم

برقہا رقصید گرد حاصلم
رہزناں بردند کالائے دلم

یہ سب کچھ تو ہوا اور زندگی بسر ہوتا رہا لیکن :

این شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت
این زر سارا[1] ز دامانم نہ ریخت
عقل آزر پیشہ ام زنار بست
نقش او در کشور جانم نشست
سالہا بودم گرفتار شکے !
از دماغ خشک من — لاینفکے

لیکن ان تمام گمراہیوں کے باوجود :

این تمنا در دلم خوابیدہ ماند

---

[1] سارا — خالص

در صدف مثل گہر پوشیدہ ماند

اور وہ تمنا کیا ہے؟ خود ہی ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے کہتے ہیں:

آخر از پیمانۂ چشمم چکید
در ضمیر من نوا ہا آفرید

اے ز یاد غیر تو جانم تہی
بر لبش آرم اگر فرمان دہی

اتنا کچھ پوچھ چکنے کے بعد بھی، حرف مطلب زبان پر لاتے ہوئے تامل کر رہے ہیں:

شرم از اظہار او آید مرا
شفقت تو جرأت افزاید مرا

لیکن آخر کب تک، شرم زبان پکڑے گی اور ندامت قفل دہن بنی رہے گی؟ خود مدعا زبان پر لاتے ہیں اور اسی کے سامنے لاتے ہیں، جو مشکل کشا ہے:

ہست شان رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

اور—:

یا فلک گویم کہ آرامم نگر!
دیدۂ آغاز و انجامم نگر!

پھر پڑھیے ایک دفعہ !

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش،
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

اور — :

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز در انجامم نگر

---

(۶۹)

مکن رسوا حضورِ خواجہ مارا

ذات رسالت مآبؐ سے اقبالؒ کو شروع ہی سے والہانہ تعلق تھا۔ لیکن زندگی کی گرہیں جیسے جیسے بڑھتی گئیں۔ یہ والہانہ تعلق عشق و محبت میں تبدیل ہوتا گیا۔ انھوں نے ساری دنیا کی سیر کی۔ ساری دنیا کی دانش گاہوں کا جائزہ لیا۔ جدید علوم و فنون میں ماہرانہ دست گاہ حاصل کی۔ لیکن یثرب سے ان کا رابطہ قوی سے قوی تر ہو گیا۔ رسالت مآبؐ کی ذاتِ گرامی سے ان کی شیفتگی بڑھتی گئی۔ جن لوگوں نے اقبالؒ کو دیکھا ہے، ــــ اور ان میں ان سطروں کا لکھنے والا بھی شامل ہے، ــــ وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ آخر آخر میں اقبال کی یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ کہ آں حضرتؐ کا نام نامی آیا اور ان کی آنکھوں سے دجلہ و فرات کی بارش شروع ہو گئی۔ وہ خدا سے زیادہ رسولؐ کو چاہتے تھے، اس لئے کہ خدا کو رسول ہی کے ذریعے انھوں نے پہچانا تھا۔ اور زندگی کے اشہبِ تیز گام کے ساتھ ساتھ، یہ چاہت اور زیادہ گہری اور مضبوط ہوتی چلی گئی۔

اب میں ان کی دو رباعیاں پیش کرتا ہوں، ان سے اندازہ ہو گا۔ کہ سرکارِ حجازؐ کی نگاہ میں رسوا ہونا وہ عذابِ جہنم سے بھی زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے، وہ ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار تھے، لیکن اس پہ تیار نہیں تھے، کہ ان کے گناہوں کی فہرست خواجۂ دو جہاں کے حضور میں پیش ہو۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر

جب یہ عالم پیر —— دنیا —— اپنی انتہا کو پہنچے، قیامت رونما ہو، اور ہر پوشیدہ کام بے پردہ ہو جائے۔

مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

تو اے خدا، میرے آقا کی نگاہ میں مجھے سبک نہ کرنا۔ میری فردِ حساب ان سے پوشیدہ رکھنا۔

اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں کہتے ہیں۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اے خدا، ——

تو غنی ہے، میں فقیر، قیامت کے دن میرا نامۂ اعمال جب پیش ہو تو میرا عذر قبول فرما اور مغفرت فرما دے، لیکن اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میرا نامۂ اعمال پیش ہو۔ اور اس کے مطابق مجھ جزا و سزا ملے۔ تو میرے مولا نگاہِ مصطفیٰ سے اسے پوشیدہ رکھنا۔

---

(۶۷)

کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

ایک مسلمان کی کتنی آرزو ہوتی ہے کہ مکروہاتِ دنیا سے دامن چھڑا کر بیت الحرام، یعنے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو، حج کرے، اور

دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا

خدا کے گھر کی زیارت سے شاد کام ہو،

یہ تمنا اقبال کے دل میں بھی مچلتی رہتی تھی، لیکن حالات مساعد نہ ہوتے راہ کی دشواریاں کم نہ ہوتیں۔ زادِ راہ بھی میسر نہ آسکا، نتیجہ یہ ہوا، کہ دل کی دل ہی میں رہ گئی، لیکن کیا حالات کی نامساعدت دنیا سے تصور پر بھی اثر انداز ہو سکتی تھی۔ مادی وسائل میسر نہ آئے اور وہ دشتِ حجاز کی زیارت نہ کر سکے، لیکن عالمِ تصور میں پر پرواز پیدا کر کے اڑے اور پہنچ گئے۔ لیکن ان کی اصل منزل منزلِ دوست تھی، جس کے راستے میں بطحا ― مکہ پڑتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست
سوئے شہرے کہ بطحا در رہ اوست

بدن زار و نزار ہے، روح اس شہر ― مدینہ ― میں جانے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے۔ جس کے راستہ میں بطحا ― مکہ ― پڑتا ہے۔

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

اے خدا،
تو اپنے بندگانِ خاص — اولیاء، صلحا — کو شرفِ حضوری عطا فرما۔ میرے سر میں تو منزلِ دوست کا سودا سمایا ہوا ہے۔ میں چلا،
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

حلقۂ رسالت[۴]

از رسالت صد ہزار ما یک است
جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
آں کہ شانِ اوست یہدی من یرید
از رسالت حلقہ گردِ ما کشید!

○

(۶۸)

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم

زندگی کا آفتاب لب بام آچکا ہے — آخری منزل — گوشۂ قبر — قریب تر آتی جارہی ہے۔ دنیا سے دل اچاٹ ہوچکا ہے،

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

اب دل میں یہی تمنّا ہے کہ دیار حبیب کی زیارت کیجئے، اور زندگی کے جتنے دن باقی ہیں وہیں بسر کر دیجئے۔ دنیا دیکھ لی، دنیا والوں کو دیکھ لیا۔ نشیب و فراز عالم دیکھ لیا۔ اب کچھ باقی نہیں ہے جسے دیکھنے کی ہوس ہو۔ اب آرزو ہے تو صرف یہ ہے کہ اس دنیا کے جھنجھٹ سے فارغ ہوکر، یہاں کی الجھنوں سے منہ موڑ کر وہاں پہنچ جائیں جہاں کی موت زندگی سے زیادہ عزیز و مرغوب ہے

فرماتے ہیں۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتیم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ!

بوڑھا ہوچکا ہوں، تاب و تواں رخصت ہوچکی ہے، طاقت اور شکیبائی جواب دے چکی ہے۔ لیکن یثرب کے راستہ پر گامزن ہوں۔ عاشقوں کی لے میں گاتا اور گنگناتا ہوا۔

اب میں سمجھا ـــــ !
اس کی چشم سیاہ قطرات اشک سے تر ہو رہی ہے ، اس کی آہ صبح گاہی میں اثناد دے ہے۔ کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہے

جہاں مے کو ضمیرم را برافروخت
پیاپے ریزد از موج نگاہش

جو چنگاری میرے دل میں سلگ رہی ہے۔ وہی شعلے کی طرح اس کے دل میں بھی روشن ہے ، اس نے اس پر بھی وجد و حال کی کیفیت طاری کر دی ہے۔

چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا
درودے خواند و محمل براند

یہ صحرا ـــ صحرائے حجاز ـــ کتنا دل آویز اور دل کش ہے ، قافلے سرور و سوز ، وجد و شوق اور کیف و نشاط کے عالم میں رواں دواں ہیں ، اپنی منزل مقصود ـــــ مدینۃ النبی ـــ کی طرف بڑھے جا رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ لب پر درود ہے اور سفر جاری ہے۔

بہ ریگ گرم او آور سجودے
جبیں را سوز تا داغے بماند !

اے ہم سفرو !
مانتا ہوں کہ ریت گرم ہے ، بہت گرم ہے ، لیکن یہ موقعہ بار بار نہیں ملتا۔ یہ سعادت بار بار ہاتھ نہیں آتی ، سر جھکاؤ ، سجدے کر لو اور اپنی پیشانی پر داغ سجود نمایاں کر لو۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خنداست
شبش کوتاہ و روز او بلند است

یہ صحرا ـــــ یہ صحرائے حجاز ، کتنا دل فریب ، کتنا دل کش ہے ، اس کی شام صبح خنداں

کی طرح دل آویز، اس کی رات کوتاہ اور دن بلند ہے۔

قدم اے راہ رو، آہستہ تر نہ
چو ما ہر ذرۂ او دردمند است

اے راہ رو!
آہستہ آہستہ چل،
اس صحرا کا ذرّہ ذرّہ میری طرح دردمند اور سینہ فگار ہے۔

امیر کارواں این عجمی کیست؟
سرود او بآہنگ عرب نیست

اے امیر کارواں!
تیرے قافلے میں یہ عجمی (اقبال) کون آگیا ہے جس کا سرود آہنگ عرب سے خالی ہے؟

زند آں نغمہ کز سیرابی او
خنک دل در بیابانے تواں زیست

لیکن اس کے باوجود اس کا نغمہ دل میں کھبا جا رہا ہے۔ اس نغمہ کی دل کشی کا یہ عالم ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ساری عمر یہیں گزار دیجئے۔ اور یہ نغمہ سنتے رہیئے، !

رہے پر پیچ و راہی خستہ و زار

سفر مجاز کا سلسلہ عالم خیال میں جاری ہے، شاعر اپنے واردات راستے کے حالات، سفر کے مشکلات اور اپنے جذبۂ بے نہایت کی روداد بیان کرتا ہے۔

انہیں افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

فرماتے ہیں :

غم پنہاں کہ بے گفتن عیاں است
چو آید بر زباں یک داستاں است
رہے پر پیچ و راہی خستہ و زار
چراغش مردہ و شب درمیاں است

راہی کی خستہ و زار حالت بیان کرتے ہیں۔ لیکن یہ حالات ایک ہی بیان میں نہیں سما سکتے، چنانچہ فرماتے ہیں :

بہ راغاں لالہ است از نوبہاراں
بہ صحرا خیمہ گستر دند یاراں !

لالہ صحرائی نے دشت و صحرا میں بہار تازہ کی صورت پیدا کر دی ہے۔ لیکن :

مرا تنہا نشستن خوشتر آید
کنار آب جوئے کوہساراں

میرا دل ان بزم آرائیوں اور مجلس طرازیوں میں نہیں لگتا۔ کنار آب جو تنہا بیٹھنے اور یاد حبیب میں وقت گزارنے میں جو لطف آتا ہے وہ ان رنگ آرائیوں میں کہاں ؟

اُدھر ——

گہے شعرِ عراقی را بخوانم !
گہے جامی زند آتش بہ جانم

اور وہاں ! —— عالمِ تنہائی میں بیٹھ کر کبھی عراقی کے اشعار گنگناتا ہوں، کبھی جامی کے اشعار سے ایک نیا ولولہ پیدا کرتا ہوں ؛

ندانم گرچہ آہنگِ عرب را
شریکِ نغمہ ہائے سار بانم

آہنگِ عرب سے ناواقف ہوں، لیکن ذوق و شوق نے وجد و حال کی جو کیفیت طاری کر دی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساربان کی نغمہ آرائی میں برابر کا شریک ہوں :

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن
فغانش را جنوں انگیز تر کن

اے ساربان —— !

راہیِ رہ حجاز —— اقبال —— کے سرور و نشاط میں کچھ اور اضافے کر دے، اس کی فغاں میں کچھ اور شدّت جنوں کے آثار پیدا کر دے۔

بگیر اے ساربان راہے درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

اے ساربان !

نزدیک کا راستہ اختیار نہ کر، راہ دور دراز سے چل، تاکہ میرا سوزِ جدائی، سوزِ غم ہجر اور زیادہ تیز ہو جائے۔

لوگ آرزوئے دید میں مرتے ہیں، شوق وصال میں جان دیتے ہیں، لذّتِ قرب پر قربان ہوتے ہیں، مگر یہ عاشقِ دیوانہ سرشت، جس طرح اپنی گفتار و کردار میں سب سے الگ ہے، اسی طرح اپنے انداز و اطوار میں بھی سب سے جدا ہے، دوسروں کی تمنا ہے

(۷۱)

نگاہے یارسول اللہ نگاہے

اب شاعر اپنے آقا، اپنے خواجہ، اپنے مولا کے سامنے ہے!

دل میں آرزوؤں کا سیلاب مچل رہا ہے، زبان پر حرفِ آرزو آرہا ہے، نہ جانے کیا کیا سوچا تھا کہ مواجہہ شریف میں یہ عرض کروں گا، وہ عرض کروں گا۔ اپنے اس دکھ کا مداوا چاہوں گا، اپنے اس درد کا مداوا طلب کروں گا۔ اپنی یہ مصیبت بیان کروں گا، اپنا وہ غم عرض کروں گا۔

لیکن دربارِ نبوی میں آکر شاعر اپنی ذات کو بھول گیا، اپنی قوم کو یاد کرنے لگا، وہ اپنے لئے نہیں کہتا، اپنی قوم کے لئے دستِ طلب بڑھاتا ہے۔

مسلماں آں فقیرے کج کلا ہے
رمید از سینۂ او سوزِ آہے

مسلمان ـــــ وہ فقیر کج کلاہ جس کے نام سے دنیا کانپتی تھی، اور سلاطینِ عالم لرزتے تھے، اب ایک بے حقیقت چیز بن گیا ہے، کیوں کہ اس کا دل سوزِ آہ سے خالی ہو چکا ہے'!

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے

اور وہ سوزِ آہ، عشقِ رسولؐ کے سوا کیا ہے؟

دلش نالد، چرا نالد؟ نداند
نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

اس کا دل نالہ و ماتم میں مصروف ہے، لیکن یہ اتنا کھویا جا چکا ہے اتنا خود فراموش ہو چکا ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا، کیوں روتا ہے۔ اس کی نگاہوں سے سیلِ اشک کیوں جاری ہے؟

یارسول اللہ ــــــ اس کی حالت پر رحم فرمائیے، اور اپنی نگاہ کیمیا تاثیر سے پھر اسے ذرّہ سے آفتاب بنا دیجئے'!

پھر اقبال کہتے ہیں مسلمان کا دل اگر سوز سے خالی ہو گیا تو پھر رہا کیا؛ عشقِ رسول کی چنگاری اگر قلبِ مومن میں نہیں تو وہ دل نہیں، صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ تست
نوائے من ز تاثیرِ دمِ تست

دل کا تب و تاب جس ایمان پر قائم ہے، یارسول اللہ وہ آپ ہی کا سوزِ غم ہے۔ میری نوائے جگر خراش میں اگر کچھ تاثیر ہے تو آپ کے سبب

بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

مجھے رونا آتا ہے تو اسی بات پر کہ اس ملک ــــ بھارت و پاکستان ــــ میں کوئی شخص ایسا نہیں جو آپ کا محرم ہو'!

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است

یارسول اللہ!
زمانہ کی گردش اب تک الٹی ہی رہی ہے
مسلمانوں کا کارواں اب تک اپنی منزلِ مقصود سے دور ہے

زکارِ بے نظامِ او چہ گویم
تو میدانی کہ ملت بے امام است

مسلمان قوم غیر مربوط زندگی بسر کر رہی ہے، اس کا کوئی نظام ہی نہیں ہے اور یہ مصیبت ملت ہے کہ وہ امام اور رہنما سے محروم ہے۔
اور یہ حالت اس لئے ہے کہ:

نماند تاب و تب از خون نابش
نروید لاله از کشتِ خرابش

مردِ مسلمان جو کبھی عشق رسول کا پیکر تھا۔ اب اس نعمت سے محروم ہو چکا ہے اس کی تاب رخصت ہو چکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ اس کی کشتِ خراب اب کوئی لالہ نہیں اُگتا۔

نیام او تہی، چوں کیسۂ او
بطاقِ خانۂ ویراں، کتابش

جس طرح اس کی جیب خالی ہے اسی طرح اس کی میان خالی ہے۔ نہ جیب میں زر ہے نہ نیام میں تلوار،
اس کے ویران اور خراب آباد گھر کے طاق میں، قرآن کریم برکت کے لئے رکھا ہوا ہے،
لیکن اس پر غور کرنے اور عمل کرنے کا جذبہ کسی میں نہیں۔

---

(۷۲)

حضورِ تو غمِ یاراں بگویم!

بارگاہ رسالت مآبؐ میں اقبال حاضر ہیں آئے اس لئے تھے، کہ اپنی روداد الم بیان کریں گے، لیکن قوم کے سامنے اپنے آپ کو بھول گئے۔ ذکر ہے تو قوم کا، فکر ہے تو قوم کی۔ التجا ہے تو قوم کے لئے، عرض ہے تو صرف اپنی ملت کے لئے؛ فرماتے ہیں:

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است
از و ایمن نہ رومی نے حجازی است

ملوکیت کے جھنڈے ہر طرف گڑے ہوتے ہیں۔ اور یہ ملوکیت نئے نئے بہروپ بھر کر مسلمانوں کی خودی پر چھاپے مار رہی ہے۔ کہیں یہ بادشاہت ہے، کہیں آمریت اس سے حجاز مقدس کا رہنے والا محفوظ ہے، نہ رومی یعنی ترک مجاہد، حالانکہ مسلمان قوم کی تخلیق اس لئے ہوئی تھی، کہ وہ ہر ملوکیت، ہر غیر اسلامی طاقت و شوکت کا جھنڈا سرنگوں کر دے۔ اور اپنے عہد اول میں مسلمانوں نے یہ کیا بھی تھا۔ لیکن اب وہی مسلمان گرفتار ملوکیت ہیں۔

حضورِ تو غمِ یاراں بگویم!
بامیدے کہ وقتِ دلنوازی است

یا رسول اللہ!

آپ کے حضور میں اپنا ماجرا نہیں پیش کرتا۔ اپنی قوم کی حالت بیان کرتا ہوں۔ اس پر

رحم فرما دیجئے، اس پر کرم کیجئے، !
اور یہ کرم کی التجا اس لئے ہے کہ مسلمان اگرچہ خود رسوا ہو چکا ہے اس کی حالت زار تباہ ہو چکی ہے آزادی کھو چکا ہے، غلامی کی زندگی اختیار کر چکا ہے بادشاہت چھن چکی ہے۔ عبودیت کا دور دورہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

مسلمان لاکھ گیا گزرا ہو، لیکن اب بھی اس میں دم خم ہے، صلاحیت ہے، استعداد ہے اب بھی اس پر آپ کی توجہ ہو جائے تو ابھی حالات بدل سکتے ہیں۔ ابھی اس تن مردہ میں جان پیدا ہو سکتی ہے، ابھی وہ اپنے ماضی کو شاندار حال میں تبدیل کر سکتا ہے۔

مسلماں گرچہ بے خیل و سپاہ است
ضمیر او ضمیر پادشاہ است

آج مسلمان اگرچہ زار و نزار اور خوار و رسوا ہے، نہ اس کے پاس مال و دولت ہے، نہ ساز و سامان، نہ وسائل، نہ ذرائع، لیکن ابھی تک ان میں حکمرانی اور فرمانروائی کی صلاحیت باقی ہے،

اگر او را مقامش باز بخشد
جمال او جلالے بے پناہ است

اگر آپ کی نگاہِ کرم سے پھر اس کا مقام یاد دلا دے، وہ اپنی حقیقت اور اصلیت سے ایک مرتبہ پھر واقف ہو جائے تو اس کا جمال جلالِ بے پناہ سے بدل سکتا ہے۔

فقیراں تا بہ مسجد صف کشیدند
گریبانِ شہنشاہاں دریدند

آخر یہ مسلمان وہی فقیر کج کلاہ تو تھا۔ جو مسجد میں اپنے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا اور غیر اسلامی غیر خدائی اور غیر الٰہی طاقتوں سے ٹکراتا تھا، اور ان کے غرور و تکبر کے تاج کو چھین کر، اپنے قدموں سے پامال کر دیتا تھا، ان کی قبائے شاہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا تھا۔

چو آں آتش، درونِ سینہ افسرد
مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

لیکن اب اس کے دل میں عشق رسول ؐ کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے، لہٰذا دل بھی مر چکا ہے، اور اب وہ آیت من آیات اللہ بننے کے بجائے اسے ترجیح دیتا ہے۔ کہ غیر اسلامی طریقوں سے اپنی زندگی بسر کرے، درگاہوں پر جائے وہاں ریاضت نہ کرے، چلہ کشی نہ کرے، روح کی بلندی اور برتری کے لئے مجاہدہ نہ کرے، بلکہ وہاں کے میلوں ٹھیلوں اور غیر اسلامی سرگرمیوں میں منہمک رہے اور چلا آئے،

۷۳

جوش و شوق

عشقِ رسول ﷺ کی چنگاری جب تک مسلمان کے سینے میں روشن ہے، وہ کائنات کا مالک ہے اور اگر یہ چنگاری افسردہ ہوئی تو پھر

مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے،

جب تک مسلمانوں کے سینے اس نور سے مستنیر ہوتے رہے، سارا جہاں ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا رہا۔ اور جب اس نور سے وہ بے تعلق ہو گئے، تو ان کے حصہ میں غلامی آ گئی، کبریائی اور شہنشاہی دوسروں کو مل گئی۔

بدستِ مے کشاں خالی ایاغ است
کہ ساقی را بہ بزمِ من فراغ است

عشقِ رسول ﷺ کی آگ بجھ گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مے کشوں کے ہاتھ میں پیمانہ رہ گیا۔ خالی پیمانہ اور ساقی جو اس پیمانہ میں مے حقیقت بھرا کرتا تھا اب خالی ہاتھ بے کار بیٹھا ہوا ہے۔

نگہ دارم درونِ سینہ آہے
کہ اصل او ز دودِ آں چراغ است

لیکن میں اب تک اپنے سینے میں عشقِ رسول کی چنگاری دبائے بیٹھا ہوں۔ اس لئے کہ یہ چنگاری محمد ہی کے چراغ سے روشن ہے۔

---

(۷۴)

سوئے یثرب سفر ہے کارواں پہ

علوم جدیدہ اور دانش حاضر کی گمراہیوں سے اقبال تنگ آچکے ہیں، ان کی نارسائیاں دیکھ چکے ہیں، ان کی محرومیوں سے واقف ہیں، لہٰذا ان سب سے الگ ہو کر ان سب سے منہ موڑ کر وہ عقل کی رہبری کے بجائے دل کی رہبری میں رہ یثرب اختیار کرتے ہیں؛

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ
سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ

میں دانش حاضر کی رنگ آرائیوں سے منہ موڑ چکا ہوں اپنی آہ و فغاں میں مصروف ہوں۔ یثرب کا سفر کر رہا ہوں، عقل کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں، دل ساتھ ہے اور اس سے اچھا رفیق کون ہو سکتا ہے!

کجا مکتب کجا مے خانۂ شوق
تو خود فرما مرا این بہ کہ آں بہ

بھلا یہ مکاتب اور مدارس، یہ کلیات اور جامعات، یہ دارالعلوم اور دارالفنون تیرے رمز آشنا کہاں ہیں؟ یہ میخانۂ شوق کے متوالے کیسے بن سکتے ہیں؟

آپ خود فرمائیے، میرے لئے آہ و فغاں کی راہبری میں قطع منازل بہتر ہے یا علوم عصریہ کی گمراہ کن رہنمائی میں راہ ناصواب کی رہروی؟

---

(۷۵)

من اے میر امم داد از تو خواہم

زندگی بھر شاعر اپنی سوتی ہوئی قوم کو جھنجھوڑتا رہا، اسے راہ ہدایت کی طرف بلاتا رہا، لیکن اس کی باتیں سنی ان سنی کر دی گئیں۔ اس کا پیام ٹھکرا دیا گیا۔ اس نصیحتوں کی پروا نہ کی گئی اس کے اقوالِ زریں کو صرف شاعری سمجھا گیا، آخر وہ تنگ آ کر فریاد کناں بارگاہ رسولؐ میں پہنچا اور وہاں اپنی شکایت پیش کی:

باآں رازے کہ گفتم پے نبردند
ز شاخ نخل من خرما نہ خوردند

میں نے اپنی قوم کو رموزِ حیات بتایا، رازِ خودی سے آگاہ کیا۔ لیکن اس نے پروا نہ کی۔
میری شاخِ فکر پر دینِ اسلام اور عشقِ محمدؐ کا خرما پھل لایا، لیکن میری قوم نے اس طرف توجہ نہ کی

من اے میر امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

اے سرکارِ دو عالمؐ!
آپؐ کے سوا، اس ظلم کی داد رسی کے لئے، میں اور کس کے پاس جاؤں کہ میری قوم مجھے اسلام کا مبلغ نہیں، شاعر سمجھتی ہے۔!

۷۶

وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

عاشق کے منہ سے جو بات نکلتی ہے مزے کی ہوتی ہے، دل سے نکلتی ہے، دل پر اثر کرتی ہے، اس میں خلوص ہوتا ہے، سچائی ہوتی ہے، حقیقت ہوتی ہے، اور یہ خلوص بے اثر نہیں رہتا، یہ اپنا کام کر کے رہتی ہے،

حقیقت آپ منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

شاعر عاشق کا جامہ پہن کر، وجد و کیف سے بے خود ہو کر، پیکر اضطراب و اضطرار بنا ہوا ساری دنیا سے بے پروا، ساری دنیا سے الگ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے، راستہ کی مشکلیں اس کا راستہ نہیں روک سکتیں، خطرات و مہالک اس کا دامن نہیں پکڑ سکتے، ناداری و بے زری اس کی ہمت میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتی، ایک جوش ہے جو رواں دواں اسے لئے جا رہا ہے، ایک کیفیت ہے جو اس پر طاری ہے، اور اسی میں مست و بے خود اور مدہوش چلا جا رہا ہے، بڑھا چلا جا رہا ہے۔

آخر قطع منازل کے بعد، وہ بطحا — مکہ — پہنچ جاتا ہے، یہاں پہنچتا ہے تو یثرب کی آتش شوق اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے، اور وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

دراں دریا کہ او را ساحلے نیست
دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست

میرے آقا!

عشق، دل ہوتا ہے، عقل نہیں ہوتا۔ فقیہ کا فتویٰ کچھ ہوتا ہے، عاشق کا فیصلہ کچھ،

عشق وہ دریا ہے، کہ اس کا کوئی اور چھور نہیں،

عاشق منطقیوں اور فقیہوں سے بحث و مباحثہ نہیں کرتے، وہ نہ ان دلائل کے قائل ہوتے ہیں جو یہاں وہاں سے لیے گئے ہوں، نہ قیل و قال ان کا مشرب ہوتا ہے نہ قال اقول ان کا مسلک، وہ جو فیصلہ بھی کرتے ہیں، دل کی رہنمائی میں کرتے ہیں اور اس پر عامل ہوتے ہیں یہی ان کی منطق ہے، یہی ان کا فلسفہ ہے یہی ان کا علم ہے، یہی ان کی تحقیق ہے، یہی ان کا تجربہ ہے یہی ان کا مشاہدہ ہے

تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

آپ نے فرمایا میں بطحا میں سر کے بل حاضر ہو گیا۔ اور وہ فرائض بجا لایا جن کا آپ نے حکم دیا تھا۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے، کہ آپ کے اس غلام کی منزل صرف آپ ہی کی ذات ہے، یہاں تک پہنچ گیا۔ تو اس نے سب کچھ پالیا۔

اور یہی وجد و کیف اور سوز و عشق جب وہ دیارِ حبیب میں پہنچتے ہیں، تو بے ساختہ ان کی زباں پر بے ساختہ یہ ترانہ جاری کر دیتا ہے،

مراں از در کہ مشتاق حضوریم
ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم

اے میرے آقا !

میں آپ کے دیدار کا مشتاق ہوں، مجھے اپنے در سے دور نہ کیجیے

مجھے جو درد ــــ عشق رسول ــــ آپ نے مرحمت فرمایا ہے، وہ صبر طلب نہیں، ناصبوری اس کی سرشت ہے :

بہ فرما ہرچہ می خواہی بہ جز صبر
کہ ما از وے دو صد فرسنگ دوریم

آپ مجھے جو حکم دیں گے، میں اس کی دل و جاں سے تعمیل کروں گا۔

لیکن صبر کا حکم نہ دیجیے،

بس یہی ایک ایسی چیز ہے، جس کی تعمیل یہ عاشق جنوں پیشہ نہیں کر سکتا، مجھ میں

اور صبر میں بہت زیادہ دوری ہے، بہت بڑا فاصلہ ہے،
"دو صد فرسنگ دوریم" کہہ کر شاعر نے اپنے واردات کا نقشہ کھینچ دیا ہے"!

دینِ ما آئینِ ما

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما، آئینِ ما

○

(۷۷)

پیامِ شوق او آورد یا من؟

یہ ملّا، یہ صوفی، یہ شیخِ حرم، یہ مفتیِ شہر، یہ واعظ شیریں مقال ——، یہ سب اپنے آپ کو دین کا ٹھیکہ دار سمجھتے ہیں، جسے چاہیں کافر بنا دیں، جسے چاہیں، مومن قرار دیں جس سے چاہیں جنت چھین لیں جسے چاہیں جہنم بخش دیں، یہ اپنی گفتار کو یہ الہامِ الٰہی سمجھتے ہیں، یہ اپنے کردار کو آیت من آیات اللہ قرار دیتے ہیں۔ یہ اپنی نگاہ کو من سیوف اللہ سمجھتے ہیں، جو ان کی جناب میں گستاخی کرے، وہ کافر، جو ان کے فرمودات کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے، وہ دین سے خارج، جو ان کے مجتہدات کے قبول کرنے میں تامل کرے وہ گمراہ، جو ان کے ارشادات کو حقیقی نہ مانے، وہ فاسق و فاجر!

لیکن اقبال ان کے سرِ حقیقت سے واقف ہے۔

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن\
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

وہ جانتا ہے یہ اپنے تئیں سب کچھ سمجھتے ہیں، مگر ہیں نہیں، اسی لئے:

نہ با ملّا، نہ با صوفی نشینم\
تو می دانی کہ من آنم نہ اینم

نہ میں ملّا کے پاس بیٹھتا اٹھتا ہوں، نہ صوفی سے ربط ضبط رکھتا ہوں، چونکہ دونوں کی حقیقت اور ماہیت سے واقف ہوں اس لئے نہ یہ ہوں نہ وہ ہوں۔

نویس اللہ را بر لوح دل من !
کہ ہم خود را ، ہم او را فاش بینم

یا رسول اللہ :
میرے دل پر اپنے دست مبارک سے لفظ اللہ ، نقش کر دیجیے ،
تاکہ میں اپنے آپ سے بھی واقف ہو جاؤں ، اور اپنے رب سے بھی
مُلّا کی حقیقت بتاتے ہیں :

دلِ مُلّا گرفتارِ غمے نیست
نگاہے ہست ، در چشمش نمے نیست

مُلّا کا دل آپ کے غمِ عشق میں مبتلا نہیں ہے اس کے پاس نگاہ تو ہے ۔ لیکن وہ نگاہ نہیں جو سوزِ محبت سے نمناک ہوتی ہے ۔

ازاں بگریختم از مکتب او !
کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

میں اس کے مکتب سے دل برداشتہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ۔ کہ اس کی ریگِ حجاز میں زمزم کا کہیں سراغ نہیں ملتا ،

اور یہ ملّا ، ——— اس کی حالت یہ ہے کہ

سرِ منبر کلامش نیش دار است
کہ او را صد کتاب اندر کنار است

وعظ کے منبر پر بیٹھ کر ، جب وہ گل افشانیٔ گفتار کا مظاہرہ کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے ، کہ اس کی زبان نہیں نوکِ خنجر ہے ، وہ اپنے علم کتابی کو ، علم سمجھنے لگا ہے ،

حضورِ تو من از خجلت نہ گفتم
ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

یا رسول اللہ !
آپ سے اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے ،

ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اپنے آپ سے ناواقف ہے، لیکن میں اسے خوب سمجھتا ہوں یہ اپنی کمزوریوں پر نظر نہیں رکھتا، میری نظر میں اس کی ہر کمزوری اور ہر نارسائی ہے،

ملاّ کی یہ نارسائیاں دیکھ کر اقبال اپنے دل کو ٹٹولتے ہیں، اپنے ضمیر کا جائزہ لیتے ہیں، اپنے نفس کا احتساب کرتے ہیں۔ تو محسوس کرتے ہیں:

کاش اس فرقۂ زہاد سے اٹھتا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

وہ دیکھتے ہیں، ملاّ کے دل میں نہ سوزِ عشق ہے، نہ آنکھ میں نم، پھر اپنے اوپر نظر ڈالتے ہیں تو پھر کس خود ستائی کے ساتھ عرض کرتے ہیں:

دل صاحب دلان او برد یا من؟!
پیامِ شوق او آورد یا من؟!

اہلِ دل کے دل پہ ملاّ نے غلبہ پایا، یا میں نے؟
آپؐ کے عشق و محبت کا ترانہ اس نے گایا، یا میں نے؟

من و ملاّ ز ترکش دین دو تیریم
بہ فرما بہ ہدف او خورد، یا من؟

میں اور ملاّ ایک ہی کمان کے دو تیر ہیں، اب یہ فیصلہ آپ ہی فرما دیجئے، کہ ہدف پر وہ گیا ہے یا میں؟

---

(۷۸)

کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

شاعر بارگاہِ رسول ؐ میں پہنچا ہے۔ لیکن خالی ہاتھ ! ۔
وہ سوچتا ہے ، اتنی بڑی بارگاہ میں آیا ہوں ، لیکن نذر کو میرے پاس کوئی چیز نہیں ،
ندامت اور خجلت کی کیفیت طاری ہوتی ہے ، پھر بے ساختہ ایک ارمان الفاظ کا جامہ پہن کر
اس کی زبان پہ آجاتا ہے ۔ :

دمید آں لالہ از مشتِ غبارم
کہ خونش می تراود از کنارم

میرے مشتِ غبار سے ایک لالہ پھوٹا ہے جس سے خونِ جگر کی تراوش ہو رہی ہے

قبولش کن زراہِ دل نوازی ؟
کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

فقیر کا دل رکھ لیجئے ۔ اور یہ ہدیۂ حقیر قبول فرما لیجیے ،
میرے پاس لے دے کے یہی ایک چیز —— دل —— ہے ، جسے آپ کی خدمت میں
پیش کئے دیتا ہوں ۔ اور میری زندگی بھی گیا ہے ، بجز اس کے کہ :

حضورِ ملتِ بیضا تپیدم
نوائے دل گداز آفریدم
ادب گوید سخن را مختصر گوئے
تپیدم ، آفریدم ، آرمیدم

(۷۹)

کیفیاتِ عشق

عشق کی کیفیت مختلف ہوتی ہے، کبھی کچھ، کبھی کچھ، شاعر ان کیفیتوں سے گزرتا ہے اور کمال یہ ہے کہ انہیں بڑے دل آویز طریقے پر بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، وہ اپنی ہر کیفیت کو اس خوبی کے ساتھ الفاظ کا پیکر عطا کرتا ہے کہ اس کی تصویر کھنچ جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ ایک ایسی حقیقت ہے، جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، ہمارے سامنے گزر رہی ہے۔

شاعر بارگاہِ رسالت میں پہنچتا ہے اور گویا اپنا تعارف کراتا ہے۔

کہ گفت او را کہ آید بوئے یارے؟
کہ داد او را امید نو بہارے؟

میرے آقا!

ذرا اس امر پر توجہ تو فرمایئے کہ وہ میرے سوا کون ہے جس نے مسلمانوں کو بتایا کہ بوئے یار آرہی ہے، مایوس مت ہو، حوصلہ قائم رکھو، دیدار ہوگا، فضل وکرم کے سزاوار بنو گے؛ اور وہ بھی میرے سوا کون تھا جس نے مسلمانوں کو اس وقت جب ان پر یاس کی کیفیت طاری تھی، جب وہ آشفتۂ روزگار اور پریشان حال ہو رہے تھے، یہ نوید دی کہ خزاں کا دور ختم ہوگا اور موسم بہار اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ پھر نمودار ہوگا؛

چوں آں سوز کہن رفت از دمِ او
کہ زد بر نیستانِ او شرارے

اور میرے آقا ! ـــــ جب مسلمان سوز عشق ـــــ عشق رسولؐ ـــــ کی نعمت سے محروم ہوگیا، تو وہ کون تھا جس نے اس کے نیستاں میں پھر سے عشق کا شعلہ روشن کیا ؟

اس کے بعد اپنی کیفیت بتاتے ہیں اور کس درد و حسرت اور سوز و گداز کے ساتھ :

شریک درد و سوز لالہ بودم
ضمیر زندگی را وا نمودم

میں کبھی صرف اپنا غم لے کر نہیں بیٹھا، اپنی قوم، اپنی ملت کے غم میں برابر شریک رہا، اور اسے ضمیر زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا رہا

نمی دانم کہ گفتم نکتۂ شوق
کہ تنہا بودم و تنہا سرودم

میں زندگی بھر عشق رسولؐ کی نغمہ سرائی کرتا رہا، اپنی قوم اور اپنی ملت کو نکتۂ شوق ـــــ حدیث عشق ـــــ سے آگاہ اور باخبر کرتا رہا، لیکن میری لے پر کوئی متوجہ نہ ہوا، میرا نغمہ کسی نے نہ سنا، میری بات کسی کے گوش قلب تک نہ پہنچی،

میں ایسا محسوس کرتا رہا جیسے میں تنہا تھا، اور تنہا ہی محو سرود رہا، میری نے نوازی کا سننے والا میرے سوا کوئی نہ تھا !

اور اپنا یہ سوز بیان کر چکنے کے بعد شاعر کہتا ہے، دنیا میری بات سنے یا نہ سنے مسلمان میری بات پر کان دھریں یا نہ دھریں، میرے مداح اور نکتہ چیں میرے پیغام کی تہ تک پہنچیں یا نہ پہنچیں، مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں، مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ میں کہہ چکا، اب اگر یہ سنتے اور مانتے ہیں، تو خیر انہیں کا بھلا ہے۔ اس میں، اور اگر نہیں سنتے، نہیں مانتے تو میرا کیا نقصان ہے نقصان بھی ہے تو انہیں کا، یہ جانیں اور ان کا کام، میں اپنے عشق میں خود مست ہوں اور وہی میرے لئے کافی ہے:

بگوئے تو گداز یک نفس بس ـــ مرا ایں ابتدا، ایں انتہا بس

میرے لئے اس سے بڑھ کر فخر و مسرت اور نشاط و سرور کی کوئی بات نہیں کہ در حبیبؐ تک پہنچ کر صدا لگانے کا موقعہ مل جائے

یہ ابتدا کتنی اچھی ابتداء ہے ؟ یہ انتہا کتنی اچھی انتہا ہے ، اور میں اس ابتداء اور انتہا سے خوش ہوں ، میرے لئے یہ بہت بڑی نعمت ہے ۔

خواب جرأت آں رند پاکم
خدا را گفت ما را مصطفےٰؐ بس

میں اس مرد مسلمان کی جرأتِ رندانہ کا قائل ہوں ،

جس نے خاش اور بر ملا انداز میں خدا سے کہہ دیا ، میرے لئے مصطفےٰؐ کی ہستی کافی ہے اور جس کے لئے وجود رسولؐ کافی ہے ، اس کے کھرے مسلمان ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ؟ نہ وہ گمراہ ہو سکتا ہے ، نہ احکام الٰہی سے سرتابی کر سکتا ہے ، اس لئے کہ رسول اللہؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور خدا کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت ہے ۔

(۸۰)

راہِ مصطفےؐ

مسلمان اگر خدا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر اس کے راستہ پر چلنا چاہتا ہے، اگر اس کا مقصود رضائے الٰہی ہے تو پھر اس کے لئے صرف یہی چارۂ کار ہے کہ وہ رسالت مآبؐ کے بتائے راستہ پر چلے، جب تک وہ سنّتِ نبوی کو اپنا رہنما نہیں بناتا، ہرگز منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، رسولؐ کی اطاعت، رسولؐ کی تقلید ہی اس کی سیرت اور کردار کی تربیت کرسکتی ہے اور بغیر اس تربیت سے بہرہ ور ہوئے، وہ کچھ نہیں کرسکتا۔

اپنے اس پیام کو اقبال نے متعدد اور متنوع اسلوب سے بیان کیا ہے، اور ہر بیان میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے، ارمغان حجاز میں ملت اسلامیہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

به منزل کوش مانند مہ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو

چاند کو نہیں دیکھتے، ہر روز اپنی منزل کی طرف اس کے قدم بڑھتے ہی رہتے ہیں، اسی طرح تم بھی جس جگہ ہو، اسے کافی نہ سمجھ لو، عروج و ارتقاء کا اصول اپنے پیش نظر رکھو اور برابر بڑھتے رہو

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےؐ رو

اس دنیا میں اگر واقعی اپنا مقام حاصل کرنا چاہتے ہو تو پھر اس کا راستہ یہ ہے کہ خداؐ سے دل لگاؤ اور مصطفےؐ کے راستے پہ رہروی شروع کرو، خدا تک پہنچنے کا وسیلہ صرف راہِ مصطفےؐ ہے،

(۸۱)

مستی و سوز

زندگی کا راز جنوں میں پوشیدہ ہے اور مسلمان کی زندگی کا راز عشقِ رسولؐ میں پنہاں ہے اقبال اپنی ملت کے نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم شوق سے علوم و فنون حاصل کرو، دانش حاضرہ کا اگر لینا چاہتے ہو، تو لو، علومِ عصری میں اگر دسترس حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں شوق سے یہ حسرت پوری کرو، لیکن اس نکتہ کو فراموش نہ کرو کہ اگر حقیقی معنوں میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو عشقِ رسولؐ کی آگ اپنے سینہ کے اندر تمہیں روشن کرنی پڑے گی مسلمان اگر اس نعمت سے بیگانہ ہے تو وہ کچھ نہیں، بیکار محض ہے اس لئے کہ مسلمان کی زندگی میں جس طرح توحیدِ الٰہی رچی ہوتی ہے، اسی طرح محبت رسولؐ بھی بسی ہوتی ہے دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں ایک ہے تو دوسری ضرور موجود ہوگی،

ز رازی حکمت قرآں بیاموز
چراغے از چراغ او برافروز

اگر رازی کے علوم و معارف سے استفادہ کرنا چاہتے ہو اور ان کے ذریعے قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو میں منع نہیں کرتا، ضرور کرو، ان کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کرو ان کے علم سے اپنے علم میں وسعت دو،

و لے ایں نکتہ را از من فراگیر
کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز

لیکن یہ نکتہ مجھ سے سیکھ لو اور یاد کر لو کہ اگر حقیقی معنی میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو عشقِ رسولؐ کے سوز و مستی سے تمہیں بہرحال بہرہ ور ہونا چاہیئے، !

۸۲

گیتی پناہ

جو مسلمان عشقِ رسولؐ سے سرشار ہے، وہ طوفانوں سے لڑ سکتا ہے، سمندروں سے ٹکّر لے سکتا ہے، پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے، وقت کے فرعونوں اور ہامانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے، بادشاہت اور قیصریت کا تختہ الٹ سکتا ہے، اس لئے کہ خواجۂ کونینؐ نے جو اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، اس میں ملوکیت اور قیصریت کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کا نظام اسلامی اصولوں پر مشتمل تھا، اور اس نظام میں کسی قسم کی تفریق مسلمانوں کے اندر روا نہیں رکھی گئی تھی۔ جبلہ بن الایہم غسانی بادشاہ مسلمان ہو کر خانۂ کعبہ میں ایک عرب کی گستاخی پر برہم ہو کر اس کے منہ پر طمانچہ مار دیتا ہے۔ وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔ معاملہ دربارِ عمرؓ میں پیش ہوتا ہے اور عرب کو کوئی سزا نہیں ملتی۔ جبلہ اپنی توہین پر برہم ہو کر مرتد بن جاتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی ایک جلیل القدر بادشاہ کے ارتداد کو گوارا کر لیتی ہے لیکن اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ شاہ و گدا کا امتیاز پیدا کر دے، شاہ کو حق دے کہ وہ جسے چاہے سزا دے اور غریب سے یہ حق چھین لے کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب نہ دے۔

جس قوم کا عشقِ رسولؐ کے فیضان سے امزاج یہ بن چکا ہو، وہ جب ملوکیت کو گوارا کر لے بادشاہوں اور کج کلاہوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے لگے، تو اقبال کا دل کڑھنا ایک لازمی امر تھا، وہ خلافت اور ملوکیت کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتے ہیں، وہ اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ خلافت نام ہے نیابتِ الٰہی کا، اور ملوکیت عبارت ہے، ہوا و ہوس سے، حرص و طمع سے، جوع الارض سے اور مردم کشی سے، قتل و غارت، درندگی اور بہیمیت، سفاکی اور

وحشت سے، وہ ملوکیت سے نفرت کرتے ہیں، اور خلافت کو حفظِ قانون الٰہی کا سبب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بتاتے ہیں:

عرب خود را بہ نورِ مصطفےٰ سوخت۔
چراغ مردۂ مشرق بر افروخت

عربوں نے جب نورِ مصطفےٰ سے اپنے آپ کو منور کر لیا، نتیجہ یہ ہوا، کہ جیسے ہی انہوں نے سرزمین عرب سے باہر قدم نکالا، تو مشرق کا کونہ کونہ اور چپہ چپہ نورِ اسلام سے مستنیر ہو گیا ظلمت دور ہو گئی، روشنی پھیل گئی،

ولیکن آں خلافت راہ گم کرد
کہ روّل مومناں را شاہی آموخت

لیکن وہ خلافت ــــــ بنو امیہ مسلمانوں کی گمراہی کی موجب بن گئی جس نے مسلمانوں کو خلافت کے راستہ سے ہٹا کر درس شاہی دیا، اور ان میں خوئے غلامی پیدا کر دی، پھر کس جوش و خروش اور ولولہ کے عالم میں فاش و برملا کہتے ہیں:

خلافت بر مقام ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است

ہم مسلمانوں کے مقام بلند پر، خلافت یعنے نیابت الٰہی گواہ ہے، ہم نے دنیا کو غلامی کے بندھنوں سے آزاد کیا، اسے درس آزادی دیا، بادشاہت اور ملوکیت کا تختہ الٹ دیا، خدا کا بنایا ہوا نظام قائم کیا۔ اور انسانی برادری میں مساوات و اخوت کی نعمت عام کی۔

بادشاہت جس چیز کا نام ہے، وہ ہم پر حرام ہے اس لئے کہ بادشاہت کی اطاعت کے معنے یہ ہوئے، کہ ہم خدا کی بادشاہت کے علاوہ کسی دوسرے کی بادشاہت بھی تسلیم کر سکتے ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا بادشاہت دوسری قوموں اور ملتوں کے لئے قابل قبول ہو تو ہو مسلمانوں کے لئے نہیں ہو سکتی، اس پر تو وہ حرام ہی رہے گی

ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ   خلافت حفظ ناموسِ الٰہی

اس لئے کہ ملوکیت سوائے فریب کے اور ہے کیا؟ اس کا کوئی اصول نہیں ہوتا، کوئی

ضابطہ نہیں ہوتا وہ خودسر ہوتی ہے مطلق العنان ہوتی ہے، اس کے برخلاف خلافت ناموس الٰہی کا تحفظ کرتی ہے اصول خداوندی کو رائج کرتی ہے، خدا کے بتاتے ہوئے نظام کا جھنڈا بلند کرتی ہے،

اور پھر کتنے فخر اور کتنے جوش کے ساتھ ترانہ سنج ہوتے ہیں،

درافتد با ملوکیت کلیمے
فقیرے بے کلاہے بے گلیمے

ہمارا کلیم ——— مردِ مسلمان ——— وقت کی فرعونیت، یعنی ملوکیت سے الجھ پڑتا ہے وہ فقیر بے نوا ہوتا ہے، تاج شہریاری سے محروم ہوتا ہے، بے گلیم ہوتا ہے، ہر طرح کے سازوسامان سے محروم ہر طرح کے مال و زر سے تہی دامن، ہر طرح کے وسائل و ذرائع سے بے پروا، لیکن عشق رسولؐ کی آگ اس کے سینے میں روشن ہوتی ہے، اور وہ ملوکیت سے ٹکرلے لیتا ہے

گہے باشد کہ بازی ہائے تقدیر
بگیرد کار صرصر از نسیمے، !

اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ تقدیر کا کھیل، نسیم سحر سے باد صرصر کا کام لیتا ہے اور ایک بے نوا مسند شاہی الٹ دیتا ہے۔

لیکن یہ تو تھی ماضی کی تصویر' !

حال کا رنگ کیا ہے ؟ ——— یہ بڑا دل خراش منظر ہے' !

حالت یہ ہے کہ دنیا پر ——— جس میں مسلمان بھی شامل ہیں، ——— پھر ملوکیت کا سکہ چلنے لگا ہے، انسان پھر انسان کا غلام بن گیا ہے، جس نے غلامی کو مٹا دیا تھا، آج غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

---

(۸۳)

شرعِ پیغمبرؐ!

ارمغانِ حجاز میں کچھ اردو نظمیں بھی شریک ہیں، ان میں ایک طویل نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" ہے، یہ بڑی پیاری نظم ہے، الفاظ، محاورات، اصطلاحات، بندش، اسلوب، ترتیب، اندازِ بیان، ہر اعتبار سے بجا طور پر اسے شاہکار کہا جا سکتا ہے!

اس میں ابلیس اپنی اور اپنے رفقاء کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کا سکہ چل رہا ہے، روس، فرانس، جرمنی، امریکہ، برطانیہ اور مشرق کے ممالک، مصر، شام، لبنان، ایران، ہر جگہ اس کی سلطانی قائم ہے، خود مسلمان من حیث القوم اس کے دام میں گرفتار ہیں، اور سب کی طرف سے تو وہ مطمئن ہے۔ لیکن اگر غیر مطمئن ہے، تو صرف مسلمانوں سے،

ابلیس اپنے مشیروں سے مخاطب ہوتا ہے، سب سے پہلے اظہارِ تعلّی کرتا ہے:

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں، کیا مہر و مہ، کیا آسماں تُو بتُو!

بڑی دیر تک لن ترانیاں کرتا رہتا ہے، شیخی بگھارتا رہتا ہے پھر بڑے درد و سوز کے ساتھ کہتا ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

اور پھر اپنے مشیروں کو متنبہ کرتا ہے ':

جانتا ہے جس پہ روشن فتنۂ ایام ہے
مزدکیت[1] فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

اور اب اسلامیوں کا ذکر کرتا ہے، اس ذکر میں کہیں اطمینان ہے، کہیں اندیشہ ہے کہیں دہشت ہے کہیں خوف، کہتا ہے ':

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں

لیکن اس اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ ساتھ ایک کانٹا بھی لگا ہوا ہے ':

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے لیکن ہے یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں؟

اور جب "شرع پیغمبر" کا نام ابلیس کی زبان پر آتا ہے، تو وہ کانپ جاتا ہے لرز جاتا ہے:

الحذر! آئین پیغمبر سے سو بار الحذر!
حافظ ناموس زن مرد آزما، مرد آفریں

اور صرف یہی نہیں ':

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں

اور غضب تو یہ ہے':

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!

---

[1] مزدکیت سے مراد اشتراکیت ہے،

اور یہ غضب بھی برداشت کرلیا جاسکتا ہے، لیکن اس ستم کی بھی کوئی حد ہے'؛

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر وعمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

بھلا جس "آئینِ پیغمبرؐ" میں اتنے طوفان پوشیدہ ہوں، وہ چشمِ مسلم کیا، چشمِ آدم سے کب تک پنہاں رہے گا۔ اور اگر کہیں آشکارا ہوگیا، تو ہماری اور تمہاری یعنی ابلیس اور رفیقانِ ابلیس کی کیا گت بنے گی۔؛

لیکن اگر یہ "آئینِ پیغمبرؐ" کوئی فاش کرسکتا ہے تو صرف "مردِ مسلمان"! ——— لہٰذا بہتر یہ ہے کہ خاص طور پر اسے، اس آئین سے، اس کے مضمرات سے دور رکھا جائے جب تک مسلمان غافل رہے گا، کچھ نہیں ہوسکتا، اس کی آنکھ کھلی اور وہ چونکا تو غضب ہوجائے گا پھر نہ ابلیس کا نام رہے گا، نہ ابلیسیت باقی رہے گی۔ لہٰذا اے دوستو! اے ساتھیو! اے رفیقو! اے ہمسرانِ باتدبیر!

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

---

(۸۴)

سوز و ساز

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں اقبال نے متعدد مباحث پر اظہار خیال کیا ہے، ان مباحث میں ذکر رسولؐ کی حلاوت بھی ہے، اور عشق رسولؐ کا جنون بھی، منفرد نظمیں ہیں، متعدد عنوانات ہیں لیکن "سوز و ساز" عنوان اختیار کر کے ہم صرف چند اشعار پہ اکتفا کر رہے ہیں،

نبیؐ کے شکوہ و جلال کا ذکر کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:

در نگاہش قصر سلطان کہنہ دیر
غیرت او بر نتابد حکم غیر

یہ تو ہوا اس کی غیر طبع کا عالم، اب اس کے فیضان صحبت کا جلوہ دیکھئے:

پختہ سازد صحبتش ہر خام را
تازہ غوغائے دہد ایام را

اور کیا دنیا کے لئے یہ غوغائے تازہ نہ تھا کہ قیصر کی مسند حکومت الٹ گئی، روم کی شہنشاہیت و ملوکیت دم توڑنے لگی، ایران کا تمدن خاک میں مل گیا، فرعون کا مصر نظام الٰہی کا ماتحت بن گیا!

معنیٔ جبریل و قرآن است او
فطرت اللہ را نگہبان است او

جبریل و قرآن درحقیقت اس کی ذات سے عبارت ہیں، اس دنیا میں فطرت الٰہی کی نگہداشت اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف آئین پیغمبرؐ،

حکمتش برتر ز عقلِ ذوفنون ۔۔۔ از ضمیرش اُمتے آید بروں

یہ "عقل ذوفنون" کیا کرتی ہے؟ اس کا کارنامہ کیا ہے؟ تفریقِ امم، افتراقِ ملل، فتنہ، ہنگامہ، کشت و خون، جنگ و پیکار، ہلاکت اور بربادی، یہ سارے سمجھئے، "اس عقل ذی فنون" کے لائے ہوئے ہیں، لیکن "نبوت" ایک نئی قوم کی تخلیق کرتی ہے، اور یہ نئی قوم جب نمودار ہوتی ہے تو دنیا کا رنگ بدل جاتا ہے، مزاج بدل جاتا ہے، نظام بدل جاتا ہے!

حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج
بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

وہ ۔۔۔ سادہ زندگی بسر کرتا ہے، فقر کی زندگی، نہ اس کے پاس موج در موج فوج ہے نہ وہ دوسری قوموں اور ملتوں کو خواہ مخواہ غلام بناتا ہے، نہ اسے تختِ خسروی کی ضرورت ہے، نہ وہ تاج شہریاری کا محتاج ہے، پھر بھی وہ حکمراں ہے اس کا سکہ دل و جان پر چلتا ہے۔

بحر و بر از زورِ طوفانش خراب ۔۔۔ در نگاہِ او پیامِ انقلاب

اس کا طوفان بحر و بر میں ہلچل مچا دیتا ہے، اس کی نگاہ انقلاب انگیز ہے، جدھر نظر پڑ گئی انقلاب آگیا، پرانی قدریں بدل گئیں، اور نئی قدریں عالم وجود میں آگئیں، نظامِ کہنہ باطل ہو گیا، اور نظامِ نو کی کارفرمائی شروع ہو گئی،

درسِ "لاخوف علیہم" می دہد ۔۔۔ تا دلے در سینۂ آدم نہد
عزم و تسلیم و رضا آموزدش ۔۔۔ در جہاں مثلِ چراغ افروزدش
من نمی دانم چہ افسوں می کند ۔۔۔ روح را در تن دگرگوں می کند

اور روح کو تن میں دگرگوں کر دینے، عزم و تسلیم و رضا کا نقش بٹھا دینے، درسِ لاخوف علیہم دینے اور دنیا میں ایک نیا چراغ روشن کر دینے کا انجام کیا دیکھا اس دنیا نے؟

صحبتِ او ہر خزف را دُر کند ۔۔۔ حکمتِ او ہر تہی را پُر کند

اس کی صحبت میں پہنچ کر ہر سنگ ریزہ موتی بن گیا، ہر جام خالی لبریز ہو گیا۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی فیضان ہو سکتا ہے؟

ایک اور مقام پر فقر کی برکتیں بتاتے ہیں، اور اسے متاعِ مصطفےؐ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم این متاعِ مصطفےؐ است
فقر بر کرّوبیاں شب خوں زند — بر نوامیسِ جہاں شب خوں زند

فقر کی برکتیں عجیب ہیں،
یہ نام ہے ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا
یہ فرشتوں کو اسیر کر لیتا ہے یہ نوامیسِ عالم کو بدل دیتا ہے۔

بر مقامِ دیگر اندازد ترا — از زجاج الماس می سازد ترا

یہ فقر اگر تیرا شعار بن جائے تو تجھے ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیتا ہے، تیرے شیشے میں الماس کی سختی پیدا کر دیتا ہے،

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن — یک دمِ او گرمیِ صد انجمن

وہ مردِ فقیر محفل میں ہوتا، لیکن کم آمیز، کم گو، کم سخن، لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے وجود سے گرمیِ صد انجمن قائم ہو جاتی ہے،

بے پراں را ذوقِ پروازے دہد — پشّہ را تمکینِ شہبازے دہد

یہ بے پروں کو ذوقِ پرواز عطا کرتا ہے اور مچھر میں شہباز کا جلال و تمکین پیدا کرتا ہے،

با سلاطین درفتد مردِ فقیر — از شکوہِ بوریا لرزد سریر

اس مردِ فقیر کا عالم یہ ہے، کہ بادشاہوں اور سلطانوں سے ٹکر لیتا ہے اس کا بوریا وہ شان و شوکت رکھتا ہے کہ سریرِ حکومت لرزنے لگتا ہے!

قلبِ او را قوت از جذبِ سلوک — پیشِ سلطاں نعرۂ او لاملوک

اس کا دل عشقِ رسولؐ کے جذبہ سے اتنا سرشار ہو جاتا ہے، کہ وہ بادشاہوں کے سامنے بادشاہت کے خلاف نعرہ لگاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے، کچھ نہیں بول سکتے!

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرماتے ہیں:

مومناں را تیغ با قرآن بس است — تربتِ ما را ہمیں سامان بس است

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں — مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں!

لیکن جس نبیؐ نے سارے زمین کو اپنی مسجد قرار دیا تھا، اس کے امتیوں کا اب یہ حال ہے کہ :

الاماں از گردشِ نہ آسماں
مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

اسی طرح مسلمانوں کے خون میں گرمی پیدا کرنے کے بعد کہتے ہیں :

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن
اے مسلماں مردن است ایں زیستن

اور اگر تو واقعی زندہ رہنا چاہتا ہے تو :

بہ عیار مصطفیٰؐ خود را زند،
تا حیاتے دیگرے پیدا کند،

---

(۸۵)

بہ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

ملتِ مسلمہ کے لئے اقبال کا صرف ایک پیام ہے وہ کیا ہے "BACK TO MOHAMMAD" "دورِ محمدؐ کی طرف واپس چلو!" اس کے علاوہ ہر تحریک، ہر نعرہ اور ہر نظریہ کو وہ مسلمانوں کے لئے تباہ کن اور ہلاکت خیز سمجھتے ہیں؛

مولانا حسین احمد مدنی ایک بلند پایہ بزرگ ہیں[۱]، انہوں نے ملک و ملت اور دین و مذہب کے لئے گراں بہا قربانیاں دی ہیں، دیانت داری کے ساتھ ـــــ لیکن اقبال کے نقطۂ نظر سے غلط طور پر ـــــ وہ کانگرس میں شریک اور قومیت متحدہ کے علمبردار تھے، ان کا نظریہ یہ تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"! یہ بات کوئی مغرب گزیدہ کہتا تو اقبال صبر کر لیتے، لیکن بہت بڑے عالمِ دین کے منہ سے یہ بات نکلی تھی، اس کے مفاسد بہت وسیع ہو سکتے تھے، اقبال کی غیرتِ دینی اس کا متحمل نہ ہو سکی، یہ سن کر وہ لرز گئے اور بے ساختہ ان کی زبان پر چند شعر آگئے جو غیر فانی بن چکے ہیں۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ۔۔۔ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بہ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

---

[۱] اب انتقال ہو چکا ہے، اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔

(۸۶)

باقیات اقبال

قلم کا مسافر اب اپنی منزل پر پہنچ گیا!

کتاب اب ختم ہو رہی ہے، یہ موضوع اتنا دل کش ہے، اور اس موضوع ——— عشقِ رسولؐ ——— پر اقبال نے اتنا کچھ لکھا ہے، اگر وہ سب زیرِ تحریر لایا جائے، اور اس کی تشریح و تفسیر کی جائے، تو ہزارہا صفحات بھی اس کے لئے ناکافی ہوں گے،

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

لیکن ایک مختصر کتاب میں مختصر طور پر ہی اس موضوع کو پیش کیا جاسکتا ہے،

اب آخر میں اقبال کے ایک نئے طرزِ کلام سے میں قارئین کو آشنا کرنا چاہتا ہوں،

کتاب کے شروع میں میں نے اردو اور فارسی شعراء کے عام اندازِ نعت گوئی پر بحث کی ہے، اور ضروری مثالیں بھی پیش کی ہیں، اقبال نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا، تو شروع میں وہ بھی اسی ڈگر پر چلے جس پر دوسرے شعراء چلتے تھے، خواہ تغزل کا میدان ہو یا حمد و نعت کا، لیکن جیسے جیسے ان کی فکر پختہ ہوتی گئی، ان کے خیالات گہرے ہوتے گئے، اور ان کے علم و دانش میں عمق پیدا ہوگیا، ان کا انداز بدلتا گیا، ان کا رنگ کچھ سے کچھ ہوگیا، ارمغانِ حجاز کے علاوہ اپنی ساری کتابیں اقبال نے خود ہی اپنے اہتمام سے نظرِ ثانی اور حک و انتخاب کے بعد شائع کی ہیں، لہٰذا بہت سی چیزیں جنھیں انہوں نے اپنے معیار کے مطابق نہ سمجھا حذف کر دیں۔

لیکن اقبال کی وفات کے بعد "باقیاتِ اقبال" کے نام سے سید عبدالواحد صاحب

نے جو اقبال کے دوست اور قدر شناس تھے، یہ محذوف کلام بھی شائع کر دیا۔

ہمیں اس مجموعہ کے صرف نعتیہ حصّے سے بحث ہے، اور وہ بھی انتخاب سے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے قدیم نعت گو شعراء کے انداز میں بھی نعت گوئی کی تھی، اور اگر اسی رنگ میں وہ لکھتے رہتے تو گو وہ ایک نئی راہ کے موجد نہ ہوتے، لیکن امتیاز کے مالک ہوتے، اور یہ اس لئے کہ یہ قدیم رنگ بھی اپنے اندر خاص دلکشی رکھتا ہے،

ذیل میں اقبال کی ان نعتوں کے چند اشعار ہم درج کرتے ہیں، جو صرف باقیات اقبال ہی میں مل سکتے ہیں۔ کیونکہ اقبال نے خود انہیں حذف کر دیا تھا۔ اور اپنے اہتمام سے جو کتابیں چھاپی تھیں، ان میں درج نہیں کیا تھا۔

حشر میں ابرِ شفاعت کا گہر بار آیا
دیکھ اسے جنبشِ عمل تیرا خریدار آیا
پیرہنِ عشق کا جب حسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا
میں نے سو گلشنِ جنّت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا
لبِ شفاعت نے قیامت میں تلاطم کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈوبا جو گنہگار آیا!

موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے قم مجھ کو

[illegible]